مخزن

کان کنی کے شہید

جان کنی | ماہِ مارچ سن ۱۹۰۶ء کی دسویں - کان کنی کی تاریخ میں - مدتوں یادگار ماتم رہیگی۔ شمالی فرانس میں کوئلے کی کانیں ہیں جن پر ہزارہا لوگوں کی معاش کا مدار ہے - ہفتے کے دن دسویں تاریخ کو سفام کو ریر میں اِن کانوں کے مزدور حسبِ معمول گھروں سے نکلے۔ ہنستے ہنستے بیوی بچوں سے جدا ہوئے کہ شام کو پھر ملینگے - مگر تقدیر ہنسی کہ تم میں سے سینکڑوں کے لئے یہ ملاقات آخری ملاقات ہے - تمہارا کام ویسے بھی محنت کی سخت ترین صورت ہے - لیکن آج تمہاری کان کنی سچ مچ کی جان کنی ہوگی - کان کی تنگ و تاریک غاریں تمہاری قبر بنیں گی - اور آگ اور دھوآں اور نیم سوختہ کوئلے کی زہریلی ہوا اُس قبر کا عذاب ہوگا -

آفت ناگہانی | اِن مزدوروں کی تعداد اٹھارہ سو تھی - اور زن و مرد بچے سب قسم کے مزدور تھے - انہیں کانوں میں اُترے دیر نہیں ہوئی تھی - کہ صبح کے ساڑھے چھ بجے کے قریب اچانک ایک پُرزور دھماکا ہوا - جیسے بارود سے بھری ہوئی کان زور سے پھٹ پڑے - اِس مہیب آواز سے جو لوگ باہر شہر میں تھے اُن کے

دل ہل گئے ۔ اندر والوں کا حال ناگفتہ بہ ہے ۔ معلوم نہیں ۔ دھما کا کیسے ہوا ۔ اور کان کیسے پھٹی ۔ کوئی کچھ وجہ بتاتا ہے کوئی کچھ ۔ یقینی ہے تو اس قدر کہ کان نمبر ۲ ۔ ۳ و ۴ دفعتہً آگ کا بھبوکا بن گئیں ۔ اور اس دوزخ کے شعلے اس قدر بلند ہوئے ۔ کہ کچھ عرصے تک بدقسمت مزدوروں تک کسی مدد کا پہنچنا ناممکن ہوگیا ۔ جن آنکھوں نے اُنہیں اندر جاتے دیکھا تھا ۔ انکی نگہ میں دُنیا اندھیر ہوگئی ۔ ہر شعلے پر گمان ہوتا تھا کہ کسی جواں ہمت مرد یا خوبصورت عورت کی جان ہجاٹ کر نکل رہا ہے ۔ اور اس طرح شمع محنت کے سینکڑوں پروانے اپنے معشوق پر جانیں فدا کر رہے ہیں ۔ ؎

پھر نہ دیکھا کچھ بجز یک شعلۂ پُرپیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا

رونے والے | کان کنی کے ان شہیدوں میں ایک ایک موجودہ زمانے کا فرہاد ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرہاد کی کوہکنی دُنیا میں افسانہ بن گئی ہے ۔ ادبیات ایشیا کی نظم و نثر اس کے تذکرہ سے پُر ہے اور ان غریبوں کے گنج شہیداں پر شاید سب کے نام بھی صحیح طور پر معلوم کر کے رکھنے مشکل ہوں ۔ مگر اس بیکسی پر بھی ان کے حال پہ رونیوالوں کی کمی نہیں رہی ۔ یُوں تو مصیبت ایسی تھی کہ دُور دُور سے لوگوں نے اظہار غم کیا ۔ مگر جو ہجوم ماتم اس قبر آتشیں کے باہر اُس شنبہ کے دن ہُوا ۔ وُہ بھی اپنی مثال آپ ہی تھا ۔ جُوں جُوں اس واقعۂ جانکاہ کی خبر شہر میں پھیلی ۔ عورتیں اور بچے جوق جوق گلیوں سے نکلنے شروع ہوئے ۔ ہر ایک تصویر حیرانی تھا اور نشانِ غم ہر چہرے پر مُسلط تھے ۔ ۳ بجے بعد دوپہر کے قریب ایک انبوہ پچیس ہزار آدمیوں کا مرنے والوں کا ماتم کرنے کے لئے جمع ہوگیا ۔ کوئی اکا دُکا خوش قسمت جو اس طوفانِ بلا سے سالم بچ نکلا اور کوئی لاش جو کسی کی ہمت سے باہر آگئی سب اسکی طرف دوڑتے تھے ۔ اور اُس گھڑی کی نفسا نفسی

گویا عرصۂ محشر کا نمونہ تھی ۔

دو ثلث جل دیئے | ۶ بجے کے قریب اتنا معلوم ہو گیا کہ دو ثلث کے قریب یعنی گیارہ بارہ سو آدمیوں سے ہاتھ دھو بیٹھنا چاہیئے ۔ جو بچ رہے اُن میں بھی کوئی دو سو آدمی کی طرف سے اطمینان ہے ۔ کیونکہ ۱۲۵ اتفاق سے آگ لگنے سے پیشتر باہر آ چکے تھے اور چالیس دو زینوں کے قریب تھے اور جھٹ نکل آئے ۔ باقی آدمیوں کے نکالنے کے لئے بڑے بڑے انجنیروں نے کمرِ ہمت باندھی ۔ اور جوانوں کی ایک ایک جماعت بیکار کانوں کی طرف بڑھے ۔ کان کے اندر ہوا پہنچانے کی کھڑکیاں کھول دی گئیں اور کل کے زور سے ہوا پہنچانے کی پوری کوشش کی گئی ۔ مگر اندر کی غلیظ ہوا اور دھوئیں کی کثافت ایسی نہ تھی کہ اتنی ہوا سے مغلوب ہو جاتی ۔ بچانے والی جماعت کو بار بار پس پا ہونا پڑتا تھا ۔ کیونکہ ذرا سی دُور جا کر دم گھُٹنے لگتا تھا ۔ آخر کچھ لاشیں اور کچھ نیم مُردہ مزدُور نکالے گئے ۔ جو سکتے نکلے اُنکے جینے کی آس نہ تھی ۔ کیونکہ جل کر کولا ہو گئے تھے ۔ اور کپڑا تو کسی کے جسم پر باقی نہ تھا ۔

ماتمی شہر | شام تک سارا شہر ماتم میں تھا ۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جسے ذاتی صدمہ نہ پہنچا ہو کیونکہ یہ بستی کان کنوں کی تھی ۔ ہر دروازہ پر سیاہ ماتمی کپڑا نمودار تھا ۔ اہلِ شہر ماتم میں سیہ پوش تھے ۔ دوکانیں سیہ پوش تھیں ۔ رہی سہی کمی آسمان نے پوری کردی ۔ کالی گھٹا آ کر شریک ماتم ہوئی ۔ اور ۱۱ ۔ ۱۲ مارچ ترشح ابر اور سردی کی بدولت اور بھی مصیبت کے دن بنگئے ۔ بچانے کی کوشش کرنے والے برابر جان جوکھوں میں ڈال کر اس حالت میں بھی مصروف کار رہے ۔ مگر کچھ بہت کامیابی نہ ہوئی ۔ کوئی ایک سو سے زیادہ لاشیں ہاتھ نہ لگیں ۔ برف کو بھی شاید انہیں دنوں کا انتظار تھا ۔ اس نے بھی زمین پر اپنی سفید چادر پھیلادی ۔ گویا قدرت نے ان بیکسوں کے لئے کفن بھیجا ۔

گورِ غریباں | ۱۳- مارچ کو دفن کا اہتمام شروع ہوا۔ دو تین جگہ گڑھے کھودے گئے۔ جن میں بہت سی لاشیں یکجا دفن ہوئیں۔ کیونکہ کئی لاشیں تو بالکل پہچانی ہی نہیں جاسکیں اور جو پہچانی بھی گئیں۔ اُن کو علیحدہ علیحدہ کفن دفن ایسی حالت میں کون کرتا۔ ایک صاحب دل جو اِن دردناک موقعوں میں سے ایک پر موجود تھا چشم دید حالات یُوں بیان کرتا ہے۔ "میری کورٹ والے چھپر کے تلے بائیس لاشیں اپنے اپنے صندوقوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ سرکار جمہوری کی طرف سے وزیر صیغہ داخلیہ بچشم پُرنم کھڑا تھا اور گرجے کی طرف سے ایک آرچ بشپ۔ پریذیڈنٹ اور وزرائے دولت کی طرف سے پھول اس موقعے کے لئے آئے رکھے تھے۔ ماتیوں کی تعداد کوئی پانچ ہزار ہوگی خستہ حال عورتیں صندوقوں کے گرد پھر رہی تھیں۔ زار زار روتی اور عالمِ یاس میں ہاتھوں کو ملتی تھیں۔ اتنے میں کان کن جنازوں کی طرف بڑھے۔ انہیں آہستگی سے اُٹھایا اور مدفن کی طرف لے چلے جو کوئی دو سو گز کے فاصلے پر تھا۔ جب یہ دردانگیز قطار جنازوں کی روانہ ہوئی تو برف پڑ رہی تھی۔ ۲۲ جنازے ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ چھ کان کن ہر جنازے کو اُٹھائے ہوئے تھے۔ اور کان کنوں کے چھوٹے چھوٹے چراغ اُن کے سروں پر ٹوپیوں سے لٹکائے ہوئے دھرے تھے۔ پولیس اور فوج کا ایک معقول دستہ دو رویہ کھڑا تھا۔ کیونکہ ہر لحظہ یہ ڈر تھا کہ کہیں پریشان حال کان کن نقضِ امن پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ پادری نے جنازہ کی دُعا پڑھی۔ اِسکے بعد سوشلسٹ جماعت کے ایک قائم مقام نے بھڑکانے والی تقریر کی۔ جس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا۔ "سرمایہ والوں کو سزا ملنی چاہئے۔ وُہ ہمارے قاتل ہیں"۔ جب صندوق گڑھے میں اُتارے گئے۔ اُس وقت عورتوں کی حالت دیکھی نہیں جاسکتی تھی"۔ یہی کیفیت دُوسرے قبرستانوں میں گذری جہاں باقی جنازے ہوئے۔

ملک کی ہمدردی | مرنے والے مرگئے اور رونے والوں کے لئے عمر بھر کا رونا چھوڑ گئے۔ مگر

اس داستانِ غم کی خوفناک تاریکی میں اہلِ ملک کی سچی اور بے ساختہ ہمدردی اور مالی امداد ایک شعاعِ نور ہے۔ جس سے مُلک کی بیدار زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ زندہ قوموں کے یہ اطوار ہوتے ہیں۔ کوریر کا سوگ خوشباش دارالخلافہ تک محسوس ہوا۔ شہر پاری کا چہل پہل مبدّل بہ غم ہوا۔ جمہوری حکومت کے اراکین فوراً جمع ہوئے اور اُنھوں نے ضابطہ وغیرہ کو بالائے طاق رکھ کر بیس ہزار پونڈ یعنے تین لاکھ روپیہ فوری امداد کے لئے بے تامل منظور کیا۔ بیج کے طور پر جا بجا چندے کی فہرستیں کھُل گئیں بنکِ فرانس نے تیس ہزار روپیہ چندہ اپنا لکھ کر اپنے ہاں فہرست کھولی۔ راتشچیلڈ والوں نے ساٹھ ہزار روپیہ نقد فوراً روانہ کر دیا۔ کہ زیادہ حاجتمند قبائل کو اسیوقت تھوڑا تھوڑا سہارا مل جائے۔ سب بڑے بڑے اخباروں نے اپنے اپنے دفتر میں چندہ جاری کر دیا۔ ۱۴۔ مارچ تک اس عام چندہ کی تعداد چار لاکھ روپیہ سے اوپر پہنچ چکی تھی اور ابھی زور سے جاری تھا۔ جمہوریہ کے پریزیڈنٹ کے نام ہر مُلک سے ہمدردی کے تار پہنچے۔ اور نہ صرف زبانی ہمدردی کے بلکہ انگلستان وغیرہ ہمسایہ ملکوں میں بھی چندہ شروع ہو گیا۔ مگر سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر ہمدردی فرانس کے ہمسایہ جرمنی کی طرف سے ہُوئی۔ جہاں سے ایک جماعت انجنیروں اور کان کنوں کی امداد کے لئے پہنچی۔ جس نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر بہت سی لاشیں اُدر نکال دیں۔ مُصیبت کا وقت بھی عجب وقت ہے۔ اُس وقت ہر شایستہ قوم اور ہر مہذب شخص کا فرض ہے کہ دشمنی اور مخالفت کو نظرانداز کرکے انسانیت کا حق ادا کرے۔ اور جرمن جو فرانسیسیوں کے بڑے دشمن سمجھے جاتے ہیں اور جو اس وقت بھی مراکش میں اُن سے جھگڑ رہے ہیں۔ اس موقع پر پُورے انسان ثابت ہُوئے اور انکی اس عملی ہمدردی کی ہر طرف سے داد مل رہی ہے۔

خوشحالوں کی غفلت

خوشحال لوگ جو جاڑے میں اپنی انگیٹھی کے گرد بیٹھے کوئلے کی آگ تاپتے ہیں اور کہتے ہیں کیسی طرب انگیز آگ ہے۔ کیا جانیں کہ کوئلا کس محنت سے زمین سے کھود کر نکالا گیا ہے۔ اور کتنے غریب محنتی لوگوں نے اپنا لہو پانی کیا ہے۔ اس لئے کہ ان تن آسانوں کو آرام ملے۔ اُمرا جو ریل کے درجۂ اوّل کے گدیلوں پر آسایش سے لیٹے ہوئے سفر کرتے ہیں کب سوچتے ہیں کہ ریل جو انہیں ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے اُڑائے لئے جاتی ہے۔ کوئلے کے بل پر چل رہی ہے اور اگر انجن کے دوزخ کو کوئلے کا ایندھن نہ ملے۔ تو وہیں کھڑی ہو جائے۔ انہیں کیا خبر وہ مفلس جو محض نانِ شبینہ کے لئے جان پر کھیل کر انکی اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں کس حال میں ہیں۔ کل کا بنا ہوا خوشنما کپڑا پہنتے وقت کون سوچتا ہے کہ کوئلے کے بغیر دُخانی کلیں کیسے چلتیں اور ہم کوئلے کے میسّر آنے کے لئے کس کے مرہونِ منت ہیں۔ (اسی لئے تو اپنی مصیبت سے گھبرا کر بیچارے مظلوم کان کن سرمایہ داروں کے خلاف خیالات ظاہر کرنے لگے۔ اگر سرمایہ داروں کو اِن غریبوں کی جانفشانی کی قدر ہو تو وُہ اِن کے ساتھ اب سے زیادہ مہربانی کا سلوک کریں۔ مزدوری اب سے بہتر دیں۔ انکی حفاظت کی کوشش زیادہ کریں۔ اور جو جو احتیاطیں ایسے حوادث کے روکنے کے لئے ممکن ہوں سب عمل میں لائیں چاہے انکے عمل میں لانے کے لئے صرفِ کثیر درکار ہو۔ کیونکہ لاکھوں روپیہ کا منافع جو سرمایہ دار لیتے ہیں۔ اس میں بہت کچھ اِن محنتی جان نثار مزدوروں کا حق ہے اور لازم ہے کہ حق دار کو حق پہنچاتے رہیں۔ ہندوستان میں بھی اب کوئلے کی کان کنی شروع ہے۔ فرانس کے کان کنوں کی اس مصیبتِ عظمیٰ سے سب جگہ کانوں کے مالک سبق لے رہے ہیں۔ ہندوستان کے مالکانِ معادن کو بھی غافل نہ رہنا چاہئے۔ چراغ جو کان کے اندر جائیں سب ڈھنپے ہوئے ہونے چاہئیں۔ نکلنے کے رستے اور ہوا کے ذریعے

اب سے زیادہ بنانے کی کوشش کرنی چاہئیے) انگریزی پارلیمنٹ کی نئی لیبر پارٹی یعنی مزدوری پیشہ جماعت کے قائم مقام فریق کے لیڈر مسٹر کے ہارڈی نے اس موقع پر اپنے پیام ہمدردی میں کیا خوب لکھا ہے :۔ "میں ذاتی طور پر واقف ہوں کہ کان کے ایسے حادثے کی کیا مصائب ہوتی ہیں ۔ اس لئے میرا دل بے اختیار آپ کے غم میں شریک ہوتا ہے۔ ہم سب مزدوری پیشہ انگریز آپ سے دلی ہمدردی رکھتے ہیں ۔ اور دُعا کرتے ہیں کہ خدا وہ دن جلد لائے ۔جب سائنس کی ترقی اور مالکان معادن کی ہمدردانہ انسانیت دونوں مل کر ایسے حوادث کا خاتمہ کر دیں (کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ مناسب روک تھام سے یہ رُک سکتے ہیں) اور ایسے افسوسناک واقعات قصّے کے طور پر ایک وحشیانہ زمانے کی یادگار سمجھے جانے لگیں"۔

قدرت سے لڑائی | گو یہ واقع اس قسم کا ہے کہ اسے سُن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں پس جن کو اس سے صدمہ پہنچا ہے اُن کا کیا حال ۔ تاہم انسان کی مجبوریاں ایسی ہیں ۔ کہ تلاشِ رزق اُس سے بُری طرح کنوئیں جھکواتی ہے ۔ اس لئے اِدھر تو بیچارے کان کن جو اس وقت جوش میں کام چھوڑ بیٹھنے پر آمادہ ہیں۔ آخر کہے سُننے سے ۔ یا زیادہ اُجرت کے لالچ سے پھر ان تاریک گڑھوں میں اُتریں گے ۔ اُدھر دولت مند سرمایہ دار قدرت کے ساتھ جنگ جاری رکھنے پر تُلے بیٹھے ہیں اور یہ ناکامی اُنکو اسی بات پر آمادہ کریگی کہ جس طرح بھی ممکن ہو ۔ قدرت کے خزانوں پر ہاتھ صاف کرتے رہیں ۔حقیقت یہ ہے کہ حرص انسان کی فطرت میں ہے اور اس کا نچلا بیٹھنا ممکن نہیں ۔شروع سے اسکی رفتار شوقِ ارتقا کی شہادت دے رہی ہے۔ پہلے یہ قدرت کا دست نگر تھا۔ درختوں کے پھل اس کی خوراک تھی ۔ درختوں کے پتّے اس کا لباس ۔ قدرتی غاریں اس کا مسکن تھیں اور گوشۂ دشت اس کا مدفن ۔ قناعت کا خوگر تھا۔ جو مانگتا تھا ۔ قدرت اُسے بخش دیتی تھی ۔گرمی

سے گھبراتا تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اسکی تسلی کے لئے بھیجے جاتے تھے اور سردی سے
ٹھٹھرنے لگتا تھا تو دھوپ اسے گرمی پہنچاتی تھی۔ ذرا ہوش سنبھالا تو ہاتھ پانو مارنے
شروع کئے۔ زمین سے کہا کہ "بیکار پڑی رہتی ہو۔ ہمارے کام آؤ۔ ہم بیج بوئیں تم
اسکی حفاظت کرو۔" قدرت نے دیکھا کہ لڑکا ہونہار ہے۔ اس کا حوصلہ بڑھانے
کے لئے مینہ کو حکم دیا۔ کہ اس کے کھیتوں کو پانی دے۔ سورج کی خدمت مقرر کی کہ
انہیں پکائے۔ انسان نے یہی خوشی فصل دیکھا تو اپنی کاریگری پر نازاں ہونے لگا۔
کچھ دن بعد اور پرپرزے نکالے۔ کسی بہتی ندی کی آزادی میں خلل ڈالا۔ اسکا راستہ کاٹ
کر اس کا رخ بدل دیا۔ لگی بیچاری کھیت کی آبیاری کرنے۔ لڑکا اور پھولا۔ کہ اب تو
قدرت وقف خدمت ہو چلی۔ خیال آیا کہ نہر کا پانی زور سے بہ رہا ہے۔ اس زور سے
کچھ کام کیوں نہ لیا جائے۔ ایک پن چکی لگا دی۔ پانی لگا چکی پیسنے۔ بھلا اب اس
نازپروردہ لڑکے کا دماغ کیوں ٹھکانے رہتا۔ اپنے آپ کو قدرت کا حکمران سمجھنے لگا
اور نت نئی تجویز قدرت کی قوتوں کو زیر کرنے کی نکالنے لگا۔ قدرت بھی بردباری سے
سب گستاخیاں دیکھتی گئی اور درگذر کرتی گئی۔ یہاں تک کہ حضرت انسان نے قدرت
کی سب سے پیاری پری برق کو شیشے میں اتار لیا۔ پیام بری کا کام تو اس سے لیتا
ہی تھا۔ اب بے درد یہاں تک گھمنڈ میں آیا ہے کہ اس کے دست نازک سے گاڑیاں
کھنچواتا ہے۔ اور قدرت کو کھلم کھلا پیام جنگ دیدیا ہے۔ مگر آفرین ہے قدرت کے
حلم و وقار پر۔ کہ اب بھی انسان کی گستاخیاں دیکھتی اور چشم پوشی کرتی ہے۔ ہاں
کبھی کبھی جب اس کا ہاتھ بہت بڑھ بڑھ کر چلنے لگتا ہے تو تادیب کے طور پر چشم نمائی
کر دیتی ہے۔ اور کوئی آفت ایسی بھیجتی ہے جس کے آگے انسان کو عجز کا اعتراف کرنا
پڑتا ہے۔ انسان قدرت کے دفینے کھودتا اور ان سے مالا مال ہوتا ہے اور قدرت

چُپ رہتی ہے۔ مگر آخر برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اور اُس حد سے گذرو تو قدرت
اپنی قوت دکھاتی ہے۔ اور سینکڑوں ہزاروں گھر اجڑ جاتے ہیں۔ مگر ہے انسان دھن کا
پکا۔ ہمت نہیں ہارتا۔ برابر یہی کہے جاتا ہے کہ بڑھے چلو۔ چنانچہ فرانس میں اس
شکستِ فاش کے بعد جو وہاں کوئلے کی کانوں میں قدرت کے ہاتھوں انسان کو
ملی ہے۔ آخر یہی فیصلہ ہوا ہے کہ جنگ [illegible] ہے۔ مجروحین و مقتولین کے ساتھ
اظہارِ ہمدردی کیا جائے۔ بیواؤں اور یتیموں کو مدد دی جائے اور سپاہی
اس تازہ جنگ کے لئے تیار ہوں۔ اس فیصلے کو چاہے دلیر کہو چاہے گستاخ
مگر بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے خالی از فائدہ نہیں اور اس لئے اس عزم اور
ہمت کی داد دینی پڑتی ہے۔ بوجھ اپنی طاقت سے بڑھ کر اٹھانا تو حضرت آدم کا
پرانا شیوہ ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ باوجود اپنی ضعیفی کے اہم ذمہ داریوں کو مردانہ وار نبھانا
بھی حضرت ہی کا کام ہے

شیوۂ خاص ہے یہ عام نہیں
جو نکمے ہیں اُن کا کام نہیں

عبد القادر

جناب شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی ایم۔ اے کا نام نامی [illegible]
کی تصویر زیب رسالہ اول دیکھ کر یقیناً خوش ہونگے۔ گو ان کے نام نامی سے لوگ عام طور پر آشنا ہیں لیکن اصلی
تصویر سوا ان لوگوں کے جو تمدن عرب دیکھ چکے ہیں [illegible]
خاص ہے کہ آج یہ تصویر سید صاحب موصوف کی اجازت سے [illegible] شائع کی جاتی ہے

جاپان اور اُس کی حیرت انگیز ترقی

یہ جاپان جس کا نام آج بچہ بچہ کی زبان پر جاری ہے ۔ یہ جاپان جس کی فتح کے کارناموں کا ڈنکہ آج چار دانگ عالم میں بج رہا ہے یہ جاپان جس کی تعریف کرتے کرتے آج اہل الرائے کے مُنہہ خشک ہوتے ہیں۔ کوئی پچاس سال پیشتر گمنامی کے پردہ میں پنہاں تھا۔ اہل یورپ کو اس ملک کا نام تک بھی سیاح مارکو پولو کے سفرنامہ کی اشاعت (یعنی سنہ ۱۲۹۵ء) سے پہلے معلوم نہ تھا۔ مارکو پولو نے چین میں سُنا تھا کہ براعظم ایشیا سے پندرہ سو میل شرق کی جانب ایک بہت بڑا جزیرہ ہے چیپنگو نام جس کے باشندے گورے شائستہ اور خوبصورت ہیں ۔ مذہب بت پرستی ہے اور کسی کے دست نگر نہیں ہیں اُن کے پاس لا انتہا سیم و زر موجود ہے کیونکہ سونا اُن ہی کے جزیرہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی سیم و زر کے خیال نے اکثر یورپین اقوام کو اس جزیرہ کے پتہ لگانے کی تحریص کی چنانچہ کولمبس کا ارادہ اس جزیرہ تک پہنچنے کا تھا۔

جاپان کی اس گمنامی کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہل جاپان قومی حیثیت سے فطرتاً علیحدگی پسند واقع ہوتے ہیں اہل جاپان مملکت جاپان کو آسمانی بادشاہت سمجھتے تھے دیگر ممالک کے باشندوں کو وحشی اور کم درجہ کے انسان شمار کرتے تھے۔ اور اُن سے رابطہ و اتحاد کسی قسم کا قائم کرنا خلاف شان اور غیر ضروری جانتے تھے۔ ان کا عقیدہ پیدائش انسان کے بارہ میں دلچسپی سے خالی نہیں ان کے خیال کے مطابق آسمان و زمین کی ابتدا سے پیشتر تین دیوتا تھے - مرکز علوی - اعلیٰ مقدس خالق تو حیرت انگیز یہ تینوں دیوتا خالق کے وجود میں آئے اور معدوم ہو گئے ۔

جب زمین پانی پر تیل کے مانند تیرتی پھرتی تھی اُسوقت ایک چیز شاخ نے کی
مانند اس میں سے اُگی اور اس میں سے دو دیوتا پیدا ہوئے۔ یہ دیوتا بھی بلا فانی
وجود میں آئے اور عدم کو چلے گئے۔ ان پانچوں دیوتاؤں کو معبود فلکی کہتے ہیں
انکے بعد دو اور دیوتا پیدا ہوئے۔ یہ دیوتا بھی پیدا ہوئے اور فوت ہو گئے اس کے
بعد پانچ جوڑے دیوتاؤں کے پیدا ہوئے۔ ان میں ازناگی اور ازنامی بھی ایک جوڑا تھا۔
معبودہائے فلکی نے ازناگی اور ازنامی کو زمین کے مستحکم کرنے کا حکم دیا۔ اور انہوں نے
وہ مختلف جزیرے بنائے جن پر جاپان مشتمل ہے۔ جزیرے بنانے کے بعد پینتیس
اور دیوتا پیدا کئے۔ آخر کار اگنی دیوتا پیدا ہوئے۔ ازنامی اس موقع کی وجہ سے
انتقال کر گئے۔ اور مقام ارواح میں چلے گئے۔ ازناگی کو بہت رنج ہوا اور اس کے
قطرہائے اشک سے ایک اور دیوتا پیدا ہوا۔ غصہ میں ازناگی نے اپنے خنجر سے
اگنی دیوتا کا سر کاٹ ڈالا۔ اس خون سے جو دھار پر لگا تین دیوتا پیدا ہوئے میان
کے خون سے تین دیوتا۔ انگلیوں سے جو خون نکلا اس سے دو دیوتا اور آٹھ مقتول
دیوتا کے سر اور جسم سے پیدا ہوئے۔ ازناگی نے ارادہ کیا کہ مقام ارواح میں جا کر
اپنی بی بی سے ملاقات کرے۔ قلعہ کے دروازے پر آکر ازنامی نے ملاقات کی۔ ملاقات
کے بعد مقام ارواح کے دیوتاؤں کے پاس مشورہ کے لئے گئے لیکن یہاں دل
عاشق میں صبر کہاں تھا ذرا سی دیر بھی پہاڑ معلوم ہوئی اپنے کنگھے کا ایک دندانہ
توڑ کر مشعل بنائی اور اندر داخل ہوا۔ وہاں کی حالت اور نفرت انگیز خرابیاں دیکھ کر
گھبرا گیا اور اُلٹے پاؤں واپس آیا۔ وہاں کی کثافت دور کرنے کے لئے جزیرہ
سکشی کے ایک چشمہ پر پہنچا۔ اپنے کپڑے وغیرہ اُتار کر رکھے جن سے بارہ دیوتا
پیدا ہوئے نہانے میں بھی بیسیوں دیوتا پیدا ہوئے۔ جب بائیں آنکھ دھوئی

تو سورج دیوی پیدا ہوئی۔ اور جب دائیں آنکھ دھوئی تو چاند دیوتا پیدا ہوئے۔ اور جب
ناک دھوئی تو ایک اور دیوتا پیدا ہوا جس کا نام ہم نرد دیوتا رکھینگے۔ سورج دیوی کو عرصہ فلکی کا
انتظام سپرد کیا اور چاند دیوتا کو مملکتِ شب سپرد کی اور نرد دیوتا کو وسعتِ بحر کا حاکم بنایا
لیکن نرد دیوتا ہیں کہ روتے ہی جاتے ہیں۔ ازناگی نے پوچھا کہ کیوں روتے ہو تو
جواب دیا کہ اپنی ماں کے پاس مقامِ ارواح میں جانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ ازناگی نے اسکو
جلا وطن کر دیا مگر انہوں نے کہا کہ میں اپنی بہن سورج دیوی سے بغیر ملے نہ جاؤنگا۔ وہاں
پہنچے تو کسی بات پر بھائی بہنوں میں تکرار ہوگئی اور سورج دیوی نے اپنے محل کا دروازہ
بند کر لیا۔ ہر جگہ اندھیرا ہی اندھیرا ہو گیا نالہ و زاری کی آواز ہر طرف سے بلند ہوئی تب
تو ہزاروں دیوتا ایک بڑے دیوتا معبودِ تخیل کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مدد چاہی
کہ کسی طرح سورج دیوی کو پھر باہر نکالیں۔ بہت سے غور و فکر کے بعد اس دیوتا کی صلاح
کے مطابق سب سامانِ خوشی مہیا کیا گیا۔ ناچ رنگ شروع ہوا۔ اور قہقہے کے نعرے
بلند ہوئے۔ جب سورج دیوی نے یہ خوشی کے نعرے سنے تو نہایت متعجب
ہوئی۔ دروازہ کھول کر وجہ دریافت کی۔ لوگوں نے جواب دیا کہ اس خوشی کی وجہ
یہ ہے کہ تم سے بھی زیادہ خوبصورت دیوی ہاتھ آگئی ہے۔ اور ایک آئینہ اس کے
منہ کے سامنے کر دیا حیرت میں آکر اس نے قدم آگے بڑھایا اور انہوں نے
پیچھے سے دروازہ بند کر دیا اور آسمان و زمین پھر روشن ہوگئے۔ نرد دیوتا کو تمام
دیوتاؤں نے ملکر یہ سزا دی کہ وہاں سے جلا وطن کر دیا۔ چنانچہ نرد دیوتا دریائے ہائی پر
پہنچے وہاں ایک بڈھا اور بڑھیا اور ایک لڑکی بیٹھے ہوئے رو رہے تھے۔ وجہ دریافت
کرنے پر معلوم ہوا کہ ہر سال ایک اژدہا آتا ہے اور بڈھے بڑھیا کی ایک لڑکی کو لیجاتا ہے
اور اب پھر اس کے آنے کا وقت ہے۔ نرد دیوتا نے کہا کہ اگر میں تمہاری لڑکی کو بچا لوں

تو گیا اُنکی شادی میرے ساتھ کر دو گے بُڈھے بڑھیا نے بخوشی منظور کر لیا نر دیوتا نے اژدہا کو مار کر لڑکی سے ساتھ شادی کر لی اور محل بنا کر اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگا اور زمین پر امن و امان ہو گیا۔ فلکی دیوتاؤں نے یہ دیکھ کر اور بہت سے دیوتا مثل جاپانل دیوتا کے زمین پر بھیجے۔ اس دیوتا کے تین بیٹے ہوئے۔ فائر شائن مچھلی کا شکار کرتا تھا اور پرنس فائر سب سائیڈ کے پاس سے پرنس فائر شائن کا کانٹا کھویا گیا پرنس فائر شائن اپنا ہی کانٹا واپس لینے پر زور دیتا تھا اور کسی معاوضہ پر راضی نہ ہوتا تھا۔ اس کانٹے کی تلاش میں نمک دیوتا سے ملاقات ہوئی اور اُس نے سمندر دیوتا کے پاس جانے کی صلاح دی آخرکار سمندر دیوتا کی لڑکی سے شادی کی اور پرنس فائر شائن کا کانٹا اس کی مدد سے قعر سمندر سے نکلوایا۔ پانچسو اسی برس تک جیوتا رہا۔ جس کی اولاد سے جمو اول شاہنشاہ جاپان سمجھا جاتا ہے۔

پیدائش جاپان کے متعلق ایسے ایسے خیالات خواہ کیسے ہی غیر معتبر اور قابلِ مضحکہ ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ اہلِ جاپان کی زندگی اور انکے ملک کی تاریخ پر انکا بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ ہندوستان کے بعض قدیم بادشاہوں کی نسبت بھی بعض روایتیں ایسے ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ یہی روایتیں تو ہیں جن سے جاپان کے ایشیائی قوم ہونیکا ثبوت ملتا ہے اور جن کے مطالعہ سے اگر کچھ اور فائدہ نہیں تو اتنا تو ضرور ہو کہ ایک قسم کی ہمدردی اور رشتہ یگانگت کا خیال ہم کو جاپان کے ساتھ پیدا ہو سکتا ہے۔ ہم لوگ جو جاپان کی فتحیابیوں پر مسرت کے نعرے بلند کر رہے ہیں اس کی زیادہ تر یہی وجہ یگانگت کا خیال ہو۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ روس ہماری سرکار انگریزی کا رقیب ہو اسمیں شک نہیں کہ جاپان نسبتاً کمزور سمجھا جاتا ہے اور انسان کی ہمدردی کمزور کے ساتھ ہوا کرتی ہو لیکن ہماری جاپان کے ساتھ ہمدردی کی بڑی وجہ انکا ایشیائی ہونا ہی جبکہ بعض

محققان یورپ یہ رائے دے رہے ہیں کہ فطرتاً ایشیائی قومیں یورپین قوموں کے مقابلہ میں بہت نیچے گری ہوئی ہیں اور کسی طرح انکی ہمسری نہیں کرسکتیں ایک چھوٹی سی ایشیائی طاقت کا ایک عظیم الشان یورپین سلطنت کے دانت کھٹے کردینا گویا ایشیائی اقوام کی ناک رکھ لینا ہے۔ اور ہم جاپانی فتوحات پر جس قدر فخر و ناز کریں بجا اور درست۔ اس مضمون سے میرا منشا یہ ہے کہ ایک ایسے ملک کی بابت جس نے آج کشمکش ہستی اقوام میں ایشیائی عزت رکھ لی ہو کچھ واقعات لکھوں۔ تاکہ جنگ روس و جاپان میں ناظرین پہلے سے بھی زیادہ دلچسپی لے سکیں۔ جاپان کی وسعت ایک لاکھ اکسٹھ ہزار مربع میل ہے اور اس کی آبادی چار کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ گویا پنجاب سے دگنی۔ قریباً پندرہ بڑے بڑے جزیرے اس میں شامل ہیں۔ چھ بڑے بڑے بندرگاہ ہیں۔ زمین پہاڑی ہے۔ بہت سے پہاڑ آتش فشاں ہیں۔ اور اکثر زلزلے آتے رہتے ہیں۔ دریا بے شمار ہیں۔ لیکن چھوٹے چھوٹے سیل اکثر آتے رہتے ہیں اور نقصان پہنچاتے ہیں جھیلوں میں جھیل بیوا قابل بیان ہے جس کے اردگرد ایسا خوشنما نظارہ ہے جو سیاحوں کو ہمیشہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہی حال جھیل ہاکون کا ہے۔ ہر قسم کی دھات اور پتھر یہاں پائے جاتے ہیں۔ اول اول ۷۴۹ء شاہنشاہ شوموکے عہد میں اس جگہ سونا دریافت کیا گیا آب وہوا ہر قسم کی پائی جاتی ہے۔ مگر زیادہ تر معتدل ہے اور بلیک کرنٹ سے آب وہوائے جاپان پر وہی اثر پڑتا ہے جو گلف سٹریم سے آب وہوائے انگلستان پر۔ چاول اہل جاپان کی مرغوب خوراک ہے۔ جاپانی جنگل نہایت شاداب ہیں۔ نارنگیاں۔ سیب۔ اخروٹ۔ انگور بیر۔ ناشپاتی یہ سب پھل وہاں ہوتے ہیں ۱۷۹۹ء میں ہندوستان سے روئی کا پودہ بھی جاپان میں پہنچ گیا۔ کافور کا درخت۔ جانور ہر ایک قسم کے ہوتے ہیں۔ گھوڑا بیل گئو۔ بلی۔ ہرن وغیرہ۔ سواری کے لئے جن رکشا بہت استعمال کیجاتی ہے۔ ریل

بھی اکثر حصوں میں جاری ہے۔ سڑکیں بےشمار ہیں۔

اکثر اقوام کی تاریخ کی طرح جاپان کی ابتدائی تاریخ بھی تاریکی میں نہاں ہے۔ ۴۰۰ء سے پہلے تو مدون تاریخ ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ تحریر اور چھاپہ کا فن ۴۰۵ء میں چین سے لیا گیا۔ جاپانی تاریخ کی سب سے پرانی کتاب کوجکی ہے جو ۷۱۱ء میں مکمل ہوئی۔ دوسری تاریخ نہانگی ۷۲۰ء میں۔ تیسری کتاب مذہب شنٹو کا قانون رسوم ہے جس سے جاپان کے ابتدائی حالات پر کچھ کچھ روشنی پڑتی ہے۔ پس نویں صدی سے پیشتر جس قدر حالات معلوم ہوتے ہیں وہ تاریخ کے رتبے سے گرے ہوئے ہیں۔ جاپان کی تاریخ کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ زمانہ جو کتب کوجکی، نہانگی کا ہے۔ ۱۱۰۰ء میں فوجی جماعت پیدا ہوئی تاکہ دشمنوں کے حملہ سے محفوظ رکھے۔ چنانچہ اب ایک سپہ سالار اعظم یعنی شوگن کا عہدہ قرار پایا۔ مختلف خاندان یہ کوشش کرتے رہے۔

جاپان میں ایسے عمدہ عمدہ نظارے ہیں۔ کہ سیاحوں کا دل انکو دیکھنے سے کبھی نہیں بھر سکتا۔ جاپانی لوگ صاف خوش مزاج اور مہمان نواز ہوتے ہیں۔ یہاں کے باشندے نہ تو شراب خوار ہیں اور نہ جھگڑالو۔ اگر کبھی کسی قسم کا جھگڑا ہو بھی جاتا ہے تو وہ آپس میں شریفانہ طور پر اسکو رفع دفع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ جاپانیوں کا یہ خاصہ ہے کہ غصے میں غل غپاڑہ نہیں مچاتے اور نہ قسما قسمی کی نوبت آنے دیتے ہیں۔ مذکورہ بالا خوبیاں نہ صرف جاپان کی اعلیٰ قوموں میں پائی جاتی ہیں بلکہ ادنیٰ قوموں میں بھی موجود ہیں۔ جاپان میں بہت کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو غصے میں مار بیٹھے۔ کیونکہ ایسی ذرا سی بات کی بھی سخت سزا ملتی ہے۔ جاپانی لوگ کھانے کی طرف سے کچھ لاپروا ہوتے ہیں۔ اگر انہیں دو تین گھنٹے دیر کے بعد بھی کھانا ملے تو وہ بے صبرے نہیں ہوتے۔ جاپانی بڑے سادہ طبیعت کے ہوتے ہیں۔ وہ ہر جگہ جہاں تو شک بچھی ہوئی ہو بلا تامل

سوجاتے ہیں - جاپان میں ہر قسم کی مفید تعلیم دیجاتی ہے اور وہاں اس مطلب کے لئے سکول اور کالج قائم ہیں تعلیم انگریزی اصولوں پر دیجاتی ہے - وہاں کے طلبا نہایت ذہین ہوتے ہیں اور انکو تحصیل علم کا بہت شوق ہے - ۱۸۵۳ء میں امیر البحر پیری مع چار عظیم الشان جہازوں کے بندر یوبگاپہ یوکوہاما کے متصل وارد ہوا - اس امیر البحر کو دولت متحدہ امریکہ نے اس غرض سے بھیجا تھا کہ جاپان کے بندرگاہوں میں تجارت امریکہ کے لئے راستہ کُھلجائے - کلیفورنیا میں سونے کی کانیں دریافت ہونے سے اہل امریکہ کو ضرورت پیش آئی کہ چین سے رابطہ تجارت قائم کرے اور اس لئے یہ ضروری ہوا کہ جاپان کو سد راہ بننے سے روکا جائے امیر البحر پیری کو ہدایت تھی کہ جہانتک ہو سکے مصالحت سے کام لے اور فوجی طاقت کے ڈراوے سے کام نکالے - اس ناگہانی دشمن کے اچانک موجود ہوجانے سے اہل جاپان میں وہ کھلبلی پڑی کہ جس کی کچھ انتہا نہیں - لیکن بمصداق

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد
خمیر مایۂ دکان شیشہ گر سنگ است

اس بیرونی دشمن کے خطرے سے جیسا کہ میں آگے ذکر کرونگا بہت سی پولٹیکل گتھیاں خود بخود سلجھ گئیں اور اہل جاپان میں اتفاق اور یکجہتی کی بنیاد پڑگئی اور قومیت کی مستحکم اور عالیشان عمارت جسکو آج آپ دیکھکر حیران ہیں اسی بنیاد پر کھڑی ہے - اسوقت جاپان میں دو فریق پیدا ہو گئے ایک تو وہ لوگ جو اس بات کے حامی تھے کہ غیر طاقتوں کو مملکت جاپان میں دخل دیدیا جائے اور دوسرے وہ لوگ تھے جو انکا خارج رکھنا قرین مصلحت سمجھتے تھے - قبل الذکر کا نام کائی کوکو یعنے فرقہ داخلیہ تھا اور موخر الذکر کا نام جوآئی یعنے فرقہ خارجیہ تھا - شوگن پہلے فرقہ کا حامی تھا مگر بہت سے طاقتور اعیان و امرا اور عوام الناس شوگن کی بے اعتدالیوں سے ناراض ہوگئے تھے اور اس بات

کے خواہاں تھے کہ ساری طاقت شہنشاہ کے ہاتھ آجائے اور اس سبب سے اور بعض ذاتی کاوشوں کی وجہ سے شوگن کی رائے کی مخالفت کرنیکا انہیں یہ ایک اچھا موقع حاصل ہوگیا۔ جاپان کے تعلیم یافتہ گروہوں میں بھی یہ خیال جاگزین ہوگیا تھا کہ شوگن محض غاصب ہیں اور ہرگز اس بات کے مستحق نہیں ہیں کہ انتظام مملکت اُن کے ہاتھ میں چھوڑا جائے۔ اشاعت علم کی وجہ سے یہ خیال بھی پھیلتا جاتا تھا کہ مذہب شنتو کو اور اس کے ساتھ شہنشاہ کو اور اس کی دینی اور دنیاوی عظمت کو جو عرصہ سے اگر مرنہ چکی تھی تو معطل تو ضرور ہو گئی تھی دوبارہ زندہ کیا جائے اس لئے فرقہ خارجیہ کو فرقہ احیائی کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس فرقہ کا بڑا حامی سردار میٹو تھا جس کی صاف گوئی اور زور قلم نے معاملات کو روبراہ کرنے میں آخر کار بہت کچھ مدد دی لیکن ۱۸۶۸ء تک اس مدبر زمانہ کی کوششوں کا پھل کچھ نہ نکلا۔ اس زمانہ کو خود اہل جاپان عہد ابتری کہتے ہیں۔ اس عرصہ میں ممالک غیر مثلاً امریکہ انگلستان روس ہالینڈ وغیرہ کو جاپان کے بندرگاہوں میں کسی قدر دخل حاصل ہوگیا۔ اور تجارت خاص خاص شرائط کی پابندی کے ساتھ کھل گئی۔ اکثر طاقتوں کے ساتھ شوگن نے صرف اپنے اختیار سے عہد نامے کر لئے جنکو ممالک غیر نے کافی سمجھ لیا لیکن اہل جاپان بحیثیت قوم شوگن کو ہرگز ایسے عہد نامے کر لینے کا مجاز خیال نہ کرتے تھے چنانچہ آئی کمانوں کامی شوگن ۱۸۶۰ء میں قتل کیا گیا اور اس کے بجائے شاہزادہ میٹو کا بیٹا ہٹسو باشی شوگن بنا۔ اس زمانہ میں غیر ملک کے لوگ بھی خطرہ سے محفوظ نہ تھے۔ اہل جاپان میں سے منچلے لوگ موقعہ پاکر ان پر بھی ہاتھ صاف کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے یہ لوگ کسی امیر اُمرا کے ماتحت نہ تھے اور نہایت خودسری اور سرکشی کے ساتھ جو چاہتے تھے کر گذرتے تھے۔ اس وقت اہل جاپان نے بحیثیت قومی اپنی مجبوری اور اُفتادگی کا اندازہ کیا اور اپنی خراب حالت کو دیکھ کر ایک تعجب انگیز

استقلال اور مضبوطی کے ساتھ تہذیبِ مغربی سیکھنے اور دیگر ممالک کے ساتھ ہمسر ہونے کے لئے عزم بالجزم کیا۔ سنہ ۱۸۶۲ء میں امریکہ اور انگلستان کی سفارتوں پر یورشیں ہوئیں اکثر افسر مارے بھی گئے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۶۲ء میں خود شہنشاہ نے اپنے گوشۂ عزلت سے نکل کر ممالکِ غیر کے مسئلہ کو حل کرنا چاہا چنانچہ شوگن کو ہدایت کی گئی کہ یدو میں بڑے بڑے اعیان و امرا کو بلا کر ایک کانفرنس کیجائے۔ لیکن اس کانفرنس کا بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا بلکہ اتفاق یہ ہوا کہ مسٹر ریچرڈسن کو جس نے ایک امیر شمازو نامی کو سلام کرنے میں پہلو تہی کی تھی زخمی کیا جس کی وجہ سے انگریزوں کو سنہ ۶۳ء میں کاگوشیما پر حملہ کرنے کا عذر ہاتھ آیا۔ یہ دیکھ کر شمازو نے بہت سے طالب علم یورپ میں اپنے خرچ سے بدیں غرض بھیجے کہ وہاں جاکر مغربی فنِ حرب اور دیگر فنون سیکھ کر آئیں اور اپنے ملک کو زور آور بنائیں۔ دوسری دفعہ شہنشاہ نے خود ایک کانفرنس مجتمع کی تاکہ تعلقات ممالکِ غیر کے اہم مسئلہ کو طے کیا جائے۔ اس کانفرنس میں شوگن بھی شامل تھا اور گویا اسکی شمولیت ہی اس بات پر دال تھی کہ عملی طور سے نظامِ مملکت کی باگ وہ شہنشاہ کے ہاتھ میں دینے کو تیار ہے۔ اس کانفرنس میں کثرتِ رائے سے یہ بات قرار پائی کہ ممالکِ غیر سے قطعِ تعلق کیا جائے۔ چنانچہ شوگن کو حکم دیا گیا کہ اس حکم کی تعمیل کرے۔ شوگن نے اس حکم کی اطلاع تو ضرور غیر طاقتوں کو پہنچا دی مگر اور کچھ تعمیل نہ کی فرقۂ خارجیہ کو یہ بات ناگوار گذری اور چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی۔ امریکہ اور ڈچ جہازوں نے بہت کچھ انتقام لیا اور تمام غیر طاقتوں نے ملکر جاپان کو نیچا دکھانے کا بیڑا اٹھایا۔ آخرکار سنہ ۶۵ء میں یہ معاملہ اس طرح طے پایا کہ اُن عہدنامجات پر جو شوگن نے کئے تھے شہنشاہ کے دستخط کرائے جائیں۔ سنہ ۶۶ء میں شوگن ہٹات سوباشی کا انتقال ہوگیا اور شہنشاہ کامی بھی رحلت کر گئے اور سنہ ۶۷ء میں موجودہ شہنشاہ زیب دہ تختِ سلطنت ہوئے۔

اسی سنہ کے آخر میں شاہزادہ ٹوزا نے شوگن کو بڑے زور سے صلاح دی کہ عنانِ حکومت بہمہ وجوہ شہنشاہ کے سپرد کردے۔ چنانچہ شوگن نے اس بات کو منظور کرلیا اور اپنے ایک دوست کو ایک خط میں یہ لکھا کہ مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے قانون اس زمانہ میں جبکہ غیر ممالک کے ساتھ تعلقات روز بروز بڑھتے جاتے ہیں کبھی قائم نہیں رہ سکتے۔ تاوقتیکہ عنانِ حکومت ایک شخص کے ہاتھ میں دیدوں اور ملک کے فائدہ کے لئے سب سے بڑی خدمت جو میں کر سکتا ہوں یہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی غیر محدود طاقت عظمت حشمت و دولت اور شان جو نسلاً بعد نسلٍ اس کو حاصل تھی اور جسکو وہ اپنے قبضہ میں رکھ سکتا تھا ملک پر سے قربان کردی۔ اور اپنے ملک کی ضروریات کو سمجھ کر خاندانی جان نثاری دکھائی اور اس طرح حکومت سے دست بردار ہونے میں وہ نظیر قائم کی جس کی مثال دنیا میں مشکل سے ملیگی۔ شہنشاہ نے شوگن کا استعفا منظور کرلیا اور جنوری ۱۸۶۸ء میں فرمانِ شاہی کے رو سے عہدہ شوگن موقوف کیا گیا۔ اس وقت سے جاپان کے نظم ونسق میں ایک عجیب غریب انقلاب ظاہر ہوتا ہے۔ باوجودیکہ جاپانی شہنشاہ مطلق العنان ہوتا تھا گو اس کی طاقت زارِ روس سے بھی کئی درجہ زیادہ سمجھی جاتی تھی گو اسکو انسان سے بالاتر دیوتاؤں کا جانشین سمجھا جاتا تھا گو اس کے اشارہ ابرو کے ساتھ بلاپس وپیش بلاوجہ دریافت کئے۔ ہر ایک جاپانی اپنی گردن اپنے ہاتھ سے کاٹ ڈالنے کو فخر سمجھتا تھا اور فخر سمجھتا ہے تاہم اس شہنشاہ مقتدر نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے تخت کے سامنے ۱۸۹۹ء میں حلف اٹھائے اور طریقہ انتظامِ مملکت کی نسبت اپنی رعایا سے وعدہ کرے۔ چنانچہ اسی وعدہ میں یہ پانچ باتیں قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) یہاں ایک مجلسِ شورہ قائم کیجائیگی اور تمام معاملات کثرتِ رائے سے فیصلہ کئے جائینگے

(۲) تمدنِ ملکی کے اصول، عایا کے ادنیٰ اور اعلیٰ طبقات دونوں کو مطالعہ کرنیکا حق ہوگا۔

(۳) ہر شخص کو تمام نیک ارادوں میں کامیاب ہونے کے لئے مدد دیجائیگی۔

(۴) تمام بیہودہ رسوماتِ قدیمہ منسوخ کیجائینگی اور اُس عدل و انصاف سے کام لیا جائیگا جو عمل قانون قدرت سے ظاہر ہیں۔

(۵) اساسِ مملکت مستحکم کرنے کی غرض سے اصولِ علم و حکمت تمام ممالک رُوئے زمین سے تلاش کئے جائینگے۔ (باقی آیندہ)

میرے رُفقا کون ہیں؟ کتابیں۔ جنکی صحبت میرے لئے نہایت خوشگوار ہے۔ وہ ہر زمانے کے ہیں اور ہر ملک کے انہوں اِن تہ ہرنر میں بھی نام پایا ہے اور میدانِ جنگ میں بھی۔ اور دیگر علوم سے متبحر ہونیکی وجہ سے بہت سے اعزاز حاصل کئے ہیں۔ میں جسوقت چاہوں اُنکے پاس جاسکتا ہوں۔ کیونکہ وہ ہر وقت میرے پاس موجود ہیں۔ اور جب چاہوں اپنے پاس بلاسکتا ہوں اور علیحدہ کرسکتا ہوں۔

میرے لئے وُہ کبھی بھی بار خاطر نہیں ہوتے: اور جب کوئی سوال کر بیٹھتا ہوں تو فوراً جواب دیتے ہیں بعض زمانۂ سلف کے واقعات من وعن بیان کرتے ہیں اور بعض اسرارِ قدرت کا دفینہ میرے سامنے لاکر رکھدیتے ہیں بعض مجھے بتاتے ہیں کہ طرزِ معاشرت کس طرح ہونی چاہیئے اور بعض مجھے اس دارالمحن کے بے بقا ہونیکی اطلاع دیتے ہیں اور بعض میرے تفکرات کو مجھ سے دور کرکے مجھے ہر وقت بشاش و ہشاش بنائے رکھتے ہیں اور بعض میرے دل کو طمانیت اور قوت بخشتے ہیں۔

غرضیکہ دنیا بھر کے علوم و فنون کی دلچسپیاں میرے لئے مہیا کرتے ہیں اور میں ہر ضرورت کے وقت ان سے مشورہ کرتا ہوں اور ان پر پورا اعتماد رکھتا ہوں مگر لطف یہ ہے کہ ان تمام احسانات کا بدلہ وہ مجھ سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں چاہتے کہ میں انکو اپنے گھر کے کسی کونے میں جگہ دوں۔ جہاں وہ آرام سے ایک با امن زندگی بسر کریں کیونکہ میرے یہ دوست سوسائٹی کے شور و شغب پر خلوت اور تنہائی کی زندگی کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔

مکتوباتِ آزاد

آزاد کا کلام عموماً رنگِ تکلف سے آزاد ہے۔ مگر ان خطوط کی بے ساختگی جو ہمیں خوش قسمتی سے مل گئے ہیں اور جنہیں ہم باقساط چھاپیں گے خصوصیت سے قابلِ داد ہے۔ یہ خطوط طرزِ تحریر کے اعتبار سے اُردو خط نویسی کا عمدہ نمونہ ہونے کے سوا یہ بڑی خوبی رکھتے ہیں کہ شغلِ تصنیف کے متعلق ہیں اور ان میں پروفیسر محمد حسین آزاد کی مشہور تصانیف پر ایک خاص روشنی پڑتی ہے۔ کہیں آبِ حیات کا ذکر ہے۔ کہیں نیرنگِ خیال کا۔ کہیں سخندانِ پارس کی تیاری ہے۔ کہیں دربارِ اکبری کا تہیہ۔ انکے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتنی محنت۔ کس قدر تلاش اور کیسے وسیع مطالعہ کے نتایج ہیں جن سے ہم فیضیاب ہو رہے ہیں۔ علاوہ بریں ان خطوط میں بعض نئی اور مفید معلومات فاضل مصنف کی سوانح عمری کی بابت موجود ہیں۔ جنکی قدر محتاجِ بیان نہیں۔ یہ مکتوبات میجر سید حسن بلگرامی صاحب بالقابہ کے نام ہیں۔ میجر موصوف نواب عماد الملک مولوی سید حسن بلگرامی کے برادر عزیز اور بلگرام کے مشہور خاندان کے رکن ہیں۔ آپ انڈین میڈیکل سروس کے سند یافتہ ہیں اور دیر تک فوجی ڈاکٹر رہے ہیں ۱۸۸۲ء اور ۱۸۸۳ء میں حسنِ اتفاق سے میجر صاحب بسلسلۂ ملازمت امرتسر میں مقیم تھے اور چونکہ خود ذی علم تھے۔ اس لئے انکی علم دوستی پروفیسر آزاد سے رشتۂ اُلفت قائم اور استوار ہونے کا وسیلہ بنی۔ اور اس خط و کتابت کا باعث ہوئی جسکو اب ہمیں انکی اجازت سے شائع کرنے کا موقع ملا ہے۔ میجر صاحب اِن بیش بہا خط و کتابت کو نہایت عزیز رکھتے ہیں اور اسی لئے یہ خطوط انکے پاس آج تک محفوظ رہے ہیں۔ اور چونکہ یہ ذاتی خط و کتابت

تھی۔ اِس لئے اسکی اشاعت میں متامّل تھے لیکن آخر یہ خیال غالب آیا۔ کہ پروفیسر آزاد کے حالات پبلک کا مال ہیں۔ اور اُن کے کلام کے شیدائی حق رکھتے ہیں کہ اُنکی جو تحریر دستیاب ہو۔ اُس سے فائدہ اُٹھائیں۔ خصوصًا اس صورت میں کہ زمانہ کے بے رحم ہاتھوں نے اُنکے جیتے جی انہیں ہم سے جدا کر رکھا ہے۔ اور ایک طویل علالت اُنکے ان تھک قلم کو بیکار کئے ہوئے ہے۔ ہم میجر سید حسن صاحب کی اس عنایت کے ممنون ہیں۔ اور اس سلسلۂ خط و کتابت کو چھاپنا شروع کرتے ہیں۔ افسوس صرف اتنا ہے کہ یہ سلسلہ مختصر ہے اور جلد ختم ہو جائیگا۔ لیکن اگر ایسے ہی دو چار اور مجموعے کسی کے پاس نکل آئیں تو ان سے مولانا آزاد کی ایک معقول سوانح عمری مرتب ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی صاحب ایسے اور مکتوبات بہم پہنچا ئینگے تو اُردو خوان جماعت پر احسان کرینگے۔ کیونکہ ان مکتوبات میں اُردوئے معلّٰے کا مزا آتا ہے۔

(عبدالقادر)

عالی جناب من دام اجلالکم

تسلیم۔ عنایت نامہ باعثِ اعزاز ہوا۔ رات کو دس بجے مَیں گھر پہنچا۔ اسوقت خطوط اور کارڈوں کا انبوہ سامنے ہے۔ دل دربار میں ہے اور دو دو حرفوں میں سب کو ٹال رہا ہوں۔ آپ کی تحریر کا جواب فرصت چاہتا ہے۔ مجھے کہاں؟ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ماثرالامرا اور سوانح اکبری کسی زمانہ میں دیکھی تھیں۔ یہاں تلاش تھی اور نہیں ملتی تھیں۔ چند مقاموں میں پُرانی کتابوں کا پتہ لگا تھا۔ ۲ دن میں بھاگا بھاگ گیا اور دوڑا دوڑ آیا۔ جو جو کچھ ہاتھ لگا اُسے دیکھتا گیا۔ اور یادداشتیں لیتا گیا۔ ماثرالامرا بھی مل گئی۔ شکر کا مقام ہے کہ جو کچھ مَیں نے دانہ دانہ اور قطرہ قطرہ کر کے جمع کیا ہے۔ وہ ماثرالامرا سے بہت زیادہ نکلا۔ پھر بھی حق سے گذرنا کفر ہے۔ ہر شخص کے حال میں تین تین چار چار نکتے مل گئے اور اچھے

مل گئے۔ سب سے زیادہ یہ ہی کہ اب جو دربارِ اکبری کا مشاہدہ کریگا۔ یہ نہ کہ سکیگا کہ آزاد کو ماثر نہیں ہاتھ آئی۔

دونوں صورتوں کی تفصیل آپ اب پوچھتے ہیں۔ افسوس۔ دیباچہ لکھنے کی نوبت ابھی کہاں آئی۔ خدا وہ دن کرے۔ دوصورتیں یہ کہ ایک تو وُہی معمولی طریقہ کہ ایک نسخہ پہلے ممدوح کو بھیجا۔ اور استمزاج کیا۔ ممدوح نے منظور فرمایا۔ مصنّف نے شکریہ ادا کیا۔ دُوسری صُورت کا مضمون آئینۂ خیال میں ایک تصویر موہوم ہی۔ اور اس وقت فرصت مفقود۔ اچھا میں خلاصہ خلاصہ قلمبند تو کرتا ہوں۔ دیکھوں کچھ رنگ دیتا ہے یا نہیں۔ اُس کا مضمون یُوں تصوّر فرمائیے۔ کہ جب اس موقع پر آب و رنگ اپنی دستکاری خرچ کر چکے تو عالمِ بالا کے پاک نہاد زمین پر اُتر آئے۔ دسوں عقلیں پانچوں حواس۔ غور۔ فکر وہم خیال وغیرہ وغیرہ سے انجمن منعقد ہُوئی۔ مانی و بہزاد کی رُوحوں نے اس کے سامنے ادب سے سر جھکایا۔ پہلا امر یہ پیش ہُوا کہ یہ دربار کہاں سجایا جائے سب نے دُوربینیں اُٹھائیں اور شش جہت میں نگاہیں دوڑائیں۔ کہیں موقع کی جگہ نظر نہ آئی۔ مگر وُہ ایوانِ عالیشان وغیرہ وغیرہ۔ وہم نے اعتراض کیا۔ کہ جب تک ممدوح سے اجازت نہ حاصل ہو۔ ایسی جسارت زیبا نہیں آزاد نے کہا۔ سحر کا نُور۔ شفق کی سُرخی۔ صبح کا عالم۔ جب نظر آتا ہے۔ اہلِ دل کہتے ہیں سُبحان اللہ۔ صبا و نسیم پھولوں کی شمیم لاتی ہیں۔ دِل کہتا ہی صلِّ علیٰ۔ اس میں آفتاب سے اجازت اور اس میں خسرو گل سے استمزاج کون کرتا ہی۔ مَیں نے ایسا ممدوح یہاں پایا۔ اُسی کے دامنِ اقبال سے وابستہ کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسے سب نے تسلیم کیا۔ اب عاجزانہ عرض کرتا ہوں کہ۔ وغیرہ وغیرہ۔

میری دانست میں یہ بھی ایک نیا مضمون ہی اور اس میں کچھ حرج نہیں۔

عالی جناب من ادام اللہ اقبالکم عفیف اجلالکم ۳ - فروری ۱۸۸۳ء یوم چہار شنبہ

تسلیم - خدا آپ کو خوش رکھے کہ مجھ گنہگار کے لئے دعا فرماتے ہیں - کیا کہوں ! دس دن کی چھٹی ہوئی تھی - باتیں کرنے کو بہت ہی چاہتا تھا - چاہا کہ حاضر خدمت ہوں - پھر کہا کہ چار سطریں ہی صاف ہونگی - انھی ہی باتیں کر لینگے -

گھوڑا حاضر ہے - یارکندی یابو ہے مشکی رنگ ہے - شائستہ - سنجیدہ متین "سولائزڈ" - اتنی کوتاہی ہے کہ میں تو اپنے حال میں مبتلا ہوں - اسکی غور و پرداخت کی فرصت نہیں ملتی - تاریخ اور وقت ضرور لکھ بھیجئے کہ کب تشریف لائیگا -

. . . .

کتاب النسوان انگریزی کا حال جو تحریر فرمایا ہے - میں سمجھ گیا - خدا اس بار سے فارغ کر دے اور آپ سے سرخرو ہوں - مجھے دل سے خیال ہے - آپ کیوں شرمندہ کرتے ہیں -

محمد حسین - آزاد

دربار اکبری کاتب سے بھی لکھواتا ہوں - آپ بھی لکھ رہا ہوں - خدا کرے کچھ ہو جائے - اب خدا کے فضل سے کئی حال آپ کے سنانے کے قابل ہو گئے ہیں - فیضی کے حال پر نظر ثانی کی تو مذہب کے سلسلہ میں مجھے خیال آیا تھا کہ دیکھئے آپ اور آپ کے بھائی صاحب اسے سنکر اور پڑھ کر کیا فرماتے ہیں - خدا وہ وقت دکھائے -

وصل اُس کا خدا نصیب کرے

میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

آزاد - تاریخ صدر

جنابِ من!

تسلیم - آج مجھے ایک ایسا معاملہ پیش آیا جو آج تک نہیں ہوا تھا - وہی مشکی گھوڑا جس کا کئی دفعہ آپ سے ذکر آیا تھا - سائیس لیکر بھاگ گیا - وہ ۱۱ بجے دن کے یہاں سے گیا ہے - اس لئے وہ کو کسی وقت امرتسر میں ضرور پہنچیگا - آپ اسی وقت پیش خدمت کو فرمائیں - کہ سراؤں اور چبے خانوں میں جا کر ایک نظر ڈالے - یہ گھوڑا یارکندی یا بوکر اور یک رنگ مشکی رنگ ہے - پیشانی اور ناک کے درمیان بال سفید بھی نظر آئینگے - عمر میں ۸ - ۹ - ۱۰ برس کا ہوگا - لاغر اندام ہے - سائیس کا امام دین نام ہے - اس کا بھی مشکی ہی رنگ ہے - ۳۵ - ۳۶ برس کی عمر ہوگی - اوسط قد لاغر اندام سر پر لال چھینٹ کا کن ٹوپ متوسط داڑھی چڑھواں - کانوں سے بہرا ہے علاقہ کپورتھلہ کا رہنے والا ہے -

کوتوالی لاہور سے بھی آدمی اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں لیکن شاید وہ دیر میں پہنچیں میں کارِ تحریر کے سبب سے حاضر نہیں ہو سکا - ورنہ خود آتا - حاضری بھی دیتا اور یہ کام بھی ہوجاتا -

اُس دن آپ کا تشریف لانا اور میرا ملاقات سے محروم رہنا - اب تک دل کو خراش دے رہا ہے - بہت سی باتیں تھیں کہ ضرور کہنے کے قابل تھیں - خصوصاً بعض مشورے مسودات کتاب کے باب میں - پروردگار پھر بخیر و سلامت ملنا نصیب کرے -

• نامۂ خسروان یقین ہے کہ بعد ملاحظہ آپ نے روانہ کر دیا ہوگا - اس کے باب میں جو آپ کے خیالات ہوں کچھ کچھ ضرور تحریر فرمائیے - ایسی تصویریں کہاں بن سکیں - یہ وُڈ کٹ کا کام ہے - شاید کاپر پلیٹ ہو -

تذکرۃ العورات کا حال جو آپ نے پہلے مرحمت نامہ میں لکھا تھا - معلوم نہیں کہ اس میں چاند بی بی کا بھی تذکرہ ہے یا نہیں - یہ بھی بڑی بالیاقت اور صاحب ہمت بی بی کن

میں ہوئی ہے۔ اسے نادرۃ الزمانی کہتے تھے۔ آپ وہاں سے اس کے حالات دریافت فرمائیں۔ اور مجھے بھی عنایت کریں۔ انشاءاللہ کبھی کام آئینگے۔ اسی طرح مصالح اکٹھا ہوا کرتا ہے رفتہ رفتہ عمارت تیار ہو جاتی ہے +

محمد حسین۔ آزاد
لاہور۔ بنگلہ ایوب شاہ ۔ ۹ جنوری ۸۳ء

جناب من۔

ایک امر واجب الاطلاع پیش آیا ہے۔ ذرا متوجہ ہو کر سنیئے۔ آپ نے اخباروں میں دیکھا ہوگا کہ گورنمنٹ سررشتہ تعلیم کے بوجھ سے سبکدوش ہونا چاہتی ہے۔ آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ سررشتۂ تعلیم پنجاب کا بہت سا بوجھ یونیورسٹی پنجاب اپنے سر پر رکھتی ہے۔ گورنمنٹ کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ کالج بھی یونیورسٹی کے حوالہ ہو جائیگا۔ یونیورسٹی کی یہ رائے ہے کہ علوم فنون ریاضی وغیرہ سب کی تعلیم ترجموں کے ذریعہ سے ہو جایا کریگی۔ فقط انگریزی کے لئے ایک ماسٹر اڑہائی سو روپے کا کافی ہے۔ سردست اس قدر تو نہ ہوگی۔ مگر اتنا ضرور ہوگا کہ یونیورسٹی کے پاس کئی مسجدوں کے مُلّانے اور ہندو پنڈت نکمے بیٹھے ہیں۔ طلبائے کالج کو یہ دیسی زبانیں پڑھا دیا کرینگے۔ کالج کے مولوی و پنڈت دونو نکمے۔ تب مولوی کا کیا حال؟ یا گورنمنٹ کوئی عہدہ دیگی۔ اکسٹرا اسسٹنٹی مشکل ہے۔ منصفی؟ تحصیلداری؟ شاید پنشن دیدیگی۔ اس میں ابھی دو برس کی کمی ہے۔ مگر ہو سکتی ہے۔ خیر ہو بھی تو ۵۰ روپے سے زیادہ نہیں۔ آسان اور عام قاعدہ یہ ہے کہ مسلسل نوکری ۱۲ برس کی ہے۔ اتنے مہینے کی تنخواہ لو اور سلام۔ اس تجویز کا عملدرآمد اپریل سے ہو جائیگا۔ اب خدا کی درگاہ سے امید ہے کہ تصنیفات کے

لئے فرصت کا موقع ملا کرے گا۔ سہ

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں
آنچہ مادر کار داریم اکثرش درکار نیست

آگرہ ۱۲ جنوری ۱۹۰۳ء
شب

جناب من۔

تسلیم۔ آپ دیکھتے ہیں۔ یہ علم کی چڑیل (یونیورسٹی پنجاب) تعلیم پنجاب کو ہضم کئے جاتی ہو۔ کالج کا بھی کلیجہ کھا چکی ہو۔ چند مہینے ہیں سُن لیجیئگا۔ کہ نگل گئی۔ باوجود اس کے کورس بنانے کے لئے ہم پکڑے جاتے ہیں۔ فرسٹ آرٹ۔ اور بی۔ اے کورس عربی و فارسی کے باب میں رائے طلب ہوئی۔ اب بنانے کے لئے حکم ہے کہ جلدی دو۔ قاآنی کا دیوان آپ کے پیش نظر ہے۔ عنایت فرما کر اس میں چند عمدہ قصیدے بتائیے۔ ہر قصیدہ کا مطلع یا پہلا مصرع لکھ دینا کافی ہو گا۔ صفحہ شاید مطابق نہ ہو گا۔ کیونکہ کتب خانہ میں چھاپہ ایران کا نسخہ ہو۔

خدا ہمارے بھائی ہندوں کو عقل مآل اندیش اور چشم دوربین اور نیک نیت عطا فرمائے۔

اگرچہ کورس کا جھگڑا پیچھے لگ گیا ہے۔ مگر میں مصروف کار رہوں۔ مشکل یہ ہے کہ طبیعت محنت پسند واقع ہوئی ہو۔ انتخاب میں آسان بات یہ ہو کہ کتاب اٹھائی۔ لکھ دیا کہ فلاں صفحہ سے فلاں صفحہ تک۔ مگر اسے دل پسند نہیں کرتا۔ جی چاہتا ہے

یسا انتخاب ہو کہ طلبا کے لئے مفید تعلیم بھی ہو اور پڑھنا اس کا ہر شخص کے لئے باعث شگفتگی ہو - البتہ اس میں محنت بہت ہے۔ بس اس وقت اتنا ہی کافی ہے۔

۳ر فروری ۱۹۰۳ء　　　منتظر جواب - بندہ آزاد

کالج کے باب میں ابھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا - میرا فیصلہ بھی اسی پر منحصر ہے - ظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ سرکار مجھے کوئی نہ کوئی عہدہ دیگی - خواہ سررشتہ تعلیم میں خواہ سول لائن میں اخیر درجہ پنشن کا ہے - یہ تو ظاہر ہے کہ جس گھر میں ۱۵۰ روپے مہینہ آتا ہے اس میں ۵۰ روپے آئینگے - تو صورتِ حال کیا ہوگی - لیکن دل کی آزادی یہی کہتی ہے کہ قناعت کو رفاقت میں لو - تھوڑا کھاؤ اور اپنی کتابوں کو پورا کرو - خدا کریم و کارساز ہے - وہ دینا چاہیگا تو اس کے ہزاروں ہاتھ ہیں - عہدہ کے لئے کوشش نہ کرو - آپ کی کیا رائے ہے -

پہلے بھی میرے کئی نامے خدمت میں پہنچ چکے ہیں تعجب ہے کہ آپ نے ایک کا جواب نہیں دیا - مزاج خدا کرے اچھا ہو -

تحریر صدر

عالی جنابِ من

تسلیم - مرحمت نامہ نے شرفِ اعزاز بخشا - طبیعت کا حال آپ نے بالکل نہ لکھا بہر حال شکار کا شغل بہت خوب ہے - میری عقل ناقص میں مزاج پہ حرارت غالب ہے جنگل کی ہوا اس کے لئے بہت مفید ہے - صبح کی ہوا خوری - کان اور منہ بند کر کے مسلسل جاری رکھیئے - اور ہرگز اس امر سے غافل نہ رہئے ....

میرے باب میں جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے - دل کو نہایت تشفی اور استقلال حاصل ہوا - اپنے جد کے خانہ زادوں کی دستگیری آپ صاحب نہ فرمائیں تو اور کون ہے - پروردگار

عالم ہی خاندان کو اقتدار روز افزوں عطا فرماتے۔ میں نے اپنے دل سے یہ قرار دے لیا ہے کہ اگر ایکسٹرا اسسٹنٹی ہی تو اختیار کرونگا۔ ورنہ پنشن لونگا۔ تھوڑے پر قناعت کرونگا۔ اپنی کتابوں کو پوری کوشش سے تیار کرکے پیشکش کرتا جاؤنگا اور دعائے دولت میں مصروف ہونگا۔ ہاں جو خدمت فرمائینگے وہ بھی بجا لاؤنگا۔ کالج کا تغیر نہیں بھی ہوتا۔ تو یہ سمجھ لیجئے کہ میں تو اب آپ صاحبوں کا ہو چکا تھا اور ہو چکا ہوں۔

درد دل کہنے سے مطلب ہو اثر ہو کہ نہ ہو
تم سنو یا نہ سنو نالے کئے جاؤں گا

بھیڑ ہووے گی رخ یار ادھر ہو کہ نہ ہو
حشر پر وعدہ دیدار ہے میں ڈرتا ہوں

میں آجکل عجب مخمصے میں پڑ گیا۔ ادھر مجھے کورس وغیرہ کا مرض لگ گیا۔ ادھر کالج کا تردد۔ کہ دفعتہ معلوم ہوا۔ آب حیات اور نیرنگ خیال امتحان یونیورسٹی میں داخل ہو گئی ہیں اور امتحان آغاز ہی پر ہوگا۔ سب نے کہا کہ دونوں کو ضرور چھپوانا چاہئے۔ ۳۔ ۴۔ سو طالب علم دفعتہ طلبگار ہوگا۔ مجھے بھی طمع نے للچایا اور فوراً شروع کر دیا۔ اگر نہایت کوشش ہو اور کاریگر بھی ہو۔ اور کئی چھاپہ خانوں سے کام لیا جائے۔ تو دو مہینے چاہئیں۔ خیر اب تو پھنس گیا۔ دو دو ہزار چھپوانے شروع کئے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ تنہا ہوں۔ رفیق کوئی نہیں۔ استغفر اللہ۔ یہ کیا کفر ہے۔ مولیٰ موجود ہے۔

. . . .

۱۰۔ فروری سنہ ۸۳ء آزاد

نرمی بہ

بزرگوں کی تصانیف ہی ایک ایسی لازوال دولت ہمارے پاس ہے جسکو ہمارے پیچھے ہمارے بعد فضول خرچیوں میں اڑا نہیں سکتے ٭

فریبِ دولت

سَینسل اور اس کی بیوی **ہلڈا** کھانے کے کمرے میں بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں اور سینسل ساتھ کے ساتھ ڈاک بھی دیکھتا جاتا ہے۔

سَینسل۔ جدھر دیکھو بل ہی بل۔ کہیں قصاب کا بل ہے۔ کہیں کوئی دوکاندار روپے کے لئے جھینک رہا ہے کیا کیا جائے عجب حالت ہے۔

ہلڈا۔ ہاں سچ ہے بل کسی طرح بھی نہیں رکیں گے۔ یہ تو آتے ہی رہیں گے۔ اچھا تم یہ انڈا تو کھاؤ۔

سَینسل۔ بیشک ایسے نازک وقت میں انسان کو ہمت نہ ہارنی چاہیئے۔ بلکہ بڑی تکلیفوں کے برداشت کرنے کے لئے آدمی کو اپنی جسمانی طاقت کا زیادہ خیال رکھنا چاہیئے۔

ہلڈا۔ بجا ہے صحت کا خیال مقدم ہے۔

سَینسل۔ ہلڈا! کبھی تم نے اس روپے کا بھی اندازہ کیا ہے جو ان بلوں کو ڈاک میں بھیجنے پر صرف ہوتا ہے اور بل بھی وہ جنکی ادائیگی کبھی نہ ہوگی۔ اس طرح ہم گورنمنٹ کو بہت فائدہ پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ ٹکٹ زیادہ بکتے ہیں نا؟

ہلڈا۔ اوہ تم ان بلوں سے نہ گھبرایا کرو۔ ہم تو اب ان سے ایسے مانوس ہو گئے ہیں کہ کبھی خیال بھی نہیں آتا۔

سَینسل۔ مگر میری طبیعت تو ان سے بہت اکتاتی چلی ہے۔ توبہ توبہ ہر وقت ایک ہی بھیانک شکل نظر آتی ہے۔ اگر یہ سوداگر لوگ اپنے بلوں کو مستطیل لفافوں کی بجائے مربع

مفاقوں میں بیچا کریں تو اچھا ہو۔

ہلڈا۔ میرے خیال میں تو ابھی تین چار مہینے تک ہمیں کہیں سے بھی روپیہ نہیں مل سکتا۔

سیبل۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ کیونکہ اس سہ ماہی کے گذرنے پر ہماری سالانہ آمدنی میں سے صرف ایک ہزار روپیہ وصول ہوگا۔ مگر کیا ہے۔ ہمارا قرض اس سے کہیں زیادہ ہے۔

ہلڈا۔ سیبل اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تم آمدنی کی کوئی اور صورت بھی نکالو۔

سیبل۔ میں کب نہیں چاہتا۔ سوال تو یہ ہے کہ کس طرح۔ مزدوری میں کر نہیں سکتا۔ اپنے عزیز رشتہ داروں کے پاس میں نے جاکر دیکھ لیا۔ اب کریں تو کیا کریں

ہلڈا۔ اپنی بدنصیبی کو روتی ہوں۔

سیبل۔ عقل حیران ہے۔ کوئی شخص مجھے یہ تو الزام دے نہیں سکتا کہ میں کچھ کرتا نہیں اور سست ہوں۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے میں برابر چار گھنٹے کی اوسط سے کام کیا کرتا ہوں۔ اس عرصے میں ایک دیوان ترتیب دیا ہے ایک ڈراما اور سال بھر کی محنت اور جانفشانی سے ایک ناول ختم کر چکا ہوں۔

ہلڈا۔ بیشک یہ کتابیں تو تم نے اچھی لکھی ہیں مگر ان سے وصول کچھ بھی نہ ہوا

سیبل۔ وصول؟ خسارہ ہی رہا۔ دیوان تو میں نے اپنے صرف سے ہی چھپوایا تھا جسکی اسوقت تک کلہم گیارہ جلدیں فروخت ہوئی ہیں اور قریب چھ سو روپے کے مجھے مطبع والوں کا دینا ہے۔ میری ان دونوں کتابوں کو تو بڑی ہی سیر کرنی پڑی۔ اب تک کئی مطبع جھانک چکی ہیں۔ کوئی کمبخت انکو لینے ہی کا روادار نہیں۔ چار مرتبہ تو میں خود صاف کر کے بھیج چکا ہوں اور صاف کرانے کے بل کا بھی روپیہ ابھی تک ادا نہیں ہوا۔

ہلڈا۔ اس سے تو ہمیں اور بھی خسارہ ہوا۔ میرے خیال میں اس محنت و مشقت سے تو بیکاری مفید ہے اور اسی میں بھلائی معلوم ہوتی ہے۔

سیسل۔ واقعی محنت بیکاری سے ہمیں گراں پڑتی ہے۔ اصل میں ہمیں کام کرنے ہی کی توفیق نہیں۔

ہلڈا۔ یہ تو کچھ امیروں ہی کا حصہ ہے۔ کہ وہ کام کریں۔ بھلا ہماری کیا اوقات ہے۔ بیکار رہیں گے قرض تو نہ بڑھیگا۔ غریب لوگوں کو تو یہی لازم ہے کہ امیروں کی طرف دیکھتے رہیں کہ وہ کس طرح کام کرتے ہیں۔ اور خود گوشۂ تنہائی میں عافیت سے بیٹھے رہیں۔ سچ تو ہے اور کیا کریں محنت کرتے ہیں تو اور زیرباری ہوتی ہے۔

سیسل۔ مگر جہانتک ہوسکے ہمیں کفایت شعاری کرنی چاہئیے۔ اچھا ہوا جو میں نے وہ انڈا ابھی کھا لیا کیونکہ ہماری حالت اسوقت بہت نازک ہے۔ ہمیں چاہئیے کہ ہم بڑی جوانمردی سے اس مصیبت کا مقابلہ کریں۔ اور جوانمرد بننے کے لئے تم جانتی ہو اچھی خوراک کی ضرورت ہے۔ اچھا ایک کاغذ کا ٹکڑا لاؤ اور بتاؤ کہ کون کون سی چیزیں ہیں جن کے بغیر ہم گذارہ کر سکتے ہیں۔

ہلڈا۔ واہ ایسی چیز کونسی ہے جس کے بغیر ہم رہ سکیں۔

سیسل۔ کیا واقعی کوئی ایسی چیز نہیں۔

ہلڈا۔ کھانا ہم کھائینگے ہی۔

سیسل۔ بیشک کھانا ضروری ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اسے اور بھی مختصر کردیں۔ مثلاً اتوار کی حاضری موقوف۔ پیر کو سہ پہر کا نقل اڑا دیں۔ منگل کو چائے نہ ہو اور بدھ کا سرے سے کھانا ہی بالقط۔

ہلڈا۔ نہیں یہ نہ ہوسکیگا۔ اگر تم سہ پہری کو کچھ نہ کھاؤ تو چائے اسی کثرت

سے بچ جاؤ گے تو کسر نکل جائیگی - اور پھر چائے کے ساتھ کیک جو تمہارا من بھاتا کھاجا ہے اور کس قدر گراں ہو کتنا اُڑا جایا کرو گے - نہیں صاحب یہ نہیں سمجھ میں آئی - اچھا اگر ہم انکو نہ کھائیں تو رات کو تو کھانا پڑے ہی گا اور اس طرح بیچاری خادمہ کو بہت تکلیف ہوگی۔

سیسل۔ خیر تو کھانے میں کوئی تخفیف ممکن نہیں - اب آؤ ذرا تم لباس کیطرف۔

ھلڈا۔ سیسل برا نہ ماننا اگر کل ہی تم مجھے بھدے لباس میں دیکھو تو کیا تم نفرت نہ کرو گے۔ علاوہ ازیں میری درزن کا بل تمہارے درزی کے بل سے زیادہ نہیں ہوتا اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اُس غریب پر ظلم کیا جائے۔

دوسرے تم جانتے ہو کہ آدمی کی عزت لباس سے ہی ہوتی ہے (الناس باللباس) واقعی اگر تم پھٹے پُرانے کپڑے پہنا کرو - تو میرے خیال میں کوئی تمہاری طرف توجہ بھی نہیں کرے - ہم تو پہلے ہی کسی شمار و قطار میں نہیں مگر اس طرح اور بھی ذلیل ہو جائینگے۔

سیسل۔ تو معلوم ہوا اِس میں بھی اور کفایت کی گنجائش نہیں۔ اچھا اب کرایہ کی گاڑیوں کو لیجئے۔

ھلڈا۔ ہاں گاڑیوں کا کرایہ یہاں بہت زیادہ ہے مگر تم اچھے کپڑے پہن کر ٹرام میں بھی تو نہیں بیٹھ سکتے۔ ایک آنے کی خاطر بیس[1] پچیس کے سوٹ کا ستیاناس کر دیا جائے یہ کونسی عقلمندی ہے - ہم باز آئے ایسی کفایت شعاریوں سے۔

سیسل۔ اچھا کوئی چیز اور لکھنے کے قابل ہے۔

مفصلہ ذیل امور میں کفایت شعاری ضروری ہے۔

(۱) کوئی کام نہ کیا جائے کیونکہ اس سے قرض کے بڑھنے کا اندیشہ ہے۔

اور ۔ اگر ہمیں قرضخواہوں نے زیادہ تنگ کیا تو ہم یہاں سے بھاگ نہیں

ھلڈا۔ یہ اچھا ہوگا میں خود ویسٹ[2] کنسنگٹن کو پسند نہیں کرتی۔

---

[1] یہاں عموماً غربا اور کم حیثیت لوگ رہتے ہیں۔

سیسل۔ یہاں ہم جیسے آدمیوں کا گذارہ بھی نہیں۔

ھلڈا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا ناول کبھی کا بک گیا ہوتا۔ اگر تم کہیں (پارک) کے قریب ہوتے۔

سیسل۔ میرا بھی یہی خیال ہے آجکل ہر چیز کا انحصار پتہ پر ہے اب دیکھئے نہ معمولی آلو اگر یہاں سے خرید کرو تو ا سیر ملینگے۔ اگر یہی آلو دوسرے بازار میں جا کر بکنے لگیں تو عمدہ چیز بن جائیں

ھلڈا۔ پیارے سیسل ایک چیز بڑی غنیمت ہے جو ہمیں میسر ہے اور وہ یہ کہ ہم کو آپس میں بیحد محبت ہے۔

سیسل۔ واقعی اگر یہ بات بھی نہ ہوتی تو بہت مشکل ہوتی یہ دن کٹنے مشکل ہو جاتے

(ایک دوسرے کو پیار کرنے لگتے ہیں)

ھلڈا۔ سیسل پیارے! کیا تم نے سب ڈاک دیکھ لی؟۔

سیسل۔ سب کہاں۔ ابھی بہت سے خط بند پڑے ہیں سب کا ایک مضمون ہوگا۔ کہاں تک پڑھے جائیں۔

ھلڈا۔ اچھا مجھے دکھاؤ (ایک خط دیکھ کر) اوہو تم نے یہ لمبا لفافہ کا خط کھولا ہی نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ بہت ضروری ہے۔

سیسل۔ (خط ہاتھ میں لیکر) یہ؟ نہیں یہ ضروری نہیں یہ تو کسی کمپنی کا اشتہار ہے کہ حصے خریدو۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ جب انسان کے پاس روپیہ نہیں ہوتا تو لوگ ایسی ایسی تجویزیں کرتے ہیں کہ جن میں ۲۵ فیصدی منافع تو یقینی ہو۔

ھلڈا۔ اچھا اس خط کو تو کھولو۔

سیسل۔ ابھی رہنے بھی دو۔ میں انکو دیکھ کر پریشان ہوتا ہوں۔

ھلڈا۔ اچھا میں کھولتی ہوں (ایک خط کھول کر پڑھنے لگتی ہے) ہیں! یہ کیا!

یہ کس طرح سچ ہوسکتا ہے۔

سیسل۔ کیا ہے پیاری؟ مجھے دکھانا۔

ہلڈا۔ اسکو پڑھو سیسل!

سیسل۔ خط پڑھتا ہے:-

جناب مکرم بندہ۔

آپ کے مرحوم چچا کی وصیت کے بموجب ہم آپکو اطلاع دیتے ہیں کہ آپ ہی اُن کے جائز وارث ہیں۔ ترکہ جو آپ کو وراثت میں آیا ہے اُس کا تخمینہ ۳۰ لاکھ روپے کے قریب ہے۔ اس رقم کے متعلق آپ کی ہدایات کے ہم منتظر ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپ بہت جلد مناسب ہدایات بھیجکر ہمیں ممنون فرمائینگے۔

گرین فیلڈ کمپنی

ہلڈا۔ چچا کے وارث اور پھر اکیلے تم ہی!

سیسل۔ اور اکٹھا تیس لاکھ روپیہ؟

ہلڈا۔ اور آپ کی ہدایات کے منتظر!

سیسل۔ اوہ! میری حیثیت سے یہ اس قدر زیادہ ہے کہ مجھے باور نہیں آتا۔ شک ہے کہ میں نے وُہ انڈا ابھی کھالیا تھا ورنہ اس دُنیا میں مقابلہ بڑا ہی مشکل ہے۔

ہلڈا۔ سیسل! کیا اس سے یہ مراد ہے کہ ہم تیس لاکھ روپیے کے مالک ہیں۔

سیسل۔ اگر گرین فیلڈ کمپنی کا کوئی وجود ہے اور وُہ دروغگو بھی نہیں تو ہم یقیناً مالک ہیں۔

ہلڈا۔ کیا وُہ جھوٹ بھی بولا کرتے ہیں؟

سیسل۔ مگران کا نام بہت مشہور ہے اور انکی ساکھ بہت قائم ہے۔

ہلڈا- کیا واقعی اس قدر روپیہ اب ہمارا ہے۔

سیسل- بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

ہلڈا- تعجب ہے ابھی کھانے کے وقت تو ہم مفلس نادار تھے اور اب ہم اس قدر متمول بن گئے۔

سیسل- گویا ہم نے بہت ترقی کی ہے۔ جھونپڑی سے محل میں جا براجے۔

ہلڈا- مگر اس خط میں لکھا ہے کہ تمہارا مرحوم چچا۔ سیسل تمہارے ایک چچا بھی تو تھے۔

سیسل- چچا۔ تایا کا رشتہ ایسا ہے کہ اُن سے کوئی شخص خالی نہیں۔ ہر شخص کے کئی چچا ہوتے ہیں لیکن میرے تو سگے چچا بھی ہیں۔

ہلڈا- تمہارے خیال میں یہ پھر کس کا انتقال ہوا۔

سیسل- میں سمجھتا ہوں شاید آسٹریلیا والے چچا مر گئے۔

ہلڈا- مجھے تو یہ معلوم نہیں تھا کہ تمہارے کوئی چچا آسٹریلیا میں بھی ہیں۔

سیسل- لیکن آسٹریلیا میں تو ہر شخص کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار ہوتا ہے۔ میرے چچا کی طبیعت میں آوارگی سی تھی وُہ اپنے کُنبہ کو چھوڑکر وہیں چلا گیا۔ اور اُس کے بعد آج تک ہم نے کبھی کوئی خبر نہیں سُنی۔ اتنا ہم جانتے ہیں کہ وُہ آسٹریلیا گیا تھا۔ اور وہاں اُس نے روپیہ بہت کمایا۔

ہلڈا- اسقدر روپیہ کس طرح کمایا؟

سیسل- اس کا بھیڑوں کا بیوپار تھا اور اسی تجارت کی وجہ سے دیکھ لو کہ وُہ کس قدر مال چھوڑ مرا ہے۔

ہلڈا- مگر اس روپے کے وارث تم کس طرح ہو گئے؟

سیسل- میرا چچا بوڑھا تو ہو ہی گیا تھا۔ مگر حُبِ وطن کا مادہ اس میں جوان تھا وُہ

وہں سے خود تو نہ آسکا روپیہ اُس نے اپنے عزیز بھتیجے کو بھیج دیا۔

ہلڈا۔ کیا وُہ تم کو بہت عزیز سمجھتا تھا۔

سیسل۔ یہ تو اب ظاہر ہی ہے۔

ہلڈا۔ مگر تم کبھی اس سے ملے نہیں۔

سیسل۔ یہ سچ ہے مگر اُس نے میرا دیوان ضرور دیکھا ہوگا۔ اُس نے ضرور ان گیارہ جلدوں میں سے ایک جلد خریدی ہوگی۔ دیکھو ہلڈا وُہ چھ سو روپے کی رقم جو ابھی تک مجھ کو مطبع کی دینی ہے۔ آخر کار میرے لئے کسقدر روپیہ لے آئی۔ خیال تو کیجئے۔ تیس لاکھ۔ دس نہ بیس پورے تیس۔

ہلڈا۔ مگر سیسل یہ سب باتیں اپنے چچا کے متعلق تمہیں کیونکر معلوم ہوئیں۔

سیسل۔ میری جان۔ آجکل کے افسانوں کو دیکھ کر آدمی یہ نتیجہ نکال سکتا ہی کہ اس قسم کے واقعات اسی طرح واقع ہوتے ہیں۔

ہلڈا۔ خیر جانے دو ان باتوں کو ہمیں تو اب یہ سمجھ لینا چاہئیے کہ ہم تیس لاکھ روپے کے مالک ہیں۔

سیسل۔ اچھا مجھے ایک کاغذ کا ٹکڑا اور دو (حساب کرکے) دیکھو ایک روپیہ ڈیڑھ انچہ لمبا ہوتا ہے۔ اس حساب سے اگر تیس لاکھ روپیہ ایک ہی قطار میں رکھا جائے تو قریبًا پانچ میل تک پہنچ جائیگا۔

ہلڈا۔ سیسل تم کس قدر بیوقوف ہو تم اس روپے کو اس طرح رکھنا چاہتے ہو نہیں ہیں تو خرچ کرونگی۔ بھلا یہ تو بتاؤ میں کتنا خرچ کرسکونگی۔

سیسل۔ ہمیں وقت بوقت کا بھی فکر چاہئیے۔ اور اگر روپے ایسی محفوظ جگہ میں لگائیں جہاں کسی قسم کا خطرہ نہ ہو تو ہمیں دس ہزار ماہوار کی آمدنی ہوسکتی ہے۔

ھلڈا۔ دس ہزار ماہوار۔

سیسل۔ تو اَور کیا۔ واقعی نہایت معقول آمدنی ہے۔

ھلڈا۔ اب ہمیں ہر چیز میسّر آسکتی ہے۔ اچھا کچھ روپیہ تو دو۔ مجھے ابھی دکان پر جانا ہے

سیسل۔ واہ! ابھی ذرا دم تو لو۔ اس قدر بے صبر نہ بنتی جاؤ۔ تم تو جانتی ہی ہو بھلا اسوقت میرے پاس کیا دھرا ہے۔

ھلڈا۔ اچھا تم ٹوپی سر پر رکھو اور ابھی جا کے روپیہ لے آؤ۔

سیسل۔ دیکھو جی ہمیں اس قدر جلدی نہیں چاہیئے کسی طرح گرین فیلڈ والوں کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم بالکل ہی مفلس قلاش ہیں۔ اور ہم روپے کے اس قدر بھوکے ہیں۔

ھلڈا۔ مگر مَیں تو واقعی بھوکی ہوں۔

سیسل۔ یہ مَیں جانتا ہوں مگر تاہم ہمیں اپنی ضرورت اور خواہش کو چھپانا چاہیئے خودداری کو ہاتھ سے نہ دو۔ سہ پہر کے کھانے کے بعد مَیں اطمینان سے وہاں جاؤنگا

ھلڈا۔ نہیں صاحب مَیں تو اسوقت تک انتظار نہیں کرسکتی۔ آج ایک دکان پر مَیں نے پیرس کا نہایت خوبصورت ڈریس بالکل نئے نمونے کا دیکھا ہے اُسے مَیں فوراً خریدنا چاہتی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی اَور عورت خرید لے۔

سیسل۔ کیا تم اُسے اُدھار نہیں لاسکتی۔

ھلڈا۔ مَیں کیوں اُدھار لاؤں۔ مَیں مانگ بھی نہیں سکتی۔

سیسل۔ اچھا تو تم کل صبح کو خرید لینا۔

ھلڈا۔ مَیں کہتی ہوں کل صبح تک اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ رہیگا۔

سیسل۔ تو مَیں اَور لے دونگا۔

ہلڈا۔ دیکھو سیسل! مجھے رنجیدہ نہ کرو۔ یہ پوشاک مجھے بہت پسند ہے اب جو خدا نے ہمیں اس قدر روپیہ دیا ہے تو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ جب ہم مفلس تھے میں نے کبھی بھی ایسی کوئی چیز تم سے طلب کی تھی۔ اب خدا کے فضل سے ہم بہت متموّل ہیں اور اپنی حیثیت کے قائم رکھنے کے لئے یہ لباس میرے لئے ضروری ہے۔ بس اب میری یہی ضد ہے اور یہ تمہیں اٹھانی ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ذرا میرے حال پر عنایت فرمائیے اور سیدھے گرین فیلڈ کمپنی کی طرف تشریف لیجائیے اور وہاں سے فوراً روپیہ لیکر مجھے اسی دوکان میں ملئے جہاں میں نے وہ لباس دیکھا تھا۔ دیکھو بارہ بجے ضرور پہنچ جانا۔

سیسل۔ میری پیاری ہلڈا! تم شاید اس رنج کا اندازہ نہیں کر سکتیں جو مجھے تمہاری درخواست کے رد کرنے میں ہوتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں مجبور ہوں میری خودداری اس طرح قائم نہیں رہ سکتی اگر میں اپنے مختاروں کے پاس سہ پہر سے پیشتر جاؤں۔ سُنو سُنو۔ بلکہ میں تمہارے ایک عارضی اور فضول شوق کی خاطر اپنی عزت کو بالائے طاق نہیں رکھ سکتا۔ تم ہی بتاؤ اس میں کس قدر سُبکی ہے۔ ابھی تو ہمارے پاس اطلاع پہنچی ہے اور ابھی پانچ ہی منٹ کے بعد ہم روپیہ کے تقاضے کے لئے وہاں جا پہنچیں۔ توبہ توبہ اس سے کس قدر سفلہ پن۔ بے صبری حرص اور احتیاج ٹپکتی ہے۔

ہلڈا۔ کیا کہا؟ آپکی عزت جاتی ہے؟ بہ بہ خوش۔ اب آپ عزت والے بھی بن گئے۔ سُبحان اللہ۔

سیسل۔ بیشک تیس لاکھ روپے کی رقم ایک عزت بھی ساتھ لاتی ہے۔

ہلڈا۔ مگر اس سے پہلے تو تم ہمیشہ میری بات مان لیا کرتے تھے۔

سیسل۔ بجا ہے لیکن اُسوقت میں اس کے سوائے اور تمہیں کسی طرح خوش

نہیں کرسکتا تھا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ تم کس خیال میں ہو؟ تیس لاکھ روپیہ بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ ایک لاکھ روپے سے تو سر پھر جاتے ہیں اور یہاں تو پورے تیس لاکھ ہیں۔ تمہاری خوشنودی مزاج مجھے ہمیشہ مقدم ہوگی مگر گھر بار کا مالک مختار اب مجھے سمجھو نہیں میری بنی پڑیگی۔

ہلڈا۔ کیا بکواس کررہے ہو۔ گھر بار کے مالک بھی بن گئے۔ اسی جھونپڑے پہ اتراتے ہو۔

سیسل۔ نہیں اب ہم یہاں نہیں رہینگے۔ مگر میں نے تم کو جتا دیا ہے کہ جس طرح میری رائے ہوگی اسی طرح میں کرونگا۔ میں اپنے چچا مرحوم کے نقش قدم پر چلونگا وہ ایک با اصول شخص تھا۔ تارک الوطن تو وہ بنا مگر یہ دیکھ لو کہ اپنا روپیہ اُس نے غیروں کو نہیں دیا۔ تکلیفوں پہ تکلیفیں جھیلیں مگر روپیہ جمع کیا۔ میرا دیوان اُس نے خرید کیا حالانکہ اسوقت عام طور پر میرا دیوان نہیں پسند کیا گیا۔ مگر وہ شخص اپنی دُھن کا پکا تھا اور ایک ارادہ اس کے دل میں پیدا ہوچکا تھا۔ چنانچہ اُس نے عام رائے کا خیال نہ کیا اور ایک جلد خرید ہی لی۔ میں بھی اپنے چچا (خدا اسے مغفرت کرے) کی تقلید کرونگا۔ ایک اصول پر قائم رہونگا اور کرونگا وہی جو میرے دل میں آئیگا۔

ہلڈا۔ بہت اچھا اب میں زیادہ کچھ نہیں کہتی۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ آج یہ پہلی مرتبہ ہے کہ تم میرے ساتھ اس طرح پیش آئے ہو۔

سیسل۔ ہلڈا! تم کس قدر نا انصاف ہو۔ میں تمہارے ساتھ بداخلاقی سے پیش نہیں آیا۔ تم ذرا سمجھ سے کام لیتیں اور نامعقول باتیں نہ کرتیں۔

ہلڈا۔ اچھا میں نامعقول ہی سہی۔ کیا آپ کسی عورت سے معقولیت کی توقع رکھتے ہیں۔ کیا میں حسین ہوں؟ سیسل!

سیسل۔ بیشک حسین ہو۔

ہلڈا۔ کیا میں تمہارا دل نہیں بہلایا کرتی ؟

سیسل۔ تم ضرور بہلاتی ہو لیکن اُسوقت نہیں جب تم کسی ضد پر آجاؤ یا اپنے آپ میں نہ ہو۔

ہلڈا۔ اچھا جب میں حسین بھی ہوں دلربا بھی ہوں تو پھر آپ مجھ سے معقولیت کی توقع کیوںکر رکھتے ہیں۔

سیسل۔ پیارے اُٹھو کپڑے پہن لو اور جاؤ روپیہ لے آؤ۔ میرا دل بہت للچا رہا ہے۔ ہائے ہائے وہ ڈبیں کس قدر نفیس سلا ہوا ہے۔

سیسل۔ ہلڈا ! جب میں کسی کام میں نہیں کر دوں تو اُسے میری نہیں سمجھو اور میری ہاں کو ہاں خیال کیا کرو۔

ہلڈا۔ تم بڑے کمینے اور خود غرض ہو۔

سیسل۔ دیکھو ہوش میں آؤ۔ کیا باتیں کر رہی ہو۔ اس قدر شوخ اور بے ادب نہ بنتی جاؤ۔

ہلڈا۔ کیا بیوی اپنے خاوند کے ساتھ بھی بے تکلف باتیں نہیں کر سکتی ؟

سیسل۔ اسوقت نہیں جب خاوند مالدار ہو۔ ورنہ خُدا کے عطیہ کی ناشکری ہوگی۔

• ہلڈا۔ کاش یہ دولت تمہارے ہاتھ میں نہ آتی۔

سیسل۔ دیکھو ہلڈا اگر تم میرا لحاظ نہیں کرتیں تو میرے مرحُوم چچا کا تو پاس ادب کرو۔ میں اس کا جائز وارث ہوں۔ میں اپنے منہ پر اس کی بُرائی کسی طرح نہیں سُن سکتا

ہلڈا۔ تمہارے چچا کا تمہیں اپنا وارث چھوڑ جانے سے مجھے کیا فائدہ ہوا۔ کیونکہ جو میں چاہتی ہوں وُہی میسر نہیں آتا تو تمہاری دولت فضول اور تمہاری وراثت بے سود

یشاب چیزیں خریدنا اسوقت نامناسب تھا جب تمہارے پاس روپیہ نہ ہوتا۔ لیکن جس حالت میں تم اتنے روپے کا مالک ہو اور اتنی اتنی بڑی رقم تمہاری منتظر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میں اپنی خواہشیں نہ پوری کروں۔

سیسل۔ میری جان ہلڈا دیکھو میں تمہیں سمجھاتا ہوں تم ذرا ضبط کو ہاتھ سے نہ دو اتنے امیر اور متمول لوگ ہی ایثار اور جبر نفس کی خوبی حاصل کرسکتے ہیں۔ غریبوں کو تو کچھ میسر ہی نہیں آتا لیکن کہہ دیتے ہیں کہ ہم بڑے جابر ہیں۔ میری جان خوبی اس میں ہے کہ ہر چیز حاصل کرنے کی قدرت ہو اور پھر اپنی خواہشوں پر جبر کرے۔

ہلڈا۔ تو کیا تمہیں یہ دولت اسی غرض سے ملی ہے کہ میں اپنے نفس پر جبر کرنا سیکھوں؟

سیسل۔ نہیں یہ غرض نہیں۔ لیکن یہ ایک ضروری امر ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس پر ضرور عمل کرو۔

ہلڈا۔ اچھا معاف کیجئے۔ میں یہ نیلیاں اور خیال سیکھنا نہیں چاہتی۔ میں اپنی موجودہ حالت میں ہی خوش ہوں۔ بلکہ میری عین تمنا ہے کہ تم میرے ساتھ اسی طرح پیش آؤ جس طرح تم کھانے سے پہلے تھے۔

سیسل۔ جان من! میں کبھی تم سے سختی سے پیش آنا نہیں چاہتا۔ لیکن ہماری اسوقت کی اور اسوقت کی حالت میں ضرور فرق آگیا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہماری آمدنی اب بہت بڑھ گئی ہے اب تمہاری سب خواہشیں پوری ہو جائینگی۔ اور میں تمہیں جو کچھ تم کہو گی لے دونگا۔

ہلڈا۔ مجھے تو تم وہی پوشاک لے دو۔

سیسل۔ خیر اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایک غریب آدمی کو تو ضرور اچھا لباس رکھنا چاہئے۔ اس کے بغیر اعتبار نہیں جمتا اور قرض کے ملنے میں بھی بہت

آسانی ہوتی ہے۔ لیکن اب قرض کی ضرورت ہی نہیں رہی - اس لئے سردست لباس کی طرف اس قدر فوری توجہ بیفائدہ ہے۔

ہلڈا - یہ کیا بیہودگی ہے؟

سیسل - مجھے یاد ہے۔ ایک کھپتی کی نسبت میں نے کہیں پڑھا تھا۔ کہ اس کے کپڑے اپنے میلے کچیلے اور پھٹے پرانے ہوا کرتے تھے کہ بہت سی عورتیں اُسے مفلس سمجھکر بھیک دے دیا کرتی تھیں۔

ہلڈا - کیا ذکر ہے وہ ہوگا ہی ایسا ہی۔

سیسل - غالب اسکو نئے کپڑوں سے نفرت ہوگی ورنہ کیا اسے نئے کپڑوں کی توفیق نہ تھی یا کچھ اور غرض اپنا اپنا مذاق ہے۔

ہلڈا - میں تو پرانے کپڑے نہیں پسند کرتی اسوقت خدا کے فضل سے مجھے توفیق حاصل ہے کہ نئے کپڑے بنوا سکوں۔

سیسل - میری جان میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ تمہاری کوئی خواہش پوری نہ ہو میں تو یہ کہتا ہوں کہ ذرا کی ذرا تم ٹھہرو اور تھوڑی دیر اور انتظار کرو۔

ہلڈا - لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ وہ ڈریس جسکی مجھے ضرورت ہے میرا انتظار نہ کریگا۔

سیسل - تو وہ ڈریس ہمیں پھر نہیں مل سکتا۔

ہلڈا - ان باتوں سے مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہوتی جاتی ہے۔ مجھے اس بات کا اب یقین نہیں کہ تمہارے دل میں میری محبت اتنی بھی باقی رہی ہو جتنی اُڑد پر سفیدی۔

سیسل - کیا خوب؟ محبت کا امتحان اس طرح نہیں ہوسکتا کہ میں سب کام تمہارے

منشا کے مطابق ہی کروں - تمہاری درخواست کا نامنظور کرنا ہی اکثر اوقات اس امر کی بیّن شہادت ہے کہ مجھے تم سے کیسی غضب کی محبت ہے - اور مَیں یقین کرتا ہُوں کہ اس قسم کی ذرا ذرا سی تلخ رنجیوں سے ہماری اس گہری محبت اور رشتہ یگانگت میں کسی قسم کا فرق نہ آسکیگا -

ہلڈا - مَیں باز آئی اس گہری محبت سے - جنابِ عالی! رشتہ محبت ہرگز ایسا مضبوط نہیں کہ ٹوٹ ہی نہ سکے - یہ تو ایسا کچا دھاگہ ہے - جو ذرا سی کشید گی سے کئی ٹکڑے ہوسکتا ہے - ہاں یہ رشتہ اسوقت تک نہیں ٹوٹ سکتا جب تک دونو طرف سے ڈھیلا چھوڑا ہوا ہے -

سیسل ! مَیں تو اب تمہاری صُورت دیکھنے سے بھی بیزار ہوں - افسوس تم بڑے عیار نکلے -

سیسل - عیّار - خدا بہتر جانتا ہے کہ مَیں نے تمہارے ساتھ کیا عیّاری کی ہے - لیکن اس شخص کے لئے جو نہ صرف ایک دیوان ایک ناول اور ایک ڈرامے کا مصنف ہو بلکہ اپنے چچا کے ورثے سے تین لاکھ روپیہ کا بھی مالک بنا ہو - بیشک اُس کے لئے ایسے الفاظ ناقابلِ برداشت ضرور ہیں - اور تم اُسی کو عیّار کہتی ہو -

ہلڈا - جانے میری بلا کہ تمہارے چچا کون تھے - مجھے اُن کی کیا پروا ہے مَیں کیا جانتی ہوں کسی کو - غرض - تم بڑے جالئے دھوکے باز اور دغاباز شخص ہو - میں تمہاری ان سب کتابوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہُوں - لو - خدا کی شان تم ابھی سے اس قدر مغرور ہوگئے - ابھی تو تم نے روپے کی صُورت بھی نہیں دیکھی دیکھو لوگے تو خدا جانے پھر کیا قہر توڑو گے - ستیاناس جائے اس روپے کا جس نے تمہارا سر پھرا دیا -

سیسل۔ دیکھو دیکھو زرعلیہ السلام کی شان میں ایسے الفاظ نہ کہو۔ آجکل یہ دونہ تو ہین کفر میں داخل ہے۔

ھلڈا۔ اوہ۔ میں اس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتی۔ تم ایسے بہا لی ظرف ہو کہ یہ نہیں ٹل جاتے اور تم ضبط کر سکو۔ تمہاری کم ظرفی اسی بات سے نظر رہی ہے تم بات بات میں اپنا چھچھورا پن ثابت کر رہے ہو۔ تمہیں تمہاری بہاری تھی اور اب پیارے بچے ہیں دیکھو کتنا فرق آگیا ہے۔ اور اگر تمہارے مزاج کی ترقی کی یہی رہی تو مجھے یقین ہے کہ ہماری تمہاری بولی بیزار ہو جائیگی۔ تو ہمارے نئے بچے میرا تمہارا تعلق ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جائیگا۔

سیسل۔ تم نے تو یونہی بکواس لگا رکھی ہے۔

ھلڈا۔ بکواس کیا تمہیں یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوتا کہ تمہارے چچا کے انتقال نے میری عمر بھر کی خوشی پر پانی پھیر دیا۔ میری تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور میری امیدوں کا خون ہو گیا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اس ایک واقعہ نے میرے تمام عیش کو منتقص کر دیا۔ اس سے پیشتر غریب تھے نادار تھے مفلس تھے۔ قلاش تھے لیکن مزے سے زندگی بسر کرتے تھے۔

ایسے ہی موقعے تو ہوتے ہیں جہاں انسان کی شرافت اور اصالت کا امتحان ہوتا ہے۔ کمینے کمظرف کا پیٹ پھٹ جاتا ہے۔ دماغ میں فرعونی ہوا سما جاتی ہے اور وہ اپنی پہلی درماندگی کی حالت کو بھول کر غرور و نخوت کی پٹی اپنی آنکھوں پر باندھ لیتا ہے۔

سیسل۔ دیکھو ہلڈا! تم مجھ کو برا بھلا کہہ لو لیکن میرے چچا کو کچھ نہ کہو۔ اس غریب نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ وہ واقعی ایک ممدوح اور محسن تھا۔

ھلڈا۔ خیر میں یہ باتیں نہیں جانتی۔ ذرا سمجھاؤ تو انہوں نے کونسی ایسی قابل تعریف

بات کی تھی۔

سیسل۔ واہ۔ اُس نے میرا دیوان خرید لیا اور ابھی اُس نے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔

ہلڈا۔ روپے کا یہ استعمال آپ قابل تعریف سمجھتے ہونگے لیکن میرے خیال میں تو اُسے ضائع ہی کیا۔ اسی پر پھر تم کہتے ہو کہ وُہ بڑا نیک اور دانا آدمی تھا۔ مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ ہفتہ آیندہ تک تم بھی ویسے ہی بن جاؤ گے۔

سیسل۔ میرے خیال میں اس بحث کو اب چھوڑ دیا جائے۔ اِس میں کچھ فائدہ نہیں۔

ہلڈا۔ میں تم سے پُوچھتا ہُوں۔ تمہیں اپنے خاوند کی اطاعت کا کچھ بھی خیال ہے جو تم پر فرض ہے۔؟

ہلڈا۔ چھ چھ۔ تم ایک نہایت بیوقوف سڑی خودغرض اور خودرائے شخص ہو میں تم سے نفرت کرتی ہُوں۔

(ہلڈا باہر چلی جاتی ہے)

سیسل۔ (دل ہی دل میں) افسوس۔ غریب ہلڈا! یہ انقلابات واقعی ایک عورت کی عقل کو چکرا دیتے ہیں۔ واقعی۔ تین سو روپیہ ماہوار سے دس ہزار روپیہ ماہوار کی ترقی ایک بھلے چنگے مرد کو حیران کر دیتی ہے تو یہ تو پھر عورت ہے۔ البتہ مجھے اس بات کا ضرور رنج ہے کہ میں نے اسے ناراض کر دیا۔ لیکن اس طرح روپے کے لئے وہاں جاکر تقاضا کرنا بھی بہت معیوب تھا۔ گویا انکو یہ جتانا ہے کہ میں نے روپیہ کی صُورت ہی کبھی نہیں دیکھی۔ سہ پہر کو معمولی وقت پر میں وہاں جاؤنگا اور سرسری طور پر کہدونگا۔ (اوہو اچھے وقت یاد آیا) ہاں صاحب! وہ کچھ روپیہ ہمارا آپ کے پاس بھی ہے نا۔ گویا میں اس طرح طلب کرونگا۔ جس طرح کسی کی چھتری کسی کے ہاں رہ جائے۔ اور وُہ اس کے متعلق پُوچھتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ روپیہ جس وقت ملا اس کے

سنبھالنے میں ضرور دقت ہوگی۔ خرچ کرنے میں بھی ایک اُلجھن ہوگی۔ اور جس وقت روپیہ پاس آیا تو ہزاروں جھمیلے اور خدشے اس کے ساتھ آئے۔ مثلاً کہیں نقب زنی کا اندیشہ کہیں سوداگروں کی کمپنیاں انکے حصّوں کے خریدنے کے لئے مجبور کرینگی انکی دیکھ بھال اور پھر ان نادہند کمپنیوں سے روپے وصول کرنے کی غرض سے وکیلوں کی فیسیں اور پھر کہیں قرض مانگنے والوں کی بھرمار بڑے بڑے مہذب گداگر آئینگے۔ اور پھر دُنیا میں ہر شخص پیارا رشتہ دار بنجائیگا۔ غرضکہ بہت سی مصیبتیں نظر آرہی ہیں۔ اور پھر ہلڈا ہے جو ہر وقت لڑتی جھگڑتی رہیگی۔ اس سے تو بہتر ہوتا کہ چچا مجھے اپنا وارث نہ کرتے مگر اب کیا کیا جائے۔ مرحوم کی دلشکنی بھی تو مَیں نہیں کرسکتا۔ اچھا جس طرح ہوگا تیس لاکھ روپیہ سنبھال لونگا۔

ہلڈا ! ہلڈا۔ بات تو سنو۔

(ہلڈا اندر آتی ہے)

ہلڈا۔ کیوں کیا کہتے ہو۔

سیسل۔ مَیں تم سے یہ پوچھتا ہُوں کہ ہم روپے کو کس طرح استعمال میں لائیں۔

ہلڈا۔ وُہ روپیہ کیا مِل گیا ہے؟

سیسل۔ ابھی تو نہیں۔

ہلڈا۔ مَیں تو یہی کہتی ہُوں کہ ابھی اور انتظار کرو۔ پہلے روپیہ تو مِل لے۔

سیسل۔ لیکن روپیہ تو بہرحال دو چار گھنٹے میں ہمیں مل ہی جائیگا۔

ہلڈا۔ دو چار گھنٹے تک ملا تو کیا فائدہ۔ مَیں پہلے بھی کہہ چکی ہُوں کہ میرے لئے پھر بے سُود ہوگا۔

سیسل۔ اچھا پیاری یہ تو بتاؤ کہ تمہاری سیر و تفریح کی نسبت کیا رائے ہے؟

ھلڈا - یہ تو تم جانتے ہو کہ مجھے سیر و تفریح کی کس قدر دھت ہے۔ افسوس تم یہ ذکر ہی چھیڑ کر کیوں میرے دل میں آگ لگاتے ہو۔

سیسل - اچھا اب تیار ہو جائیے ہم عنقریب چلینگے۔

ھلڈا - تو خیر میں آجکل سفر نہیں کر سکتی۔ معاف رکھیئے۔

سیسل - تو تم پھر کیا چاہتی ہو؟

ھلڈا - آپ کی نوازش۔ اور اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی۔

سیسل - پھر بھی بتاؤ تو سہی تم بگڑ کیوں گئیں۔

ھلڈا - میں تو یہی چاہتی ہوں کہ تم پھر ویسے غریب ہو جاؤ۔

سیسل - میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ واقعی امیر بننے کی مجھ میں بھی توفیق نہیں اس میں بہت جھگڑے ہیں۔ روپے کی خواہش اور ضرورت تو ہر شخص محسوس کرتا ہے لیکن جب روپیہ مل جائے تو اس کے استعمال اور انتظام کے لئے ہر شخص اہل نہیں ہوتا۔ جب سے یہ سنا ہے کہ میں تیس لاکھ کا مالک ہو گیا ہوں۔ میں کیا بتاؤں ہزار ہزار قسم کے افکار میری جان لئے لیتے ہیں۔ مگر اب کیا کریں۔ اب تو ہم مالک بن چکے۔ ہائے افسوس۔ اگر چچا مرحوم وصیت کرنے سے پہلے مجھ سے استمزاج کر لیتے تو میں انکا وارث ہونا ہرگز قبول نہ کرتا۔ مگر اب مجبور ہوں۔ انکی وصیت کا پاس اور اپنے چچا کی اطاعت اس امر کی مقتضی ہے کہ میں چار و ناچار طوعاً کرہاً یہ تیس لاکھ روپیہ اپنے مصرف میں لاؤں۔

ھلڈا - یہ باتیں تو میں جانتی نہیں۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ ہم مفلسی کی حالت میں اس سے بدرجہا خوش تھے اور اب ایک مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

(باقی .... نے لکھی سے)

سیسل۔ تمہیں اب میرے چچا کا ماتم اور سوگ یاد آیا ہے۔ خیر اچھے موقع پر خیال آگیا۔ بیشک روپیہ ملنے سے پیشتر ہی چاہئے تھا تاکہ روپیہ تو ہم پر حلال ہو جاتا۔

ہلڈا۔ ہیں آگ لگے تمہارے چچا کو۔ اس منحوس نے تیس لاکھ روپے دیکر ہمیں اس نوبت کو پہنچا دیا ہے۔

سیسل۔ پھر تم وہی باتیں کرنے لگیں۔

(اتنے میں گھنٹی کی آواز ان کے کان میں آئی)

ہلڈا۔ یہ کون ہے۔ میں جاکر دیکھتی ہوں۔

(ہلڈا جاتی ہے)

سیسل۔ آج کے بعد ہمارے پہلے دوستوں میں سے کوئی گھنٹی نہ بجائیگا۔ اور ہمیں اپنی ملاقات سے دق نہ کریگا۔ بس اب جسوقت یہاں سے ہم نکلے ہم الگ تھلگ مزے کرینگے۔ ہمیں اب کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔

(ہلڈا داخل ہوتی ہے)

ہلڈا۔ ایک چپڑاسی یہ چٹھی گرین فیلڈ کمپنی سے لایا ہے۔ میرے خیال میں اب تمہاری چچی مر گئی ہونگی۔ کہو اب کتنے کے وارث ہوئے۔ اس چٹھی کو کھولکر دیکھو تو سہی

سیسل۔ (خط کھولکر) پڑھنے لگتا ہے۔

جناب محترم بندہ

ہمارے مؤکل ... مطبع والوں نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ انکو آپ سے ۶۰۰ روپے بابت اُجرت چھپائی لینے ہیں۔ اگر آپ تین دن تک یہ روپیہ بذریعہ چک ہمارے پاس نہ بھیجینگے تو ہم کو اختیار ہوگا کہ ہم بذریعہ عدالت چارہ جوئی کرکے یہ رقم آپسے وصول کرلیں۔ حساب ملاحظہ فرمائیے۔

گرین فیلڈ کمپنی

دست۔

ہلڈا۔ کیا کوئی اور خط آیا؟

سیسل۔ نہیں ابھی تو اُس نے دھمکی دی ہے بلکہ ایک بڑا لطیف مذاق کیا ہے۔ گرین فیلڈ کمپنی واقعی خوب کاروبار کرتی ہے۔ اس میں کسی کی رو و رعایت نہیں ہوتی۔ اب خیال کیجیے اسی کمپنی کے پاس ہمارے تیس لاکھ روپیہ جمع ہیں اور یہی کمپنی ہم سے ۶۰۰ روپیہ طلب کرتی ہے۔ واقعی ایسا ہی ہونا بھی چاہئیے۔ جس وقت اُنہوں نے یہ خط لکھا ہوگا دل میں کیا کہتے ہونگے۔ کہ ابھی تو ہم نے اسکے تیس لاکھ روپے کی اسکو اطلاع کی ہے اور ابھی ہم ۶۰۰ روپیہ کا تقاضا کرتے ہیں۔

ہلڈا۔ ہاں مگر یہ ایک اور خط بھی تو ہے سیسل!

سیسل۔ لاؤ وہ بھی دیکھیں۔

جناب مکرم بندہ

بجائے اس چٹھی کے ہمارے محرر نے غلطی سے آپکو وہ خط بھیج دیا ہے جس میں تیس لاکھ روپے کے ملنے کی اطلاع ہے۔ وہ خط کسی اور صاحب کے لئے تھا اور آپ کے لئے یہ خط ہی جوابا بھیجتے ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ ہمیں اس اتفاقیہ غلطی کے لئے معاف فرمائینگے اور یقین ہے کہ آپ کو اس غلطی سے کوئی تکلیف نہ ہوئی ہوگی +

گرین فیلڈ کمپنی

ہلڈا۔ ہیں۔ غلطی؟ تو کیا آسٹریلیا میں تمہارا کوئی چچا نہ تھا۔

سیسل۔ نہیں ہلڈا اُس نے میرا دیوان ہی نہ خریدا ہوگا۔

ہلڈا۔ تو گویا اب تم تیس لاکھ کے مالک نہ رہے۔

سیسل۔ اب کہاں رہے اب تو میرے پاس صرف تین کتابیں اور تین سو روپیہ

ماہوار کی آمدنی ہی ہے۔ اُف کس قدر پریشانی ہوتی۔ بس اب تم میرے چچا کا بھی نام نہ لینا۔ مجھے اس سے کیا غرض۔

ہلڈا۔ ہاں ہاں سیسل! اب رنج نہ کرو۔ میں بہت خوش ہوں۔

سیسل۔ واہ تم خوش ہو۔ تیس لاکھ روپیہ ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا۔ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ ہلڈا اصل میں تمہارے ہی فضول جھگڑوں نے رنگ میں بھنگ ڈالدی۔

ہلڈا۔ اب کیا ہے۔ خیر سیسل! اگر تم واقعی امیر ہو جاتے اور مجھ کو وہ ڈریس نہ لیکے دیتے تو میں تمہارا قصور کبھی نہ معاف کرتی۔ ہماری محبت میں ضرور فرق آجاتا۔ اور یہ بات کبھی نہ بنتی۔

سیسل۔ کیا واقعی یہ بات ہے؟

ہلڈا۔ اب چونکہ تمہارے پاس روپیہ نہیں ہے اس لئے اب میں وہ پوشاک تم سے نہیں مانگتی۔

سیسل۔ ہاں۔ میری جان میں یقیناً لکھ پتی ہونے کے لئے نہیں بنایا گیا۔

ہلڈا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم پھر ویسے ہی ایک دوسرے کے چاہنے والے ہیں۔ خدا ایسی دولت ہمارے نصیب میں نہ کرے جو ہمارے تعلقات میں مخل ہو۔ ہمارے لئے افلاس ہزار درجے مبارک ہے۔ سچ یہ ہے کہ اگر بیوی اپنے خاوند سے تنگدستی اور افلاس میں محبت کرے تو وہ یقینی سچی محبت ہے۔ ورنہ امیروں سے محبت کون نہیں کرتا۔ وہ تو روپیہ دیکر انسان کو خرید لیتے ہیں۔

سیسل۔ ہمیں تو اپنی روکھی سوکھی پسند ہے۔ ہم غریب سہی بلا سے۔ مگر امیروں کی طرح آئے دن کے جھگڑوں میں تو نہیں پڑتے۔

ہلڈا۔ یہ تو خیر تیس لاکھ روپیہ تھا اگر تیس کروڑ کے بدلے بھی ہماری محبت کوئی ہم سے مانگے تو

میں ہرگز قبول نہ کروں۔ ہم جب ایک دوسرے کو پیار کر لیتے ہیں تو بس یہ سمجھو کہ دُنیا بھر کے غم غلط ہو جاتے ہیں اور طبیعت کو ایسی تسکین اور دل کو اطمینان ہوتا ہے کہ روپئے کی حرص کے پیدا ہونے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ امیر لوگ اس محبت کی قدر نہیں کرتے۔

سیسل۔ واقعی تم سچ کہتی ہو۔ ہم بہت خوش قسمت ہیں۔ کہ یہ نعمت غیر مترقبہ ہمیں میسّر ہے۔ اچھا اب تم یہ تو بتاؤ کہ تمہارے پاس اسوقت روپیہ کتنا ہو؟

ھلڈا۔ پچیس ہیں۔

سیسل۔ اچھا تو چلئے کھانے سے فارغ ہولیں اور پھر رات کو اس محلّے کو چھوڑ دیں۔ یہاں ہم کو قرضخواہ بہت ستانے لگے ہیں۔

(ماخوذ) اکرام۔

غزلِ آسی

عشق کا عشق محبت سے محبت مجھ کو — اس قدر ذوق بلا شوق مصیبت مجھ کو

آ بکے حسرتِ وصل و غمِ فرقت مجھ کو — اپنی ہستی سے کسی طرح ہو غفلت مجھ کو

وہ نہ بے باکیوں سے خوش نہ ہوسناکی سے — ہوگئے غیر کے اعمال نصیحت مجھ کو

ہوں گنہگار مگر حسرتِ دیدار بھی ہے — جلوہ تیرا ہو تو دوزخ بھی ہو جنت مجھ کو

میں بھی باطل میری ہستی بھی سراسر باطل — یہ سوجھاتی ہے انا الحق کی حقیقت مجھ کو

نورِ خورشید ستاروں کو مٹا دیتا ہے — تم ہو پہلو میں تو محفل بھی ہو خلوت مجھ کو

کوئے محبوب سے کوئی بھی نکل سکتا ہے — اپنے اوہام ہوئے وادیٔ غربت مجھ کو

کیا خبر تھی کہ انہیں کے ہیں کرشمے سارے — گلہ غیر کی ہے ان سے ندامت مجھ کو

عندلیب گل رخسار بھی سب جانتے ہیں — تیرے پردے نے کیا بار فضیحت مجھ کو

بے حجابی کبھی ممکن نہیں جب تک میں ہوں — خلل انداز ہوں کر دیجئے رخصت مجھ کو

اب تو دیدار دکھا دیجئے تقصیر معاف — ہوگیا وعدۂ فردا ہی قیامت مجھ کو

کیوں نہ ہوں خاک درِ دوست کر پھر خاک نہ ہوں — آسی اپنی بھی نہیں خاک محبت مجھ کو

یتیموں کی فریاد

یہ وہ دردناک نظم ہے جو ہمارے لطف فرما حضرت آغا شاعر صاحب قزلباش دہلوی نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے گذشتہ اجلاس میں پڑھی۔ جسوقت آغا صاحب نظم پڑھ رہے تھے اُسوقت ایک عجیب سناٹے کا عالم تھا اور سامعین نے نہایت توجہ اور دلچسپی سے اس نظم کو سنا۔ حاضرینِ جلسہ میں سے شاید ہی کوئی دل ایسا ہوگا جو متاثر نہ ہوا ہو۔ اس لگداز نظم میں جو درد اور تاثیر ہے اسکا احساس خود ناظرینِ مخزن کو ہو جائیگا۔

اِک دن اچانک شام کو میں اِک خرابے کے قریں — جا نکلا اپنی فکر میں مستغرق و اندوہگیں
رُک رُک کے پڑتے تھے قدم تھم تھم کے اُٹھتی تھی نظر — منہ تک رہی تھی اشک کا دامن سے پہلے آستیں
بوجھل طبیعت تھی بہت بھرتا چلا آتا تھا دل — میں پاؤں رکھتا تھا کہیں کمبخت پڑتا تھا کہیں
ناگاہ دو بھائی بہن بیٹھے ہوئے آئے نظر — گردِ یتیمی بر سر و آثارِ غربت بر جبیں
کپڑے پھٹے ناخن بڑھے اُلجھے ہوئے تھے سر کے بال — چہروں کی رنگت زرد تھی جس طرح ہلدی کی زمیں
آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے مظلوم صورت یاس کی — تقدیر جو چاہے دکھائے کہتے تھے یہ دو نازنیں
ماں باپ کا سایہ اُٹھا بچپن میں لاوارث ہوئے — اپنا نہیں کوئی رہا اب یا الٰہ العالمیں
ہم پر تو دُنیا تنگ ہے یارب کہاں جاکر رہیں — پڑ رہنے کو بھی رات کے کوئی ٹھکانا اب نہیں

ویرانہ ہے ڈر لگتا ہے جنگل بڑا سنسان ہے
کیڑے پتنگے سے یہاں گھبراتی اپنی جان ہے

بولی بہن بھائی نہ رو آتا نہیں تو غم نہ کھا — لے اوڑھنی میری بچھا دن بھر پھرا ہے لیٹ جا
آ بھیا میری گود میں! آ بھیا میری گود میں! — لے آکے سو جا گود میں آرام تو کر لے فدا
قربان جاؤں میں ترے بھائی بہت بھوکا ہے تو — ہمت ہے تو چل اُٹھ چلیں لے آئیں ٹکڑا بھیک کا

بستی یہاں سے پاس ہے پھر کیوں تجھے وسواس ہے — ہے سانس جب تک آس ہے گھبرا نہ میں تجھ پر فدا

مانا اندھیری رات ہے اپنا یہ کچا ساتھ ہے — سر پر خدا کی ذات ہے حامی ہے وہ ہر ایک کا

ٹھوکر لگے جو راہ میں انگلی پکڑ لینا مری — کہتے ہیں ہوتا ہے بہت تنکے کا بھی تو آسرا

شاید کہ مِل جائے کہیں اللہ کا بندہ کوئی — یہ آگ دوزخ کی بجھے اس آتما کی لے دعا

اولاد والے تو بہت ہوتے ہیں بھائی کیا کہوں — لیکن وہی ہے ایک دل جس دل میں ہو خوفِ خدا

شاید کسی انسان کی بھی شکل انسانوں میں ہو

شاید کوئی دھرماتما ہندو مسلمانوں میں ہو

لڑکے نے پہلے تو سُنا خاموش اس تقریر کو — پھر یوں تسلی دی بہن منہہ چوم کر ہمشیر کو

بھینا ترے اس پیار سے ماں باپ یاد آتے مجھے — لازم ہے میں پوجا کروں اماں کی اس تصویر کو

گو بھوک سے ہوں میں نڈھال لیکن ہے اسکا بھی خیال — زخمِ جگر سے میں بھلا کھینچوں گا کیونکر تیر کو

تیرِ ملامت کونسا؟ یہ بھیک اپنا مانگنا — مجھ سے نہ ہوگا اے بہن [illegible] میری تقریر کو

گو تم سے چھوٹا ہوں بہت لیکن بڑی یہ بات ہے — مانگے سے ہاتھ آئے جو [illegible]

جس نے ہمیں پیدا کیا منہہ چیر اسی پر ہے غذا — بدلے وہی تقدیر کو جس [illegible]

بہتر ہے اُسکا نام لیں اس سے ہی رو رو کر کہیں — پہنچائے وہی تو مہک [illegible] نالہ

وہ ہی ہماری آہ میں دیگا اثر پیاری بہن — شاید سنیں کچھ اہلِ دل [illegible]

ہم ننھے ننھے بے وطن دل کا کہا کہنے کو ہیں

جس سے کہ ٹکڑے ہو جگر وہ مدعا کہنے کو ہیں

ایمان والو چین سے بیٹھے ہوئے ہو اپنے گھر — ہے کیا ضرورت یہ تمہیں [illegible]

تم پیٹ بھر کر کھاتے ہو تم ٹھنڈا پانی پیتے ہو — ہم بھوکے پیاسے پھر رہے ہیں [illegible]

پہنو لباسِ فاخرہ اچھی سے ہو اچھی قبا — ہم کو تو بھی دیکھو ذرا چیتھڑا [illegible]

کلیجے کا داغ

زینہ نہ بامِ عرش کا اتنا بلند تھا
میری دُعا کو بابِ اجابت ہی بند تھا
تیرِ اجل کو آہ! نہ درماں پسند تھا
اچھا ہوا کسی سے نہ۔ وہ دردمند تھا

دھڑکن گئی نہ دل کی۔ نہ دردِ جگر گیا
بالیں سے نا امید تری چارہ گر گیا

وُہ آہ! تیری چاندسی صُورت کدھر گئی
آنکھوں کا نور۔ رُخ کی صباحت کدھر گئی
ہونٹوں کی لال لال وہ رنگت کدھر گئی
بچپن کے مُسکرانے کی عادت کدھر گئی

ہونٹوں پہ اب ہنسی ہے۔ نہ جُنبش زبان کو
کیا جانے کیا ہوا مری ننھی سی جان کو

چہرے سے آہ! یُوں ہو صباحت اُڑی ہُوئی
جیسے خزاں میں پھول سے نکہت اُڑی ہُوئی
دل سرد۔ جسم سے ہو حرارت اُڑی ہُوئی
رُخ سے گلاب کی سی ہو رنگت اُڑی ہُوئی

آنکھیں کنول سی ہیں۔ نہ وُہ چہرہ ہے پھول سا
لوگو! ہے آج کچھ مرا ننھا ملول سا

پنہاں اجل کا دستِ ستم آستیں میں ہے
مجھ کو خبر نہ تھی کہ یہ ظالم کمیں میں ہے
آنکھوں میں نور ہے۔ نہ صباحت جبیں میں ہے
قالب یہاں ہو۔ رُوح بہشت بریں میں ہے

زانو پہ سو گیا مرے سر رکھ کے آہ تو
کھولیگا آنکھ کب مرے نورِ نگاہ تو

گو مجھ سے اب نگاہ نہیں آشنا تری
مجھ کو مگر ہے آہ! وُہی مامتا تری

اگلی سی وہ اگرچہ نہیں ہے ادا تری　　اِس غم میں بھی شبیہ ہے تسکیں فزا تری
تو کوئی دم میں خاک کا پیوند ہی سہی
بوسے تو لے رہی ہوں میں لب بند ہی سہی

صبر و سکوں کا کر نہ سفینہ تباہ تو　　ماں کا سمجھ کے توڑ دلِ داد خواہ تو
بے نور آنکھ ہے مرے نورِ نگاہ تو　　یعنی ہے مجھ غریب کا روزِ سیاہ تو
میں نے سمجھ کے خاک کا پتلا زمین کو
حافظ خدا ترا۔ تجھے سونپا زمین کو

ایذا سے جانِ زار جو کاہش طلب رہی　　دن بھر پسر کی یاد میں میں مضطرب رہی
جب نصف شب گذر گئی۔ او نصف شب رہی　　دل میں نہ آہ! طاقتِ رنج و تعب رہی
نیند آگئی تو طرفہ تماشا نظر پڑا
اک کنج پُر فضا لبِ دریا نظر پڑا

پچھلے پہر کا وقت تھا۔ جاں بخش تھی ہوا　　اور میرے ساتھ تھا مرا ننھا ٹہل رہا
صورت تھی پیاری پیاری وہ معصوم دلربا　　اک پھول تھا گلاب کا گویا کھِلا ہوا
پھولوں کی بُو سے بادِ صبا عطر بیز تھی
سر پر شعاعِ نور کی اک جلوہ ریز تھی

چہرے پہ نور کی جو کرن تھی چمک رہی　　تھی گورے گورے گالوں پہ سرخی جھلک رہی
وقتِ خرامِ ناز کمر تھی لچک رہی　　شبنم اُدھر گلاب تھی رُخ پر چھڑک رہی
رُخ پر جو چاندنی نے اُجالا تھا کر دیا
مکھڑے کا اور حسن دوبالا تھا کر دیا

کہتا تھا مسکرا کے۔ مجھے یوں دکھا کے پھول　　کس رنگ کے یہ گل ہیں یہ ہیں کس ادا کے پھول

کلیاں گلاب کی ہیں۔ نہ یہ موتیا کے پھول
دلکش عجب ہیں اس چمنِ دلکشا کے پھول
دنیا کی ہو ہوا انہیں چھو بھی نہیں گئی
اڑ کر ہے انکی خلد سے بو بھی نہیں گئی

اس کنجِ دلنشیں کی ہے آب و ہوا پسند
دنیا کی اب نہیں مجھے اماں! ادا پسند
ہو جس کو خلد کا چمنِ دلکشا پسند
کانٹوں کو دہر کے وہ کرے آہ! کیا پسند
دنیا سے آہ! اب مجھے دلبستگی نہیں
میں شاد ہوں کہ مجھ کو غمِ خستگی نہیں

میں جانتا ہوں۔ ضبط کی عادت ہے کم تمہیں
برسوں رلائیگا مرے مرنے کا غم تمہیں
ڈھارس بندھاؤ دل کو عبث ہے الم تمہیں
رونا نہ اب مجھے۔ مرے سر کی قسم تمہیں
اشکوں سے میرے غم میں نہ آنکھوں کو تر کرو
دنیا میں کچھ دنوں خوش و ناخوش بسر کرو

(ماخوذ از انگریزی) سرور جہان آبادی

شاخِ بریدہ

اک روز گلستاں میں جو میرا گذر ہوا
لطفِ بہار و منظرِ بستاں تھا دلکشا
جادو بھرا تھا گل کا ادھر حسنِ جانفزا
بلبل ادھر ترانۂ الفت سے خوش نوا
سبزے کا فرش بادِ بہاری بچھا گئی
شبنم بھی موتیوں کا خزانہ لٹا گئی

کلیاں تھیں اک ادائے تبسم دکھا رہی
تھیں مسکرا کے بجلیاں گویا گرا رہی
بادِ صبا انہیں تھی کبھی گدگدا رہی
منھ چوم کر کبھی تھی گلے سے لگا رہی

شمشاد کے گلے کا کبھی ہار بن گئی
سنبل کے گیسوؤں کا کبھی تار بن گئی

شاخیں گلوں کی گاہ صبا تھی ہلا رہی
تھی گاہ طفل غنچہ کو جھولا جھلا رہی
مستانہ چال سے تھی کبھی لڑکھڑا رہی
انداز لغزشوں کے کبھی تھی دکھا رہی

سوسن کی ہمزباں تھی کبھی ہمکنار تھی
نسرین و نسترن کی کبھی رازدار تھی

سنبل کھڑی تھی زلف پریشاں کیے ہوئے
گیسو میں مشک نافہ کو پنہاں کیے ہوئے
شانوں پہ تار تار تھی پیچاں کیے ہوئے
گویا تھی قید سارا گلستاں کیے ہوئے

سو سو طرح کا پیچ تھا ایک ایک بال میں
سارا چمن اسیر تھا زلفوں کے جال میں

تھیں خندہ ہائے گل میں عجب جاں نوازیاں
نالوں میں بلبلوں کے نہاں جاں گدازیاں
پیچھے کے پیچ پیچ میں افسوں طرازیاں
نرگس کی چشم مست میں سو سحر سازیاں

کچھ کر رہی تھی غنچوں کو نرگس اشارتیں
آنکھوں سے تھیں ٹپک رہی اسکی شرارتیں

مرغانِ بوستاں بھی تھے بیتاب سر بسر
بیچین اڑ رہے تھے چمن میں ادھر ادھر
گویا تھے ڈھونڈتے وُہ کسی کو شجر شجر
قربان کر رہے تھے وُہ دل شاخ شاخ پر

نرگس پہ - نسترن پہ - گل و سبزہ زار پر
شمشاد پر - صنوبر و سرو و چنار پر

کلیاں گلاب کی ہیں۔ نہ یہ موتیا کے پھول دلکش عجب ہیں اس چمنِ دلکشا کے پھول
دنیا کی ہے ہوا انہیں چھو بھی نہیں گئی
اُڑ کر یہ انکی خلد سے بو بھی نہیں گئی

اس کنجِ دلنشیں کی ہے آب و ہوا پسند دنیا کی اب نہیں مجھے اماں! ادا پسند
ہو جس کو خلد کا چمنِ دلکشا پسند کانٹوں کو دہر کے وہ کرے آہ! کیا پسند
دنیا سے آہ! اب مجھے دل بستگی نہیں
میں شاد ہوں کہ مجھ کو غمِ خستگی نہیں

میں جانتا ہوں ضبط کی عادت ہے کم تمہیں برسوں رلائیگا مرے مرنے کا غم تمہیں
ٹھارس بندھا دو دل کو عبث ہے الم تمہیں رونا نہ اب مجھے مرے سر کی قسم تمہیں
اشکوں سے میرے غم میں نہ آنکھوں کو تر کرو
دنیا میں کچھ دنوں خوش و ناخوش بسر کرو

(ماخوذ از انگریزی) سرور جہان آبادی

شاخِ بریدہ

اک روز گلستاں میں جو میرا گذر ہوا لطفِ بہار و منظرِ بستاں تھا دلکشا
جادو بھرا خصائل کا ادھر حسنِ جانفزا بلبل ادھر ترانۂ الفت سے خوش نوا
سبزے کا فرش بادِ بہاری بچھا گئی
شبنم بھی موتیوں کا خزانہ لٹا گئی

کلیاں تھیں اک ادا سے تبسم دکھا رہی تھیں مسکرا کے بجلیاں گویا گرا رہی
بادِ صبا انہیں تھی کبھی گدگدا رہی منہ چوم کر کبھی تھی گلے سے لگا رہی
شمشاد کے گلے کا کبھی ہار بن گئی
سنبل کے گیسوؤں کا کبھی تار بن گئی

شاخیں گلوں کی گاہ صبا تھی ہلا رہی تھی گاہ طفلِ غنچہ کو جھولا جھلا رہی
مستانہ چال سے تھی کبھی لڑکھڑا رہی انداز لغزشوں کے کبھی تھی دکھا رہی
سوسن کی ہمزباں تھی کبھی ہمکنار تھی
نسرین و نسترن کی کبھی رازدار تھی

سنبل کھڑی تھی زلف پریشاں کیے ہوئے گیسو میں مشک نافہ کو پنہاں کیے ہوئے
شانوں پہ تار تار تھی پیچاں کیے ہوئے گویا تھی قید سارا گلستاں کیے ہوئے
سو سو طرح کا پیچ تھا ایک ایک بال میں
سارا چمن اسیر تھا زلفوں کے جال میں

تھیں خندہ ہائے گل میں عجب جاں نوازیاں نالوں میں بلبلوں کے نہاں جاں گدازیاں
پیچے کے پیچ پیچ میں افسوں طرازیاں نرگس کی چشمِ مست میں سو سحر سازیاں
کچھ کر رہی تھی غنچوں کو نرگس اشارتیں
آنکھوں سے تھیں ٹپک رہی اسکی شرارتیں

مرغانِ بوستاں بھی تھے بیتاب سربسر بیچین اڑ رہے تھے چمن میں ادھر ادھر
گویا تھے ڈھونڈتے وہ کسی کو شجر شجر قربان کر رہے تھے وہ دل شاخ شاخ پر
نرگس پہ نسترن پہ گل و سبزہ زار پر
شمشاد پر صنوبر و سرو و چنار پر

دھانی لباس پہنے عروسِ بہار تھی | زیب گلو کئے ہوئے پھولوں کے ہار تھی
ہر برگِ گل سے شانِ جمال آشکار تھی | جوبن کے اس اُبھار پہ جنت نثار تھی

شہرت بہارِ حُسن کی تھی آسمان پر
تعریف اُس کی مُرغ جہاں کی زبان پر

اِس بوستاں کی سیر میں مَیں بسکہ محو تھا | پیشِ نظر تھی گلشنِ فردوس کی فضا
اِک چیز پر قدم مرا ناگاہ جب پڑا | آئی صدا کہ "دیکھ تو او بندہ خدا"

"چلیے نہ آنکھ بند کئے یُوں غرور سے
اس گلستاں سے چل دیے لاکھوں حضور سے"

اس دردِ زا صدا نے مرا دل ہلا دیا | چٹکی سی لیکے خواب سے گویا جگا دیا
گلشن کا لُطفِ سیر و تماشا بھُلا دیا | پردا تھا بیخودی کا جو دل پر۔ اُٹھا دیا

میں نے کہا معاف مری کیجیے خطا
ہیں کون آپ صاف مجھے دیجیے بتا؟

بولی کہ۔ حال پُوچھتے ہو عاجزوں سے کیا | تم کو غرض ہے بیکسوں اور دل جلوں سے کیا
قصہ سُنوگے درد کا بدقسمتوں سے کیا | کیونکر کہیں سلوک ہُوا غمزدوں سے کیا

کہنے کی تاب مجھ میں نہ سننے کی آپ میں
مُرغِ چمن کا نغمہ نہیں اس الاپ میں

پھر سا کس طرح دلِ تفتہ بتائیے | کیونکر زباں تک آتشِ سینہ کو لائیے
قصہ جگر کے سوز کا کیونکر سُنائیے | جور و جفائے چرخ کہاں تک بتائیے

مَیں دل ہُوں چشمِ تر ہوں کہ خونِ چکیدہ ہوں
"جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں"[۱]

---

[۱] خواجہ میر درد ۱۲

دل کا۔ جگر کا۔ پہلو کا۔ سینے کا۔ جان کا دردِ دروں سناؤں میں کس کس مکان کا
بیدرد۔ درد۔ مجھ میں ہے سارے جہان کا کیا کچھ بیاں کروں میں ستم آسمان کا

"تُو نے بلبلِ چمن زگلِ نودمیدہ ہوں
میں موسمِ بہار میں شاخِ بُریدہ ہوں"

فصلِ بہار کو کبھی مجھ پر بھی ناز تھا مجھ سے نسیمِ صبح کا راز و نیاز تھا
عارض کا میرے سبزہ کبھی جاں نواز تھا پنہاں مرے جمال میں قدرت کا راز تھا

میں بھی نشانِ رحمتِ پروردگار تھی
مجھ سے بھی شانِ حُسنِ ازل آشکار تھی

گجرے مرے اُتار جو لیتی کبھی خزاں پہناتی پھر بہار نئی اور پہنچیاں
پاؤں میں میرے رہتا تھا آبِ رواں رواں سر پر تھا میرے ابرِ بہاری کا سائباں

پھولوں سے جب بہار سجاتی مری جبیں
تاروں میں پھر نہ ہوتی تھی کیا کیا چناں چنیں

جوبن سے میرے بزمِ گلستاں تھی زرنگار میرے گلوں سے پُر تھا کبھی دامنِ بہار
میرے بھی پھول تھے کبھی نازک گلوں کے ہار ممنوں کبھی مرے تھے حسینانِ گلعذار

فصلِ بہار کی میں دلارام تھی کبھی
باغِ جہاں میں۔ میں بھی تو خوش کام تھی کبھی

القصہ گلستاں میں تھی میں بھی ہری بھری غنچوں۔ گلوں سے رہتی تھی جھولی مری بھری
انداز میں مرے بھی تھا اعجازِ دلبری تھی خوش نصیب میں بھی تہِ چرخِ چنبری

بے رحم باغبان نے اب خارزار میں
پھینکا ہے مجھ کو کاٹ کے فصلِ بہار میں

حالِ زبوں میں اپنا کروں ہائے کیا بیاں — عبرت فزا ہے میری مصیبت کی داستاں
گلپوش جس کا صحن چمن میں تھا آشیاں — اب خار و خس میں اسکی ملیں ہائے ہڈیاں

اس ظلم پر بھی جی نہ بھرا باغبان کا
گلشن سے استخواں مری گلخن کو لے چلا

زیبا نہیں غرور مبادک جمال کا — کیجے نہ اعتبار بہارِ کمال کا
کھٹکا ہے اس چمن کو خزاں کے زوال کا — ہر گل کے زیرِ پہلو ہے کانٹا ملال کا

رنگِ زمانہ گاہ چنیں است و گہ چناں
در باغِ عمر گاہ بہار است و گہ خزاں

نورتن

بازار یہاں گرم سودیشی[1] کا رہے — ۱ — سودا جو رہے سر میں تو خویشی کا رہے
گائیں بھی جو ہندی تو اب اپنی گائیں — جو راگ رہے ساز میں۔ دیسی کا رہے

جو دیس کا خادم رہے انسان ہے وہ — ۲ — بن جائے جو ہمدردی جان ہے وہ
اٹھ جائے جو اپنوں کی بھلائی کے لئے — وہ جان نہیں ملک کا جانان ہے وہ

ہو جوش جسے قوم کی ہمدردی کا — ۳ — ہے وصف اسی شخص کی پامردی کا
جو چھت کی طرح عام پہ سایہ رکھے — گرمی کا اسے ڈر ہے نہ تو سردی کا

حکمت کے طلبگار رہو صنعت سیکھو — ۴ — طالب رہو حرفت کے۔ تجارت سیکھو
گر جسمِ ترقی کی بقا ہو منظور — ان چار عناصر کی حفاظت سیکھو

جو بار بھلائی کا اٹھا لیتے ہیں — ۵ — وہ خاک کو اکسیر بنا لیتے ہیں

[1] سودیشی سے مراد وہ ملکی بھلائی … [illegible]

یں جو مرے کی طرح آ طالب — آنکھوں سے انہیں روگ لگا لیتے ہیں

اک تن سے کہاں ملک بنا کرتا ہے   ۶   سو جسم ہوں تب نفع ہوا کرتا ہے

تنکے سے صفائی نہیں ہوتی طالب — جاروب سے گھر پاک ہوا کرتا ہے

دھیان اپنی غرض کا ہمیں سو جان سے ہو   ۷   آرائشِ تن شوق سے ہو شان سے ہو

کچھ قوم کی حالت نہ سنوارے کوئی — صد حیف کہ یہ کام نہ انسان سے ہو

جس ملک کے ہو اُس کو بگاڑو نہ کبھی   ۸   جس ڈال پہ بیٹھو اُسے کاٹو نہ کبھی

رہنا سیکھو دیا سلائی کی طرح — جس گھر میں رہو اُس کو جلاؤ نہ کبھی

تم دین کے جھگڑے نہ نکالو پہلے   ۹   دُنیا کو مگر اپنی سنبھالو پہلے

مسجد میں دیا جا کے جلانا پیچھے — اپنے گھر میں دیا جلا لو پہلے

(طالب بنارسی از بمبئی)

کبھی کی یاد

گئے وہ دن کہ مجھ کو روز و شب آرام رہتا تھا — یہی آرام تھا اک کام جس سے کام رہتا تھا

مری تصویر سے ظاہر تھی اک صورت مسرت کی — مسرت صاف تھی تصویر گویا میری صورت کی

مجھے مسرور رکھتا تھا خیالِ خوابِ روحانی

نسیم آرزو کرتی تھی کیا کیا گوہر افشانی

تماشائی تجلّی تھا زبس مدِ نظر مجھ کو — جمالِ یار کا آئینہ تھا دیوار و در مجھ کو

فروغِ دیدۂ بینش مری نظروں میں پنہاں تھا — نظارہ ماہِ کنعاں کا مرا خوابِ پریشاں تھا

مے و ساقی کی پروا کیا کرے آئینِ مشتاقی — خیالِ یار تھا مے اور ہوائے یار تھی ساقی

شرابِ بیخودی چلتی تھی ہر دم میری محفل میں — اُٹھاتا تھا قیامت اشتیاقِ آشنا دل میں

آپ واقعی اسوقت تک

اندازہ نہیں کر سکتے کہ انتخاب مخزن میں کیا خوبیاں ہونگی۔ مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ اس انتخاب میں راتیں کالی ہوئی ہیں اس انتخاب میں دن بیتے ہیں اور اس انتخاب کو مخزن کی گذشتہ ۹ جلدوں میں سے عطر کی سوح کی طرح کھینچکر کتاب کی صورت میں دس نہیں بلکہ وہ ڈھائی سو صفحے سنکے ہیں۔ یہ نادر کتاب ان یگانہ روزگار مشہور اہل قلم اور اعلےٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مغربی و مشرقی خیالات کا لب لباب ہے اور ہر مذاق کے موافق مضامین منتخب کئے گئے ہیں۔

انتخاب مخزن

میں انجمن اردو کے اراکین کی ولایت کی چھپی ہوئی تصویریں کتاب کی خوبی کو اور بھی دو بالا کرتی ہیں۔ اور یہہ وجہ اس انمول کتاب کی قیمت عہ زیادہ نہیں ہے محض توسیع اشاعت کی خاطر ہم یہ کتاب ۸ ربیں دیتے ہیں +

اب یہ آخری موقع ہے اگر اس کو آپنے کھو دیا تو پھر نہ افسوس کیجئے۔ کیونکہ یہ کتاب ایسی نہیں کہ آپ کسی دوست کے ہاتھ میں دیکھیں اور آپ کے دل میں شوق نہ پیدا ہو۔ اس لئے آپکو چاہئے کہ اپنے کسی دوست کے نام مخزن جاری کرا کے ۸ ربیں اس کو دلائے اور ایک کاپی خود بلا قیمت لیجئے۔

مینجر مخزن

نوٹ:۔ انتخاب مخزن اب قریباً تیار ہے تھوڑی سی کسر باقی ہے امید ہے کہ عنقریب بالکل تیار ہو جائیگا۔ ان شائقین کو گھبرانے کی ضرورت نہیں جو پہلے درخواستیں بھیج چکے ہیں۔

ج

عرق ماء اللحم انگوری

اور

درازی عمر

یہ امر تازہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ دو بزرگ ہم عمر عہدہ دار جو تعلقات حسنہ سے ایک ہی ضلع میں مقرر تھے ایک ہی مرض میں مبتلا تھے ضعف دماغ اور تاریکی چشم سر کا گھومنا چکرانا تھوڑی کام سے دل گھبرانا جب روز دو چار گھنٹے بیٹھ کر کام کرنا پڑے سر درد ہو جانا بھوک کا بند ہو جانا ہاتھ پاؤں کا روشن لگنا اور کبھی گھر میں تحلیل کا موقع ملے تو صبح کو کوفت اعضا شکنی معلوم ہونا۔ چارپائی سے اٹھنے کو دل نہ چاہنا ایک صاحب نے عرق ماء اللحم کا استعمال شروع کیا اور دوسرے صاحب نے مختلف معالج ڈاکٹروں حکیموں کا گو تصدیق ہر چند دنوں بعد عرق پینے والے کا رنگ رو سرخ ہو گیا اور سندو علی چہرہ دور ہو کر گال جو چھکے ہوئے تھے پر ہو کر رنگ چمکنے لگا تو دوسرے مختلف ادویہ کے کھانے والے کے دوست نے بڑی تعجب سے پوچھا یار کیا بات ہے تم تو چار بجے کے بعد سات بجے تک کچہری میں کام کرتے رہتے ہو صبح دم دیکھو سویرے ہی اٹھ کر پھر ہوا خوری کو تیار رہتے ماجرا کیا ہے۔ اس نے کہا بات یہ ہے کہ میں **عرق ماء اللحم انگوری دوآتشہ** ساختہ حکیم غلام نبی لاہوری پیا کرتا ہوں چنانچہ وہ سن کر نہ رہ سکے جھٹ تار دیا عرق بھیجدو +

اب اس ڈپٹی کلکٹر کا سارٹیفکٹ ملاحظہ کیجئے جس نے سول سرجنوں اور معزز دوسرے حکما کا علاج کیا اور ناکامیاب رہا۔ دیکھئے وہ کیا کہتا ہے۔ آدھ آنہ کا ٹکٹ بھیجدیجئے۔ سارٹیفکٹ صحت یافتہ اصحاب کے بھیجدونگا قیمت فی بوتل عہ تین بوتل سے چھ بوتل عہ فی درجن عہ بذریعہ ریل منگانے میں محصول کی کفایت ہوگی۔ ملیریا سٹیشن مولانا صاف لکھیں نہ بذریعہ ڈاک منگوانے میں محصول ڈاک پیشگی آنا ضروری ہے

پتہ یہ۔ حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکما لاہور موچی دروازہ داعوان منزل

عرضکہ آپ نے آپ کو کسی مصرف کا نہیں رکھا تو ایک لائق تجربہ کار کا بتایا ہوا مرکب یعنی ڈاکٹر میجر ہاڈروئیل الکسیر اس مرض کو جڑ سے کھو دیتا ہے کچھ پروا کی بات نہیں خواہ مرض کیسا ہی شدید ہے جونہی اس اعجاز نما دوا کو ایک بار لگایا اور اس نے فوراً اکسیر جیسا اثر دکھلایا وزن گھٹنا شروع ہوا قیمت فی بوتل ایک عہ روپیہ علاوہ محصول ڈاک +

کمزور مضبوط ہو سکتے ہیں

یہ فقرہ خاصکر ان لوگوں کو مخاطب کر کے لکھا جاتا ہے جو کمزوری کا ہر طرح سے علاج کر چکے ہیں۔ سیاح جنہوں نے کوشش کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ اگر ناظرین میں سے کسی نے اپنے تئیں لا یوس العلاج تصور کر لیا ہے تو سخت غلطی کی ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ غلطی ہوگی اگر وہ گذشتہ کوششوں کی ناکامیاب ہونے پر اب بھی انہی ادویہ مشہورہ کی طرف متوجہ ہوں انکا نتیجہ دیکھ چکے ہیں۔ آجکل آزمودہ ہے۔ بہل سہت ڈاکٹر میجر کے ویٹلین کے استعمال سے زائل شدہ طاقت بحال ہوتی ہیں اور ... طور سے شامل کی گئی ہیں ہمارے تجربہ میں کسی قسم کی کمزوری ہو اس سے دور ہو جاتی ہے

رسالہ تحفۂ میجر کو پڑھو۔ تم خود قائل ہو جاؤ گے +

قیمت فی بوتل (ملے) علاوہ محصول ڈاک۔

تمام دنیا میں جسقدر ادویہ صفائی خون کے واسطے فروخت ہو رہی ہیں ان سب سے ڈاکٹر میجر صاحب کا سارسا پریلا کی کری بہت زیادہ ہے اس سارسا پریلا میں ایک نئی ترکیب سے بجلی کی حرارت آمیز کی گئی ہے تمام قسم کے گھاؤ زخم اور اسفل جن سے جلد بدنما ہو جاتی ہے جسم پر بدنما داغ کنٹھ مالا پھوڑے پھنسیاں پر گنٹھ اسکے استعمال سے جلتے رہتے ہیں۔ قیمت عہ فی بوتل +

یہ دوا کارخانہ مسرس ڈبلیو میجر اینڈ کو کلکتہ میں تیار ہوتی ہے کل اور خوردہ فروش ایجنٹ ایم رکت اینڈ کو دہلی سے طلب کرو۔

پنجاب کے دیسی دواخانہ کی مجرب ادویات
آنکھوں کا انجن
وغیرہ کے لیئے از حد مفید ہے۔
قیمت فی شیشی
منہ کے آبلے دور ہو جاتے ہیں
اس دوائی کو صرف دو دفعہ آبلوں پر
لگانے سے آبلے دور ہو جاتے
ہیں۔ قیمت فی ڈبیہ
صرف چار آنہ
(۴)
مفرح مقوی دماغ جن لوگوں کے دماغ بوجہ
کثرت دماغی کام
کمزور ہو گئے ہوں یا جن لوگوں کو کوئی
بات فوراً بھول جاتی یا جنکو
دماغی کام بہت پڑتا ہے
ان کے لیئے از حد
مفید ہے
عرق مسیحا
یعنے عرق مصفی خون دافع فساد خون
ایک لایق و فایق حکیم حاذق کی مجربات
کا نسخہ ہے جو اپنے زمانہ میں لقمان۔ ارسطو سے
زیادہ مانا جاتا تھا اسمیں وہ اجزا شامل ہیں جو خون سے
زہریلے مادے کو دور کرکے خون صالح پیدا کرتے ہیں
قیمت فی شیشی ایک روپیہ چار آنے
۱ روپیہ ۴ آنہ
تاپ تلی کی مجرب دوائی
اس کی استعمال سے برسوں
کی بڑھی ہوئی تلی دور ہو کر
چہرہ کا رنگ سرخ اور تندرستی
مضبوط و توانا ہو جاتا ہے
قیمت صرف
بارہ آنے۔
۱۲
دوائی دافعہ پاکہ
گرمی کے موسم میں
اکثر آم و خربوزے وغیرہ
کا استعمال و دیگر اندرونی
خرابیوں سے
پھنسیاں وغیرہ
دوائی دافعہ خارش
خارش خشک ہو یا تر
اسکے استعمال سے فوراً دور ہو جاتی ہے
اور بدن بالکل صاف نکل آتا ہے
نادر گولیاں
دوائی دافعہ دمہ
اسکے استعمال سے
خواہ کیسا ہی پرانا دمہ کیوں نہ ہو
دور ہو جاتا ہے۔ بچوں بوڑھوں غرض یہ کہ
ہر عمر میں مفید ہے۔ قیمت فی ڈبیہ
المشتہر ٹھاکر داس منیجر بی ڈی اینڈ کو لاہور

ممیرے کا سرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل اگزامینر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسروں نامور ڈاکٹروں والیان ریاست اور ولائیت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ یورپین ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ یہ سرمہ امراض ذیل کیلئے اکسیر ہے ضعف بصارت تاریکی چشم ۔ دھند ۔ جالا پڑوال ۔ غبار ۔ سبل سرخی پھولا ابتدائی موتیا بند ۔ پانی بہنا خارش وغیرہ معزز ڈاکٹر اور حکیم بجائے اور ادویہ کے آنکھ کے مریضوں پر اب اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں چند روز کے استعمال سے بینائی بہت بڑھ جاتی ہے اور عینک کے استعمال کرنیکی حاجت نہیں رہتی ۔ بچے سے لیکر بوڑھے تک کو یہ سرمہ یکساں مفید ہے قیمت اصلی کم رکھی ہے کہ عام و خاص اس سرمہ سے فائدہ اٹھا سکیں قیمت فی نزد جو سال بھر کیلئے کافی ہے مبلغ عہ ممیرے کا سرمہ سفید اعلےٰ قسم فی تولہ مبلغ ۱۰ روپیہ ہے خالص ممیرہ فی ماشہ عہ ۔ مصری سرمہ فی تولہ ۳ خرچ ڈاک بذمہ خریدار ۔

المشتہر پروفیسر میا سنگھ اہلووالیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور

اس سے بڑھ کر اور کیا معتبر شہادت ہو سکتی ہے

(۱) میں نے ممیرے کا سرمہ جو سردار میا سنگھ اہلووالیہ نے تیار کیا ہے ان لوگوں پر کہ جنکی آنکھیں بہت کمزور اور بیمار تھیں استعمال کرکے دیکھا مفید پایا میری رائے میں خصوصاً ان مریضوں کے واسطے جنکی آنکھیں کمزور ہیں یا جنکی آنکھوں سے پانی جاری رہتا ہے اور دھند وغیرہ نظر ہو یہ سرمہ نہایت ہی مفید ہے ۔ راقم ۔ ڈاکٹر برج لال صاحب رائے بہادر ایل ایم ایس اسسٹنٹ سرجن پروفیسر میڈیکل کالج لاہور آنریری سرجن جنرل ہند ۔

(۲) میں اس امر کی بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ میں نے ممیرے کا سرمہ جو کہ سردار میا سنگھ اہلووالیہ تیار کیا ہے اپنے زیر علاج کئی ایک قسم کے مریضوں پر استعمال کیا میری رائے میں بینائی قائم رکھنے اور آنکھوں کی بیماریوں سے بچنے کیلئے ممیرے کے سرمہ کا استعمال بہت مفید ہے ۔ راقم ۔ خان بہادر ڈاکٹر امیر شاہ ایل ایم ایس اسسٹنٹ سرجن پروفیسر میڈیکل کالج لاہور پنجاب ۔

پانچ ہزار روپے انعام :۔ اگر کوئی شخص ممیرے کے سرمہ کی سندات جعلی ثابت کرے تو اسکو مبلغ پانچ ہزار روپیہ کا انعام دیا جائیگا جو لاہور کی پنجاب بنک میں اسی مطلب کیلئے پہلے سے داخل کیا گیا ہے ۔

مخزن

گھر سے نکل کے دیکھو

"سفر وسیلۂ ظفر ہے" - یہ مقولہ اگلے زمانے میں بھی سچ تھا - اور آج بھی سچ ہے - بلکہ پہلے کم تھا - اب زیادہ - پہلے افراد پر عائد ہوتا تھا - اب اقوام پہ حاوی - ہے کسی ترقی کرتی ہوئی قوم کا نام لو - جو اس کے فوائد سے بے خبر ہو - دُنیا کی موجودہ تجارت کا فروغ اِسی اصُول پر مبنی ہے - جرمنی آج کل صنعت و حرفت کی ترقی میں اوّل درجے پر شمار کیا جاتا ہے - کیا اُس صنعت و حرفت کا مدار محض اہلِ جرمنی کی قدردانی پر ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اہلِ ملک بھی اپنے مال سے بڑھ کر کسی کے مال کو نہیں سمجھتے - دُوسرے ملکوں کی بنی ہوئی چیزیں اگر جرمنی میں راہ پانے کی کوشش کریں تو وہاں کی حکومت اُن اشیاء پر بھاری محصُول لگاتی ہے - تاکہ مُلکی اشیاء کا مقابلہ نہ کر سکیں - مگر یہ وہاں کی صنعتی ترقی کا ایک جُزو ہے - اور شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جزوِ قلیل - جُزوِ اعظم بیرونی تجارت پر منحصر ہے - دُنیا کا کونسا گوشہ ہے جہاں جرمن ساخت کا مال نہیں پہنچتا - چین میں اس کی کھپت ہے - رُوم میں اس کی قدر ہے - افریقہ کی منڈیاں وُہ گھیرے ہوئے ہے - اور ہندوستان کے بازاروں میں وُہ انگریزی ساخت کی چیزوں سے بڑھ کر بکتا ہے - یہاں تک کہ خود انگلستان با وصف

مذہب سکھانے نکلو - ہر ہر بہانے نکلو
گھر سے نکل کے دیکھو - ہندوستان والو

غرض نکلو تو سہی - مگر ایک شرط ملحوظ رہے - ایسی طرح گھر سے نہ نکلو کہ نہ گھر کے رہو نہ گھاٹ کے - بلکہ سامان کے ساتھ - جس سے اپنی عزت بڑھے اور ملک کی شان - ایسا نہ ہو کہ جو بالکل بے زر ہیں - وہ بغیر مآلِ کار سوچے وطن کو چھوڑ دیں - تجارت والے سرمایہ کا بندوبست کر کے نکلیں - تعلیم کے شائق پہلے گھر سے خوب پڑھ کر نکلیں - زراعت کے لئے جائیں تو خود اس فن سے واقف ہوں اور واقفکار آدمیوں کو ساتھ لے جائیں صنعت والے اس قابل ہوں کہ چار باتیں کسی سے سیکھیں تو چار اس کو سکھا بھی سکیں - جس ملک میں جائیں اس کی زبان پہلے حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اس کے اوضاع و اطوار سے واقفیت بہم پہنچا لیں - وہاں دن بسر کریں تو اس طرح کہ معلوم ہو کہ نہ صرف اپنی بلکہ اپنے ابنائے وطن کی عزت کا ہر وقت پاس ہے - اگر بڑھیں اور ان احتیاطوں کے ساتھ بڑھیں - تو کوئی دن میں وہ کامیابیاں جو اب اوروں کے حصے پر ہیں - ہمارے احاطہ دسترس میں ہوں - اور یہ جو ناکامیوں کی شکایت اب ہے - اسکا خاتمہ ہو جائے - لندن میں ہزارہا یہودی روس سے آتے ہیں اور دنوں میں کاروباری بن جاتے ہیں - چند سال کے بعد انگریزوں کے سے حقوق حاصل کرتے ہیں اور انکی اولاد ہر اعتبار سے انگریز کا حکم رکھتی ہے - فرانسیسی جرمنی ارمنی یونانی - اطالیہ کے باشندے ہسپانیہ کے باشندے - آسٹریا کے رہنے والے - روس کے ساکن - غرض ہر ملک کے قائم مقام انگلستان کے بڑے شہروں میں روزی کما رہے ہیں - اور محروم ہیں تو ہم جنکا اتفاق انگلستان پر ہوا اور جن سے انگلستان کو بیشمار نفع پہنچتا رہتا ہے - یہی حال کم و بیش سلطنت برطانیہ کے دیگر حصص اور امریکہ وغیرہ میں ہے - اور جوان حالات کیفیت کو ہم بچشم خود دیکھتے ہیں - دل گرفتہ ہے اور یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ ہمارے ہموطن بھی نکل پڑیں اور اس خوان یغما میں شریک ہوں - ۵

سخن درست بگویم نمے توانم دید   کہ مے خورند حریفان و من نظارہ کنم

(عبد القادر)

مکتوباتِ آزاد

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

اس سلسلۂ خط و کتابت کی دلچسپی کے لئے تو مولینا آزاد کا نام ہی کافی تھا۔ مگر اس میں مزید دلچسپی اس بات سے پیدا ہو گئی ہے کہ ان خطوط سے۔ گو یہ تعداد میں تھوڑے سے ہیں۔ اُن کے حالاتِ زندگی پر معقول روشنی پڑتی ہے اور انکی تصانیف کے متعلق کئی ضروری واقعات سے اطلاع ہوتی ہے۔ مثلاً آج جو خط درج کئے جاتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دربارِ اکبری کے ساتھ اکبر اور اس کے مشہور اُمرا کی تصاویر کا ایک مرقع چھاپنے کا ارادہ تھا۔ جس سے مولانا کی علالت نے ہم کو محروم کر دیا۔ یہ تصویریں مولوی صاحب نے نہایت تلاش سے بہم پہنچائی تھیں۔ اور یقیناً اگر کتاب کے ساتھ چھپ سکتیں تو کتاب کا لطف دوبالا ہو جاتا۔ ان خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو اپنا شغلِ تصانیف کتنا پیارا تھا اور وہ اس کے مقابلے میں کسی عروج یا فائدے کو ہیچ سمجھتے تھے۔ ہائے۔ اگر زمانہ ایسے قابل مصنف کو کوئی دن اور کام کرنے دیتا اور انکی عینِ حیات میں ملک کو انکی خدمات سے محروم نہ کر دیتا تو اب تک اُن کا قلمِ جادو رقم کیا کیا گلکاریاں کرتا۔

غالی جناب من-

تسلیم۔ آپ کو یاد نہیں میں نے کیا عرض کیا تھا۔ یعنی اُس دن میں کالج میں جا کر بیٹھا ہی تھا۔ کہ دو طالبعلموں نے آکر اس حادثۂ ناگہانی کی خبر دی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور دل پر صدمہ ہوا۔ وہ متحیر ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ اور اس معاملہ میں تقریریں معمولی کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔ اس وقت دو باتوں کا فکر کرنا چاہئے۔ ایک یہ کہ اُن کے محامد و اوصاف اس طرح بیان کرنے چاہئیں جس سے پبلک اور گورنمنٹ کے

دل پر اُن کے حقوق کی یاد کے نقوش تازہ ہوں۔ دُوسرے یہ کہ اُن کے لڑکوں کے ساتھ حقوق مذکورہ مدنظر ہیں۔ دونو باتوں کے ضمن میں کوئی ایسی بات بھی جس سے اُن کا نام روشن ہوکر قائم رہے۔ اور مرثیہ خوانی اور تاریخیں لکھنی جو کہ شیوۂ قدیم ایشیا کا ہے تو مجھے پسند نہیں۔ اب اس کا زمانہ گذر گیا۔ انہوں نے کہا۔ پھر یہ کیونکر ہو۔ میں نے کہا مجھ سے اَور کچھ نہیں ہوسکتا۔ نہ میں کوئی قابل ہُوں۔ اِتنا ہے کہ دربار اکبری درست کر رہا ہوں۔ یہ ان کے نام پر کردونگا۔ دونوں خوش ہو گئے۔ اور کہا کہ ضرور کیجئے یہ عمارت عظیم الشان اُن کے نام پر یادگار رہوگی۔ جو کبھی منہدم نہ ہوگی۔ میں نے کہا بلکہ دو تین اَور بھی۔

اب آپ کی خدمت میں عرض یہ ہے کہ دربار مذکور کو اگرچہ طبع نیرنگ خیال اور آب حیات کے سبب سے آج کل ملتوی کر دیا ہے۔ مگر تمام مسودے پہلو میں دھرے ہیں۔ یہ چھپائی چھ مہینے کا کام تھا جسے میں نے ڈیڑھ مہینے میں کیا۔ انشاء اللہ دس دن حد ایک مہینے کا کام اور ہے۔ اس سے فارغ ہوں تو پھر اُسے سنبھالتا ہوں خدا وند دولی اسداللہ الغالب سرانجام کو حد انجام پر پہنچانیوالے ہیں۔ مگر ضرورت طلب یہ نکتہ ہے کہ آیا یہی ڈڈیکشن کا مقرری خاکہ رنگ بھر کر سجا دوں۔ یا اُسے موقوف رکھ کر یہ لکھوں کہ ایسے شخص کے حادثہ جانکاہ پر عالم نے نالہ وزاری کے معمولی حق ادا کئے۔ اور یادگار کے لئے تاریخیں و نظمیں لکھیں۔ فقیر آزاد سے اَور کچھ نہ ہوسکا۔ یہ کتاب اُن کے نام پر لکھنا ہے کہ ان دنوں زیر قلم تھی۔ ع چہ کند بے نوا ہمیں دارد۔

مزا تو اس کا جب تھا کر خود لیکر جاتا اور بعض مقامات اس کے اپنی زبان سے اُن کے سامنے پڑھتا۔ اور دیکھتا کہ کس کس مقام پر وُہ کیا فرماتے۔ ہائے سرسالار جنگ سارے ارمان دل کے دل میں رہتے۔ ہائے سرسالار جنگ۔

مولے اسداللہ الغالب حاضر و ناظر ہیں کہ پھر آنسو آنکھوں میں بھر آئے۔ آپ سے کیا

اپنا حال کہوں - میرا دل کچھ آذردہ ہے -

بہرحال آپ مطمئن رہیں - انشاء اللہ جلد ختم کرتا ہوں - کلکتہ تک سے بمبئی مدراس تک سے برابر درخواستیں آ رہی ہیں اور گھر میں کچھ بھی نہیں -

پرسوں اتوار کو یہاں ایک بڑا جلسہ تھا - لاہور و امرتسر کے دولت پرست جمع ہوئے تھے کہ کپڑے کی کل پنجاب میں جاری ہو - وہاں کوئی بولا کہ آزاد کہاں ہے اسے بھی تو پوچھو - وہیں سے کوئی بولا کہ اس نے کمیٹیوں کو بالکل استعفا دے دیا ہے وہ تو اب تصنیفات میں غرق رہتا ہے - کسی نے یہ بھی کہا کہ آج کل وہ دربار اکبری لکھ رہا ہے مگر اکیلا ہے - کوئی رفیق اور مددگار نہیں - کئی شخصوں نے کہا کہ پھر کس شخص کی مدد چاہتا ہے - جو ہم سے ہو سکتی ہے ہم بھی کریں - میں در ماندہ تائید و تدبیر کیا کہوں - کہ میرا کام سوا خدا و مولیٰ کے مدد پذیر نہیں - یا علی مدد - ۴ بجے ہیں - صبح قریب ہے - وقت تو قبول کا ہے اگر سائل کی آواز حضور تک پہنچ جائے -

فقیر آزاد

۲۰- مارچ ۸۳ء

ساعت ۴ - قریب صبح

عجب تماشا ہے - آفرینش کا ضمیر تو یہ اور تصنیفات کے مضامین دیکھ کر . . . .

نیچری کہتے ہیں - ہاں ہاں نیچری ہوں - مگر علی کا نیچری ہوں ؎

من نمی گویم ویکن از تو چیزے دیدہ ام   آنکہ می گوید خدا ہستی یا امیر المومنین

جنابِ من -   ۸- اپریل ۸۳ء

تسلیم - عجب ہجومِ محنت میں مبتلا ہوں - الحمد للہ کہ ۱۰ - ۱۲ دن کا کام رہ گیا ہے اور یہ سخت تر وقت ہے - سوا مہینے سے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوں -

میری حالت ایسی ہوگئی ہے کہ ہر شخص پوچھتا ہے کہ تم کچھ بیمار تھے۔ نعوذ باللہ۔ غالباً میں نے آپکو نہیں لکھا۔ ایک مہینے سے زیادہ ہوا کہ جموں سے ایک دوست کا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ مہاراجہ صاحب ایک تاریخ کی کتاب لکھوانا چاہتے ہیں جس میں قدم سلاطین کے حالات ہوں۔ مگر زور اس بات پر ہو کہ سلطنت اس خاندان میں کیونکر اور کن کن اسباب سے آئی اور گئی تو کن کن سببوں سے گئی مثلاً بادشاہ کی بے پروائی یا عیاشی یا بدنیتی وغیرہ سے یا ارکانِ دولت کی بے لیاقتی یا نمک حرامی سے۔ مجھے لکھا تھا کہ تم اس کام کا ذمہ لو اور لکھو کہ کیا تنخواہ لوگے۔ میں نے عدیم الفرصتی کا عذر کرکے ٹال دیا۔ ۸-۱۰ دن ہوئے کہ وہ خود آئے اور کہا کہ ان کی نوکری منظور کرو تو کیا تنخواہ لوگے۔ اور اس میں اصرار کیا۔ میں نے صاف جواب دیدیا اور انکار کیا۔ غالباً آپ کے نزدیک بھی نامناسب ہوگا۔ میری اپنی کتابیں ناتمام پڑی ہیں کہ لوگوں کی آنکھیں اور میری جان انہی میں لگی ہے۔ میں کسی کی کتاب لکھوں۔ طمع کا منہہ کالا ہے آپ نے اخباروں میں دیکھا ہوگا کہ ڈسٹرکٹ مدارس سررشتہ تعلیم سے الگ ہوکر انتظام جدید میں آنکلے۔ کالج کا بھی ایسا ہی حال ہوگا۔ کالج کا مولوی اور پنڈت صرف تخفیف میں آئیگا۔ کیونکہ یونیورسٹی پنجاب میں مولوی اور پنڈتوں کی کیا کمی ہے۔ اچھا مجھے پنشن بھی دیدینگے تو قناعت کرونگا اور تصنیفات کو پورا کرونگا۔ اپنے لختِ جگر بچوں کو نیمجان تڑپتا نہ چھوڑونگا۔ چھپائی کا کام ۱۰-۱۲ دن سے زیادہ نہیں رہا۔ اب حیات نے مجھے ہلاک کردیا مجھ سے بیوقوفی ہوئی ہے۔ چھپنے کا کام تھا جو ڈیڑھ مہینے میں گیا ہے۔ اللہ آسان کرے۔ جناب مخدوم و مکرّم اپنے بھائی صاحب کو تسلیم کہنے لگا اور یہ بھی کہنے گا کہ وہ خود دیکھتے ہیں یا نہیں۔ بہتر ہے کہ ضرور دیکھا کریں تاکہ حال تو معلوم رہے۔

آزاد

عالی جناب من -

تسلیم - کئی دن سے کہہ رہا تھا کہ لکھوں اور لکھوں اور آج ضرور لکھونگا کہ مرحمت نامہ
آن ہی پہنچا - خدا آپ صاحبان کو بہ دولت و اقبال و ترقیات روزافزوں سلامت رکھے
کہ مجھ جیسے نالائق کو کس طرح یاد رکھتے ہیں - بہرحال یہ ہی کہ تقریباً ۸ دن ہُوئے ہونگے
آب حیات اور نیرنگ خیال سے چھٹکارا ہوا - مگر اس سال یونیورسٹی مجھ پر مہربان ہوئی -
زبان اُردو میں طلباء داخلہ کا ممتحن مقرر کیا - اور زبانوں میں اُردو اور فارسی کا - اور ایک حصہ
عربی کا - انکے سوالات بنانے کچھ ایسا وقت نہیں لیتے - مگر کاغذات جو نمبر لگانے کو
آئے ہیں وہ چھاتی پر پہاڑ ہیں - ۶۱۸ کا غذ ہے - اور آج سے ۱۰ دن کی مہلت باقی
ہے - خدا اس بلا سے جلد مخلصی دے - یہ درست ہے کہ اس میں تقریباً ڈیڑھ سو روپے
کا فائدہ مجھے ہو جائیگا یا شاید کچھ زیادہ ہو - مگر خدا گواہ ہے کہ میں اس پر خاک ڈالتا -
منظور فقط اس لئے کیا کہ اس دفعہ کالج کا معاملہ نازک ہو رہا ہے - رجسٹرار ناراض ہوتا
تو لوگ مجھے احمق بنائینگے اور کہینگے کہ ڈاکٹر لائٹنر تو باسباب خاص ناراض ہو گئے
اور ان کی ناراضی بے شک تدارک پذیر نہ تھی - انہیں تو نے کیا سمجھکر ناراض کر دیا -
اس سبب سے یہ بوجھ سر پر لے لیا - ورنہ آپ یقین فرمائیے کہ آزاد روپیہ کا لالچی نہیں
ڈاکٹر لائٹنر صاحب نے کئی دفعہ ممتحن کیا اور میں نے صاف انکار کر دیا -

اب بات فقط اتنی ہے کہ ایک منشی بھی میں نے رکھ لیا ہے - وہ میرے ساتھ
کام کر رہا ہے - انشاءاللہ ۱۰ دن میں اس کام کو ختم کر دونگا - پھر دربار اکبری ہے
اور میں ہوں - مولٰے اسداللہ الغالب مظہر العجائب کا فضل شامل حال چاہیے - آپ
دیکھینگے کہ تیسرے ہفتہ میں کچھ نہ کچھ لیکر حاضر خدمت ہونگا - آپ انہیں پھر لکھ دیجئیگا
کہ آپ سمجھ لیں میری کل تصنیفات مرحوم مغفور کی ہو چکیں - خدا گواہ ہے - مجھے
اُن سے غائبانہ عشق تھا - پہلے لکھتا تو خوشامد تھی - اب تو خاص اپنا کے اور

میرے تو خیال میں معاملہ ہی دوسرا ہے۔ ممکن ہے کہ آج یورپ روحانی پر اُن کا خیال کرو تھا۔ یہ میں جانتا ہوں
کہ اس کی باتیں قابلِ یقین ہرگز نہیں۔ لیکن اسے میں نے ایک بھلاوا اپنے دل کا
کر رکھا ہے۔ رات کو ایک بجے دو بجے بیٹھ کر باتیں کیا کرتا ہوں۔ اور یہ یقین آپ
کریں کہ ابنائے زمان اخوان الشیاطین جو زندہ ہیں اُن سے تو اُسکی باتیں بہرحال
بہتر ہیں ؎

بسکہ از برخوردِ عالم عکسِ مطلب دیدہ ام　　میرم از آب از آئینہ پنہاں می شوم

آپ نے تصویروں کا کچھ بندوبست نہ فرمایا۔ مجھے اکبر کی ایک تصویر ہاتھ آئی کہ دو تین
ترک عورتیں بیٹھی ہیں اور وہ دو تین برس کا بچہ بیچ میں کھیلتا پھرتا ہے۔ رات کا وقت
ہے۔ شمع روشن ہے۔ جھنجھنے وغیرہ سامنے پڑے ہیں۔ یہ اکبر کے ابتدائی حالات
میں لگانی واجب ہے۔

ایک ایسی ہی پرانی تصویر ملا دوپیازہ کی ہاتھ آئی۔ بیربل کے ساتھ اسے بھی لگانا
واجب ہے۔ اگرچہ کتاب سے ملا دوپیازہ کی اصل نہیں معلوم ہوئی۔ مگر مسخروں اور
بھانڈوں سے اس کا شملہ دستار بیربل کی دُم میں مضبوط باندھا ہے۔

راجہ مان سنگھ کی تصویر بھی سنہری ہے۔ سرکار الور سے منگائی ہے۔
بہت سمع خراشی کی۔ اب انشاءاللہ پھر۔　　محمد حسین آزاد
۱۸ مئی سنہ ۸۳ء

جناب من۔

تسلیم۔ ۱۲ دن کا عرصہ ہوا کہ ایک نسخہ آبِ حیات طبع جدید بذریعہ عریضہ نیاز
ارسال خدمت کیا ہے۔ تعجب ہے کہ اب تک رسید اسکی نہیں پہنچی۔
کتاب مذکور میں اگرچہ جابجا بہت مطالب زیادہ کئے ہیں۔ مگر میر انیس مرحوم کے

خاندان کا حال اور مرزا دبیر مرحوم کا حال آپ سے داد طلب ہے۔ اب کی دفعہ فہرست بھی بہ نسبت طبع اوّل کے مفصل تر لکھی ہے۔ اسے ملاحظہ فرما لیجئے گا۔

اگر فرمایئے تو ایک نسخہ آپ کے بھائی صاحب قبلہ کی خدمت میں بھی بھیجدوں مگر انہیں ایسے ہزلیات کے دیکھنے کی فرصت کہاں ہوتی ہوگی پھر یہ بھی فرمایئے کہ ایک نسخہ سید مائق علیخاں کی خدمت میں بھیجوں۔ یا کچھ ضرورت نہیں۔ اور اگر بھیجوں تو پھر جناب عالی کے لئے کیا رائے ہے۔

دربار اکبری کو پیٹ رہا ہوں۔ مگر دو ہی دن جمکر بیٹھا تھا کہ آنکھوں نے رنگ بدلا اور دماغ جواب دینے لگا۔ خیر میں نے ایک دن آرام دیا۔ تخفیف معلوم ہوئی اب آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ خیر۔ کام خدا کے فضل سے ہوگیا۔ مگر افسوس اس بات کا آتا ہے کہ بے وقت ہوا۔ خدا اس مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مراتب قربت کرے۔ اگر خدا ہوتا تو ان چھپیوں میں خود جاتا اور سناتا۔ جب دل کا ارمان نکلتا۔ کیونکہ میں دیکھتا کہ وہ کیا کہتے ہیں اور کس کس مقام پر کیا رائے لگاتے ہیں۔

اب جو لکھنا تھا وہ میں نے لکھ لیا اور ہر ایک حال سلسل بھی ہو گیا۔ جو کام باقی ہے وہ فقط اتنا ہے کہ کہیں کوئی فقرہ بڑھا دیا۔ کہیں دو کو ایک کر دیا کہیں کوئی لفظ بدل دیا کہیں پس و پیش کر دیا۔ خیر اللہ سب مشکلوں کا آسان کرنے والا ہے۔ دیکھئے! تصویروں کے باب میں اتنا لکھا۔ جناب سید صاحب نے جواب ہی نہ دیا۔ میں نے ۸۔۱۰ تصویریں بہم پہنچائی ہیں۔ جس طرح ہوگا انہیں سے اس کتاب کو سنوار کر حاضر کر دونگا۔ افسوس کہ فرصت نہیں۔ خیر۔ اب پھر۔

محمد حسین۔ آزاد

لاہور۔ بنگلہ ایوب شاہ

۱۰۔ اگست سنہ ۸۳ء

میرے درمیان میں معاملہ ہو۔ ہونکتے آج تیرا روحانی پر اُنکا خیال کرو تھا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ اس کی باتیں قابلِ یقین ہرگز نہیں۔ لیکن اتے ہیں نے ایک بھلاوا اپنے دل کا رکھ ہے۔ رات کو ایک بجے دو بجے بیٹھ کر باتیں کیا کرتا ہوں۔ اور یقین آپ کریں کہ یہ ابنائے زمان اخوان الشیاطین جو زندہ ہیں اُن سے تو اُسکی باتیں بہرحال بہتر ہیں ؎

بسنا از بر خود دعا علمِ طلب دیدہ دام　　میرحم از آب از آئینہ پنہان محتوم

آپ نے تصویروں کا کچھ بندوبست نہ فرمایا۔ مجھے اکبر کی ایک تصویر ہاتھ آئی کہ سہ یہ ترک عورتیں بیٹھی ہیں اور وہ دو تین برس کا بچہ بیچ میں کھیلتا پھرتا ہے۔ رات کا وقت ہے۔ شمع روشن ہے جھنجھنے وغیرہ سامنے پڑے ہیں۔ یہ اکبر کے ابتدائی حالات میں لگائی واجب ہے۔

ایک ایسی ہی پُرانی تصویر ملا دو پیازہ کی ہاتھ آئی۔ بیربل کے ساتھ اسے بھی لگانا واجب ہے۔ اگرچہ کتاب سے ملا دو پیازہ کی اصل نہیں معلوم ہوئی۔ مگر مسخروں اور بھانڈوں سے اس کا شملہ دستار بیربل کی دُم میں مضبوط باندھا ہے۔

راجہ مان سنگھ کی تصویر بھی سنداً ہی ہے۔ سرکار الور سے منگائی ہے۔ بہت سمع خراشی کی۔ اب الشاء اللہ پھر۔

محمد حسین آزاد
۱۸ - مئی سنہ ۸۳ء

جناب من۔

تسلیم۔ ۱۲ دن کا عرصہ ہوا کہ ایک نسخہ آبِ حیات طبعِ جدید بذریعہ عریضہ نیاز ارسالِ خدمت کیا ہے۔ تعجب ہے کہ اب تک رسید اُسکی نہیں پہنچی۔

کتاب مذکور میں اگرچہ جابجا بہت مطالب زیادہ کئے ہیں۔ مگر میر انیس مرحوم کے

خاندان کا حال اور مرزا دبیر مرحوم کا حال آپ سے داد طلب ہے۔ اب کی دفعہ فہرست بھی بہ نسبت طبع اوّل کے مفصل تر لکھی ہے۔ اسے ملاحظہ فرمائیے گا۔

اگر فرمائیے تو ایک نسخہ آپ کے بھائی صاحب قبلہ کی خدمت میں بھی بھیجدوں مگر انہیں ایسے جزئیات کے دیکھنے کی فرصت کہاں ہوتی ہوگی پھر یہ بھی فرمائیے کہ ایک نسخہ سید لائق علی خاں کی خدمت میں بھیجوں۔ یا کچھ ضرورت نہیں۔ اور نہیں بھیجوں تو پھر جناب عالی کے لئے کیا رائے ہے۔

دو بار کبری کو لپٹ رہا ہوں مگر دو ہی دن جھک کر بیٹھا تھا کہ آنکھوں نے رنگ بدلا اور دماغ جواب دینے لگا۔ خیر میں نے ایک دن آرام دیا۔ تخفیف معلوم ہوئی۔ اب آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ خیر۔ کام خدا کے فضل سے ہوگیا۔ مگر افسوس اس بات کا آتا ہے کہ بے وقت ہوا۔ خدا اس مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مراتب قربت کرے۔ اگر وہ خود ہوتا تو ان چھیٹوں میں خود جاتا اور سناتا۔ جب دل کا ارمان نکلتا۔ کیونکہ میں دیکھتا کہ وہ کیا کہتے ہیں اور کس کس مقام پر کیا رائے لگاتے ہیں۔

اب جو لکھنا تھا وہ میں نے لکھ لیا اور ہر ایک حال مسلسل بھی ہوگیا۔ جو کام باقی ہے وہ فقط اتنا ہے کہ کہیں کوئی فقرہ بڑھا دیا۔ کہیں دو کو ایک کردیا کہیں کوئی لفظ بدل دیا۔ کہیں پس و پیش کر دیا۔ خیر اللہ سب مشکلوں کا آسان کرنے والا ہے۔ دیکھئے۔ تصویروں کے باب میں اتنا لکھا۔ جناب سید صاحب نے جواب بھی نہ دیا۔ میں نے ۱۰۔۸ تصویریں بہم پہنچائی ہیں۔ جس طرح ہوگا انہیں سے اس گڑیا کو سنوار کر حاضر کر دونگا۔ افسوس کہ فرصت نہیں۔ خیر۔ اب پھر۔

محمد حسین۔ آزاد

لاہور۔ بنگلہ ایوب شاہ

۱۰۔ اگست ۱۸۸۰ء

لاہور۔ بنگلہ ایوب شاہ۔ ۱۴۔ اگست ۸۳ء

جناب من۔

تسلیم۔ مرحمت نامۂ عالی نے شرف اعزاز بخشا مگر میں تحریر عریضہ میں مقصر رہا۔ الحمد للہ آپ کے بدر کے تصدق سے نور چشم کو خدا نے فضل کیا کہ اڑھائی مہینے ہوئے اسے پٹیالہ روانہ کر دیا۔ مگر جس دن آپ کا مرحمت نامہ پہنچا دوسرے دن اس کا خط آیا کہ لڑکا سخت علیل ہو گیا۔ میں بہت پریشان ہوا۔ اور یہاں سے ارسال ادویات کی فکر میں مصروف رہا۔ کچھ دل بھی ٹھکانے نہ رہا۔ شکر خدا کہ کل وہاں سے خط آیا۔ جس سے گونہ اطمینان حاصل ہوا۔ تحریر جواب میں جو دیر ہوئی معاف فرمائیگا۔

دو نسخے آب حیات حیدرآباد کو روانہ کر دیئے اور آپ کے بھائی صاحب کو عریضہ لکھدیا ہے کہ ایک نسخہ اپنے کتب خانہ میں رکھیں۔ دوسرے نسخہ کے لئے اس قدر مرحمت فرمائیں کہ ایک عریضہ میری طرف سے لکھوائیں۔ اور حضور نواب سید لائق علی خاں بہادر کی خدمت میں پیش فرمائیں۔

جن جن نسخوں کے لئے آپ نے ارقام فرمایا ہے۔ بیشک حصول مقاصد اور مطلب برآری کا رستہ یہی ہے مگر کیا کروں کہ طبیعت ایسی واقع نہیں ہوئی۔ میں ہمیشہ یک رخ بازی کھیلا ہوں اور خدا چاہے تو یہی چال چلونگا۔ جیت ہار خدا کے ہاتھ ہے۔ کبھی تو ہمارا پانسہ بھی سیدھا پڑیگا۔ ؎

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند   چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

امرت سر کے باب میں روز بندوبست کرتا ہوں۔ پھر یہی کہتا ہوں جو گھڑی اس کام میں صرف ہو جائے وہی غنیمت ہے۔ کاغذ گو پھیلے رہتے ہیں۔ آپ بیچ میں کبھی بیٹھا کبھی لیٹا رہتا ہوں اور کاٹ چھانٹ۔ کتر بیونت کئے جاتا ہوں۔ جو منشی میں نے رکھا تھا بہت خوب تھا۔ اس کے دادا اور پھر اس کے والد میرے والد مرحوم کے پاس تھے۔

اس کی سمجھ اور مزاولت اچھی تھی۔ صرف ۵ روپے مہینا اور کھانا وغیرہ ذمہ لیا اور بلایا۔ اس بیچارے کو تپ دق نکلی۔ ڈیڑھ مہینے کے بعد کچھ وہ گیا کچھ میں نے رخصت کر دیا اب میں ہوں اور میرے نامۂ اعمال۔ غالباً دلی کا ایک سفر ضروری بلکہ بمجبوری پیش آئیگا۔ تب آپکو سلام کرتا ہوا جاؤنگا

حیدرآباد آپ ہی ذریعہ سے فرما کر لکھ بھیجیں کہ حضور نواب صاحب بالقابہ کی خدمت میں کتاب پیش فرماویں اور جو کچھ مناسب ہو زبانی عرض فرماویں ۔

محمد حسین آزاد

جناب من

تسلیم۔ کاش ۱۵ ۔ ۲۰ دن پہلے تشریف لے جاتے میں ضرور آپ کے ہمرکاب چلتا۔ ایک دو مشاعرے۔ ایک دو جلسے لکچروں کے دیکھتا اور دکھاتا اب سوائے حسرت و ارمان کے کیا ہوسکتا ہے۔ آپ کا خط میں نے صبح کے ۷ بجے پایا۔ ارادہ ہوا کہ خود چلکر ملنے کا بندوبست سوچوں کہ اتنے میں مصور آیا جس کا کئی دن سے انتظار تھا۔ اسے راجہ مان سنگھ اور مادو پیارے کی تصویر دے رکھی تھی کہ نقل اتار دے مان سنگھ کی تصویر الور کے وزیر نے محبت قدیم کی رعایت سے بھیجی ہے اور مادو پیارے کی تصویر بھی ایک جگہ سے ہاتھ آئی۔ یہ بہت پرانی اور سندی ہے۔ مصور نے جو نقل اتاری ہے کئی جگہ سے قابل اصلاح ہے۔ ۱۰ بجے تک وہ بیٹھا اور وعدہ کر گیا کہ کل پھر آؤنگا چونکہ اس کا ہاتھ آنا بھی مغتنمات سے ہے اس لئے کل بھی نہیں حاضر ہوسکتا۔ البتہ انشاءاللہ پرسوں حاضر خدمت ہونگا۔ آپ سے بڑی التجا یہی ہے کہ وہاں جاکر تصویریں تلاش فرمائیں۔

غالباً آپ کو بھی لکھ چکا ہوں کہ دو نسخے بصیغہ رجسٹری آپ کے بھائی صاحب کی

خدمت میں بھیجدیئے ہیں۔ ۲۴۔ اگست کو روانہ کئے تھے۔ اب تک رسید نہیں آئی۔ معلوم نہیں کہ آب حیات حضور جناب عالی کے ملاحظہ سے بھی گذرا ہے یا نہیں اگر مناسب جانیں تو ذرّہ کو نظر خورشید تک پہنچائیں کسی قسم کی طلب یا امید نہیں ہے۔ فقط اتنی ہی خوشی مطلوب ہے جو ہر مصنف کو اپنے کلام کے پھیلانے میں ہوتی ہے۔

اس خیال سے مبادا محروم الخدمت رہ جاؤں۔ یہ نیاز نامہ لکھ کر روانہ کرتا ہوں خیر اندیکے از بسیار کچھ باتیں تو آپ تک پہنچ جائیں +

آزاد

لاہور۔ بنگلہ ایوب شاہ

۱۳۔ ستمبر ۱۸۸۳ء

آنریبل پنڈت گوپال کرشن گوکھلے سی۔ آئی۔ ای۔

(جنکی تصویر اس ماہ کے مخزن کے لئے باعث زینت ہے) کا نامی نامی کسی مزید تعارف یا تعریف کا محتاج نہیں۔ آپکی زندگی کا طالبہ ہندوستانیوں کے لئے اولالعزمیوں اور بلند حوصلگیوں کا ایک نہایت ہی مفید سبق اور قابل تقلید نمونہ پیش کرتا ہے۔ آپ ۱۸۶۶ء میں بمقام کولہاپور پیدا ہوئے اور ایف اے تک وہیں تعلیم پائی اور پھر بمبئی کے ایلفنسٹن کالج میں تحصیل علم کے لئے گئے۔ ریاضی میں آپ نے خصوصیت سے امتیاز حاصل کیا۔ آپ کے والدین چونکہ تعلیمی اخراجات کے زیادہ متحمل نہ ہو سکتے تھے اور آپ کو وظیفہ بھی نہ مل سکا تو مجبوراً فکر معاش میں آپ کو انجنیرنگ کالج پونا میں داخل ہونے کی کوشش کرنی پڑی۔ مگر وہاں بھی ناکام رہے۔ آپ نے ۱۸ برس کی عمر میں اشاعت تعلیم کے لئے اپنی زندگی کے بیس سال وقف کر دیے۔ پولیٹکل خدمات کے سرانجام دینے میں آپنے ایک خاص ممتاز درجہ حاصل کیا۔ گورنمنٹ نے بھی وائسرائے کی کونسل کا ممبر مقرر کرکے آپکی خداداد قابلیت کا اعتراف کیا۔ گذشتہ سال انڈین نیشنل کانگریس کے آپ پریزیڈنٹ منتخب ہوئے اور اب آپ پھر اپنے ملک کی خدمت کے لئے انگلستان تشریف لے گئے ہیں +

جاپان اور اسکی حیرت انگیز ترقی

(اشاعتِ گذشتہ سے آگے)

اس وقت کے بعد جاپان کی تاریخ ان اصولوں کی تکمیل میں نہایت بلیغ کوششوں کی تاریخ ہے۔ اور اسی کے متعلق ہم اس واقعہ کا بھی ذکر کرنا چاہتے ہیں جو تاریخ اقوام میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

یقین نہیں آتا اور یہ بات فطرتِ انسانی کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ اعیان و امرا کا ایک جمِ غفیر اپنی بڑی بڑی جاگیریں بڑے بڑے حقوق اپنی دولت اپنی حشمت خود اپنی مرضی سے شہنشاہ کے حوالے کر دیں لیکن جاپانی اعیان و امرا نے ایسا ہی کیا۔ ایک میموریل جو کئی امرا نے دستخط کر کے دربارِ شاہی میں بھیجا اس کا مضمون یہ تھا "جس جگہ ہم رہتے ہیں شہنشاہ کی زمین ہے جو کھانا ہم کھاتے ہیں شہنشاہ کی رعایا کا پیدا کردہ ہے ہم اس کو کس طرح اپنی ملکیت بنا سکتے ہیں۔ ہم نہایت ادب سے اپنے مقبوضات اور اپنے ماتحتوں کی فہرست دربارِ شاہی میں داخل کرتے ہیں۔ ہماری درخواست ہے کہ شہنشاہ جس کو چاہیں انعام دیں جسکو چاہیں سزا دیں جس طرح چاہیں جاگیریں تقسیم کریں دیوانی فوجداری اور فوجی احکام سب دربار سے صادر کئے جائیں اور سب چھوٹے بڑے معاملات ملکی مرضیٔ شاہی کے مطابق طے کئے جائیں"۔ چنانچہ سنہ ۱۸۷۱ء میں سلسلہ تعلقداران و جاگیرداران موقوف ہو گیا۔ قابلیت اور لیاقت کے اشخاص دربار میں اور ملکی خدمات پر رفتہ رفتہ مامور ہوتے گئے۔ سنہ [illegible] میں عہدنامہ جات پر نظرِ ثانی کی گئی اور جاپان کو دیگر طاقتوں سے ہمسری کا رتبہ حاصل ہو۔

سنہ ۷۴ء میں فارموسا پر حملہ کر کے انکی بے اعتدالیوں کی سزا دیگئی۔ سنہ ۷۵ء میں روس سے جزیرہ سگھالین میں سرحدی تنازعات فیصل ہوئے سنہ ۷۶ء میں کوریا کے ساتھ عہدنامہ کیا گیا۔ سنہ ۹۰ء میں پارلیمنٹ قائم کی گئی اور پارلیمنٹ کے آئین قائم کرنے کے لئے آئیٹو ہیرو بومی کو یورپ بھیجا گیا۔ سنہ ۸۸ء میں کیبنیٹ پریوی کونسل قائم کی گئی جنکا پریزیڈنٹ آئیٹو مقرر کیا گیا۔ اور دیوانی اور فوجداری قوانین نہایت شائستگی کے ساتھ مدون کئے گئے۔ شہنشاہ جاپان کو تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوئے تین برس گذرے تھے کہ مارکوئیس آئیٹو کی وزارت کو فوجی اخراجات میں زیادتی کی وجہ سے شکست ہوئی اس موقعہ پر شہنشاہ نے یہ پیغام بھیجکر قوت رعیت کی اہم نے حکم دیدیا ہے کہ ہمارے خانگی اخراجات میں تخفیف کیجائے تاکہ تین لاکھ روپے سالانہ ملکی حفاظت کے لئے آئندہ چھ برس تک برابر صرف کئے جاسکیں نیز ہم نے حکم دیدیا ہے کہ ملازمان سرکاری میں سے ہر ایک اپنی تنخواہوں کا دسواں حصہ بحری اخراجات کے لئے دے۔ ان ملکی مشکلات کے حل کرنے کے لئے ہمیں امید ہے کہ آئین و قوانین کے مطابق ہمارے وزرا اور قائم مقام کوشش کرینگے اور ہم اپنی رعایا کے ہر متنفس سے امید رکھتے ہیں کہ وہ بھی اس معاملہ میں اپنے فرائض کو انجام دیگا۔ اس پیغام نے گویا تمام ملک میں ایک برقی حرکت کا کام کیا۔ سنہ ۹۴ء میں جاپان اور انگلستان اور دیگر طاقتوں میں عہدنامے ہوگئے ہیں جسکی رو سے ممالک غیر کو تجارت دی گئی مگر مقامی حکومت کے تمام حقوق اُن سے لے لئے گئے۔ اور جاپان دنیا کی بڑی بڑی خودمختار طاقتوں کے عقد ثریا میں نہایت آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگا۔

سنہ ۹۴ء میں چین و جاپان کی لڑائی کے موقع پر اور اب دس برس پیچھے روس و جاپان کی لڑائی کے موقع پر جو کارنامے نمایاں جاپان نے دکھلائے ہیں اور دکھا رہا ہے اُسکے اول درجہ کی طاقت ہونے کا بین ثبوت اور روشن دلیل ہیں۔ اس حیرت انگیز

ترقی کی وجہ کونٹ اوکوما نے خود اس طرح ایک تقریر میں بیان کی ہے۔

اگر ہم تاریخ یورپ پر نظر ڈالینگے تو ہم کو ایک قاعدہ ترقی کا معلوم ہوگا جو مقتضیات سے پیدا ہوئی ہے کوئی قوم خواہ اُس کے آئین اور طرز حکومت کچھ ہی ہوں اُسی وقت تک بہبودی کی حالت میں رہ سکتی ہے کہ جب تک خیال انسانی کی عظیم الشان موجوں کے ساتھ ساتھ تیرتی جاتی ہے۔ بہاؤ سے الگ ہوکر چلنا یا مخالف سیل روان جانے کی کوشش کرنا قومی بربادی کا باعث ہوتا ہے۔ ہماری قومی ترقی کی وجہ یہ ہے کہ ہم ابتدا سے اس اصول پر کاربند رہے ہیں جو ہمارے شہنشاہ المعظم نے قائم کیا ہے یعنی تمام روئے زمین پر علم تلاش کرنا اور ہر بات سے اس کی خوبیاں اخذ کر لینا شائستگی اور تمدن کے معاملات میں اقوام زمانہ سے گوئے سبقت لیجانے کی کوشش کرنا یہی عروج جاپان کی جب سے کسی مفید بات کی تقلید کرنے میں ہمیں پس و پیش نہیں۔ ترقی انسان کی موج کی طغیانی کے ساتھ ساتھ تیرنے میں ہم کبھی نہیں تھکتے اور کسی بری رسم کے ترک کرنے میں خواہ کسی قدر نقصان اور خودشاری درکار ہو کبھی دریغ نہیں کرتے معاملات ملکی میں قوم کے لوگوں کی رائے کی شنوائی ہوتی ہے۔ اس اصول کی بدولت جو آج عہد سے روشن ہے جسکو ہم نے تمام زمانہ میں پھر کر حاصل کیا ہے ہمارے آئین اور طریقہ حکومت عدل اور عقل پر مبنی ہیں۔ قوم کی آزادی میں فرق نہیں آیا تجارت اور زمینداری کے معاملات میں اصلاح کی گئی اور ہر قسم کی قومی زندگی آزادی کے ساتھ ترقی پا گئی گویا اس اصول کی بدولت جاپان کو ترقی انسانی کی سیل روانگی کے ساتھ ساتھ تیرنے میں بہت کچھ مدد ملی ہے۔ تیس برس سے زاید حکومت جاپانی نے تعلیمی معاملات میں نہایت توجہ اور جانفشانی سے کام لیا ہے اور پولیٹیکل سوشل اور جنگی امور میں طالب العلموں کی بہترین تعلیم بمال فیاضی کے ساتھ دی گئی ہے۔ اسی طرح صنعت حرفت تجارت زراعت میں بھی طالب علموں کو امداد دی گئی ہے۔ ہمارا ملک بین الاقوام تجارت

کے میدان میں بڑی بڑی طاقتوں کا حریف ہے ۔ جاپانی صرف لڑنا ہی نہیں جانتے بلکہ زراعت تجارت اور صنعت و حرفت کے معاملے میں بھی دستگاہ کامل رکھتے ہیں گذشتہ تیس سال میں ملکی دولت چھ سات گنی زیادہ ہوگئی ہے ۔ اور گذشتہ دس سال میں یعنی جنگ چین کے اختتام کے بعد آجتک ملکی دولت سہ گنی ہے ۔ جاپان کی فتوحات جنگی اور بحری امور تک محدود نہیں ہے بلکہ اس بات سے کہ گذشتہ دس سال میں ملکی دولت تگنی ہوگئی ہے ۔ یہ ثبوت ملتا ہے کہ جاپانی فتوحات ہر صیغہ میں جاری ہیں

جاپان کی مالی حالت کی نسبت اخبار ٹائمین پٹن سنچری میں لکھا ہے کہ جاپان کے منافع بخش ذرائع غیر ملک کے ساہوکاروں کے ہاتھ میں بالکل نہیں جیسا کہ اکثر نو ترقی یافتہ ممالک میں پایا جاتا ہے ۔ بلکہ اس کے تمام بندرگاہ ریلیں بحری اور برقی کارخانے ٹیلیگراف ٹیلیفون دخانی انجن اور کانیں سب اہل ملک کے ہاتھ میں ہیں ۔ جاپانی روپیہ سے یہ سب کام چلائے جاتے ہیں ۔ اور باوجود اس کے جاپانی بنک سیونگ بنک ۔ راہن کمپنیاں ۔ بیمے کی کمپنیاں روز بروز روپیہ کی بھرمار سے مالدار ہوتی چلی جاتی ہیں سنہ ۱۹۰۲ء میں سات ہزار آٹھ سو سولہ ایسے کارخانے تھے جن میں دخانی انجن کام کرتے تھے ۔ اور دو ہزار نو سو اکانوے کارخانوں میں موٹر سے کام لیا جاتا تھا باقی ہاتھ سے کام کرنیکے کارخانے جُدا تھے ۔ قریباً پانچ لاکھ کام کرنے والوں میں سے باسٹھ فیصدی عورتیں ہیں ۔ کلیں لوکوموٹو انجن ۔ اور جہاز بنانے کے کارخانے موجود ہیں ۔ کپڑا ۔ ریشم ۔ کاغذ ۔ دیا سلائی ۔ چٹائیاں ۔ برتن اور وارنش وغیرہ بنانے میں جاپان اکثر ممالک سے گوئے سبقت لیگیا ہے اور کسی سے کم تو ہرگز نہیں ۔ موجودہ جنگ سے جاپان کی تجارت میں بالکل فرق نہیں آیا بلکہ جس طرح جنگ چین ترقی تجارت کا باعث ہوئی تھی اسی طرح اُمید کیجاتی ہے کہ جنگ روس بھی موجب ترقی جاپان ہو ۔

جاپان میں تعلیم موجودہ کی تاریخ سنہ ۱۸۶۸ء سے شروع ہوئی ہے ۔ بچے لوگونکو بکھیر

جاپان میں تعلیم مغربی کا شوق پیدا ہوا تھا چنانچہ سنہ ۶۸ء میں بمقام ٹوکیو ٹوائیٹ بورڈ آف ایجوکیشن قائم ہوا سنہ ۷۲ء میں نصاب تعلیم مرتب کیا گیا اُس وقت شہنشاہ نے اپنا منشاء ان الفاظ میں ظاہر کیا کہ اس وقت سے ہمارا منشاء یہ ہے کہ تعلیم اس قدر عام کر دی جائے کہ کوئی گاؤں ایسا نہ ملے جس میں ناخواندہ خاندان موجود ہو اور کوئی خاندان ایسا نہ ملے کہ جس میں ایک بھی ناخواندہ شخص نظر آئے۔ ممالک غیر میں تعلیم کے لئے پہلے بہت سے طالب علم جایا کرتے تھے۔ چنانچہ سنہ ۷۳ء میں دو سو پچاس طالب علم سرکاری خرچ پر تعلیم کی غرض سے ممالک غیر میں بھیجے گئے رفتہ رفتہ خود جاپان ہی میں ہر قسم کے تعلیمی ذرائع مہیا ہو گئے جو طالب علم غیر ملکوں سے علم و ہنر سیکھ کر آئے انہوں نے یہاں تک دستگاہ حاصل کی کہ خود تعلیم دینے لگے چنانچہ سنہ ۹۵ء میں صرف گیارہ طالب علموں کو غیر ممالک میں سرکاری خرچ پر بھیجنا کافی سمجھا گیا۔ اہل جاپان زیادہ تر اپنی مدد آپ کرنا چاہتے ہیں ممالک غیر کے دست نگر رہنا نہیں چاہتے۔ علوم و فنون کی تعلیم گاہوں میں بھی جہاں پہلے انگریز امریکن۔ فرانسیسی یا جرمن پروفیسر ہوتے تھے۔ اب جاپانی پروفیسر ہوتے ہیں سنہ ۱۹۰۰ء میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ تمام ابتدائی مدارس میں تعلیم بلا فیس دی جائیگی۔ اہل جاپان تعلیمی معاملات میں بہت دلچسپی لیتے ہیں اور دل کھول کر عطیے دیتے ہیں سنہ ۹۲ء میں سوا لاکھ پونڈ کے عطیات مدرسوں کو دیے گئے۔ ایک برس میں چھتیس لاکھ ایکڑ زمین چودہ ہزار کتب بطور ڈونیشن رعایا کی طرف سے وصول ہوئیں۔

پہلے یہ دستور تھا کہ اگر کسی کے ہاں اولاد نرینہ نہ ہوتی تھی تو گھر میں حرم ڈال لیا کرتے تھے۔ اکثر خود بیبیاں ہی اپنے خاوندوں کو دوسری شادی کی ترغیب دیا کرتی تھیں لیکن سنہ ۹۰ء میں فرمان شاہی کی رو سے یہ اعلان کیا گیا کہ حرم کی اولاد جائز وارث نہ سمجھی جائیگی اور اس طرح سے یہ بری رسم اب قریباً معدوم ہو گئی ہے۔ جاپان کا طبی محکمہ

تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ ایک جاپانی نہایت قابلیت کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیتا ہے
طبی افسر نے ایک انگریز سے کہا کہ ہم بیماری کو بالکل نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں۔ روس
بیس لاکھ فوج میدان کارزار میں جمع کر سکتا ہے اور ہم صرف پانچ لاکھ لیکن یہ بات سب
جانتے ہیں کہ لڑائیوں کے موقع پر اگر ایک آدمی گولی سے مرتا ہے تو چار آدمی بیماری
کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔ روس کا اس جنگ میں یہی حال ہوگا۔ ہم نے ایسا انتظام
کیا ہے کہ بیماری سے کوئی مرنے نہ پائے اور ہر ایک سپاہی میدان جنگ میں
کام آئے پس ہم کو روس کی کثیر التعداد فوج سے کچھ بھی اندیشہ نہیں ہے اور ہم اُن
سے کسی طرح کم نہیں۔ خواہ جاپانی افسر کا خیال آخر کار سچ نکلے یا غلط جو جو کام ہوئے
نمایاں اس وقت تک جاپان نے کئے ہیں اُنکو مد نظر رکھ کر ہم یہ تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ شکست و
فتح نصیبوں سے ہے۔

یکم جولائی سنہ ۱۹۰۴ء سے پہلے ایک ہزار زخمی ٹکایو کے ہسپتال میں داخل ہوئے
جن میں سے ایک بھی نہیں مرا۔ اہل جاپان کے خصائل اور عادات کے متعلق بعض
باتیں بیان کرنی نہایت ضروری معلوم ہوتی ہیں۔

اوّل حب وطنی در اصل اہل جاپان کا مذہب حب وطنی ہی ہے بادشاہ وقت
کے ساتھ وفاداری اور ملک کے لئے جان نثاری ہر ایک جاپانی کا دین و ایمان ہے
اہل جاپان کی نگاہ میں جان کی کچھ وقعت نہیں ہے گویا ہر وقت ہتھیلی پر سر رکھے
ہوئے ہیں۔ نام پر جان دیتے ہیں۔ جہاز کیشو مارو جب گرفتار ہوا تو اُس پر جس قدر
جاپانی افسر اور سپاہی وغیرہ تھے اُنہوں نے بے عزتی کے ساتھ مغلوب ہونے سے
خودکشی کر لینیکو ترجیح دی۔ دو ہزار ریزروسٹ جنکو محکمہ طبی نے لڑائی کے ناقابل قرار دیدیا
اُنہوں نے لڑائی میں جانے پر اصرار کیا ورنہ خود اپنے تئیں ہلاک کر دینا چاہا۔ بہت سی
بیبیوں اور بچوں نے اپنی جانیں اس لئے کھوئیں کہ اُن کے مرد جنگ میں جانے سے

باز نہیں ۔ پورٹ آرتھر کے دہانے کے قریب جب جہازوں کو ڈبونے کی تدبیر کی گئی تو بہت سے ملاحوں نے عرضداشت کی کہ ڈوبنے کی ڈیوٹی اُن کے سپرد کیجیے اور اُنھوں نے اپنی انگلیاں کاٹ کر اس عرضی پر اپنے خون سے مُہریں لگائیں ۔ دنیا میں تمام پُرجوش لوگ اور بھی ہو گئے مگر ایسے لوگ جن کا جوش انکے غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے اور سوچنے بچارنے کے بعد بھی قائم رہتا ہے ۔ شاید کہیں نہ ملیں ۔

اسی لڑائی کے موقعہ پر جب امیرالبحر ٹوگو کے ایک ناخدا نے نہایت بہادری کے ساتھ اپنی جان نثار کی تو ۔ ۔ ۔ اس کے والدین کو پنشن مرحمت ہوئی مگر اُنھوں نے پنشن لینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ بجائے کسی رنج کے ہم کو تو خوشی ہوئی ہے اور افتخار حاصل ہوا ہے کہ ہمارا بیٹا ملک کے کام آیا ۔ جب ایک کروڑ پونڈ کا قرضہ سرکار نے لیا تو بہت سے لوگوں نے سو پونڈ کے نوٹ دئے بجائے ایک سو بیس پونڈ دینے پر اصرار کیا ۔ بہت سے بنک اس بات پر ناراض ہوئے کہ سارا قرضہ انہیں سے کیوں نہیں لیا گیا ۔ یہ تو یہ ایک مجرم نے جو پھانسی دیئے جانے کو تھا اپنے آخری وقت کی خوراک وار فنڈ کو دیدی ۔ مدرسہ کے لڑکے وار آفس میں عرضیوں پر عرضیاں دیتے جاتے ہیں کہ ہم کو کسی نہ کسی خدمت پر لڑائی میں بھیجا جائے ۔ ان عرضیوں پر خون سے دستخط کرتے ہیں اور یہ کوئی غیر معمولی بات خیال نہیں کی جاتی ۔

• ڈاکٹر کاوا سورا چین کی لڑائی کے موقعہ پر نہایت زخمی ہو گیا تھا ایک سپاہی نے اسکو اٹھا کر لیجانا چاہا جب ڈاکٹر کو ہوش آیا تو پوچھا کہ کیا تم توپ پر متعین ہو اُس نے کہا ہاں ڈاکٹر نے کہا کہ جاؤ مجھ کو نہیں چھوڑو اور فوراً اپنے کام پر جاؤ جہاں اُس نے کہا کہ میری توپ بیکار ہو گئی ہے ڈاکٹر نے کہا کہ اس صورت میں تمکو کسی دوسری توپ پر جانا چاہیئے ۔ زخمیوں کو اٹھانا تمہارا کام نہیں ہے ۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ آئے جنکا فرض زخمیوں کا اٹھانا تھا اور ڈاکٹر کو اٹھا

ہسپتال لیگئے۔ وہاں پہنچکر ڈاکٹر نے پانی کی ایک ٹب منگائی اپنے زخمی پاؤں اُس میں ڈال دیئے اور ہسپتال کے دیگر زخمیوں کے علاج میں ایسے اطمینان کے ساتھ مصروف ہوگیا گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

مسٹر ان یوسوکی بہشتی کو جب اُس کی خدمت کا انعام دینے لگے تو اُس سے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ اُس نے جواب دیا کہ مجھے دو برس کے واسطے لنڈن سینٹ تھامس کے ہسپتال میں بھیجا جائے کہ میں وہاں تجربہ حاصل کرکے مُلک کی بہتر خدمت کرسکوں

ایک بوڑھیا کو جب اپنے دو بیٹوں کے لڑائی میں کھیت رہنے کی خبر ملی تو اُس نے آہ تک نہ کی۔ لیکن جب اُس کے تیسرے بیٹے کے مرنیکی خبر آئی تو وہ پڑی روئی لوگوں نے سبب پوچھا تو جواب دیا کہ میرے رونے کی وجہ یہ ہے کہ میرا اب کوئی بیٹا نہ رہا کہ جو ملک اور شہنشاہ پر نثار ہوسکے۔ جاپانی وقت کے بڑے پابند ہیں۔

چنانچہ مسٹر آرنلڈ وائٹ اپنی نایاب کتاب نیو فار ایسٹ میں جاپانی بحری ملازمان کا دیگر ممالک کے ملاحوں سے مقابلہ کرتے ہیں اور اُن کی رائے ہے کہ پابندی وقت چال چلن اور حسن انتظام کے لحاظ سے جاپانی جہازوں کو دیگر طاقتوں کے جہازوں سے بہت کچھ اِمتیاز حاصل ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جس سرعت کے ساتھ جاپان ترقی کر رہا ہے وہ ایسی حیرت انگیز ہے کہ یورپین طاقتوں کو اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ کہیں زمانہ پھر پلٹا نہ کھائے اور یہ مشرقی طاقت یورپ کی شائستگی کو مغلوب نہ کرلے۔ چنانچہ سنہ ۹۵ء میں شہنشاہ جرمن نے ایک تصویر کھچوا کر شہنشاہ روس کی خدمت میں بھیجی اور اس کے نیچے یلو پرل (یعنی خطرہ اقوام زرد رنگ) لکھا۔ اس تصویر میں ایک اونچی چٹان پر فرشتہ میکائیل کھڑا ہوا ہے جس کے ہاتھ میں تیغ شرر افشاں ہے یہ فرشتہ بہت سی خواتین کو نصیحت کر رہا ہے اور اس خطرے سے آگاہ کر رہا ہے جو ایک دریا کی طرف سے وادی کے راستہ سے آرہا ہے۔

چیز۔ آؤ اور ان لوگوں کو دیکھو اور جاکر اپنے منہہ شرم سے اپنے دامن میں چھپاؤ۔ تم سب کے سب فضول اور مسلوب العقل ہو گھر سے باہر نکلنے میں تمہاری ذات جاتی ہے ایک ہزار برس سے جہالت کی تاریکی میں پڑے ہو۔ ایک ہزار برس سے اپنی طاقتیں کھانے پینے کی چھوت پر بحث کرنے میں ضائع کر رہے ہو۔

صدیوں کے سوشل مظالم سے انسانیت کا مادہ تم میں سے جاتا رہا ہے سوچو تو سہی کہ تم نے کیا اور کر رہے ہو۔ سمندر کے ساحلوں پر کتابیں ہاتھ میں لے بیہودہ کر رہے ہو۔ اہل یورپ کے دماغی نتائج کے پریشان فقرے بغیر سمجھے زبان سے کہتے ہو اور تم کو بس صرف اتنی بات تک محدود ہیں کہ تیس روپیہ کی کلرکی مل جائے یا وکیل بن جاؤ جو آجکل ہندوستانی نوجوانوں کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ کیا سمندر میں کافی پانی نہیں ہے کہ تم سب کو تمہاری کتابوں کو اور تمہاری یونیورسٹی کے چوغوں اور ڈگریوں کو ڈبو سکے۔ آؤ مرد بنو اپنے تنگ سوراخوں میں سے نکلو اور دنیا کو دیکھو۔ دیکھو اور قومیں کس طرح ترقی میں آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ کیا تم میں اپنی نوع کی محبت موجود ہے۔ کیا تم میں اپنے ملک کی محبت موجود ہے اگر ہے تو آؤ ہم اعلیٰ اور بہتر چیزوں کے حصول کے لئے کشمکش کریں۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھو خواہ تمہارے عزیزوں اور قرابتیوں کے رونے اور چلانے کی آوازیں تمہارے کان میں آئیں۔ پیچھے نہیں آگے ہی آگے دیکھو ہندوستان کو ضرورت یہ ہے کہ کم از کم ایک ہزار نوجوان قربانی کے لئے تیار ہوں مگر وہ مرد ہوں حیوان نہ ہوں۔ سرکار انگریزی خدا نے تمہاری جہالت دور کرنے کے لئے بھیجی ہے اور مدراس نے سب سے پہلے اسکو جگہ دی۔ اب مدراس کس قدر آدمی پیدا کرسکتا ہے جو خود غرض نہ ہوں اپنا فرض پوری طرح انجام دے سکیں جو ایک نیا رنگ پیدا کریں غریبوں کے ساتھ ہمدردی کرنے بھوکوں کے لئے خوراک مہیا کرنے اور عوام الناس کو روشنی پہنچانے کے لئے کوشش کرنے میں اپنی زندگی صرف کر دیں اور ان لوگوں کو جو اپنے بزرگوں کے نظام کی وجہ سے درجۂ انسانی سے گر کر حیوان ہوگئے ہیں پھر انسان بنادیں

غرب افریقہ

گو سفر آج کل عام چیز ہو چلا ہے۔ تاہم ہندوستان میں بہت کم لوگ ایسے ہونگے جنہوں نے مغربی افریقہ کا عزم کیا ہو۔ کیونکہ علاوہ بُعد المشرقین کے مغربی افریقہ آب و ہوا کے لحاظ سے ناقص خیال کیا جاتا ہے۔ محض سیر و سیاحت کے لئے کوئی وہاں کیوں جانے لگا۔ مگر روزی عجب چیز ہے۔ حال میں ہمارے چند باہمت پنجابی بھائیوں نے وہاں سرکار انگریزی کی ملازمت کے سلسلے میں جانا قبول کیا ان کی جماعت انگلستان سے ہوکر افریقہ گئی ہے۔ اس جماعت میں مخزن کے بہت پرانے خیرخواہ شیخ حاکم شاہ صاحب ہیں۔ ان کا پہلا خط جو مقام سرالیون سے ۱۴۔ مارچ کو لکھا ہوا ہے۔ ہدیہ ناظرین ہے۔ امید ہے کہ ان کی بدولت اس علاقے کے جو دن بدن آباد ہوتا جاتا ہے۔ حالات ہندوستان تک پہنچتے رہینگے۔ تاکہ اگر یہ جماعت وہاں کی آب و ہوا عموماً موافق پائے تو اور لوگوں کو ہمت دلانے اور تشویق کے لئے یہ تحریریں مفید ثابت ہوں:-

۳۔ مارچ سنہ ۱۹۰۶ء کو ہمارا جہاز لورپول سے روانہ ہوا۔ رستہ جہاز کا چونکہ خلیج بسکے کے سامنے سے تھا اور خلیج مذکور کے تلاطم کی شہرت عام ہے۔ اس لیے جہاز لہروں سے متاثر ہوتا چلا آیا اور ناتجربہ کار مسافروں کو ایک گونہ تکلیف محسوس ہوئی۔ مگر بسکے کے چکر سے نکل کر سمندر بالکل ساکن رہا۔ ۹۔ مارچ کو ابھی آٹھ بھی بجنے نہ پائے تھے کہ جہاز نے لاس پامہ کے بندرگاہ میں آ لنگر ڈالا۔ خشکی پر اترنے کے شوق نے ہم سب کو سخت بیقرار کر رکھا تھا۔ مگر دس بجے تک اترنا نہ ہوسکا۔ آخر دس بجے اتر کر ذریعہ ایک بجرے کے کنارے پر پہنچے۔ وہاں سے ٹریم وے میں سوار ہوکر لاس پامہ

میں جا داخل ہوئے۔ یہاں کے رستے وغیرہ دیکھ کر وطن یاد آگیا۔ دیر سے گرد کا نشان نہیں دیکھا تھا مگر اس مقام پر گرد اڑ اڑ کر آنکھوں میں پڑنے لگی۔ سڑکوں کا انتظام خاطرخواہ نہیں ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اچھی ہے نہ زیادہ سردی نہ زیادہ گرمی۔ انگلستان سے بہت لوگ یہاں موسم سرما میں چلے آتے ہیں۔ سردی سے بھی بچ جاتے ہیں اور ایک نئی جگہ کی سیر بھی ہو جاتی ہے۔

شہر لاس پامہ کنیری کا مشہور شہر ہے۔ شہر کی عمارات اچھی ہیں۔ بازار کچھ تنگ نہیں ہیں۔ لاس پامہ جزیرے کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ نہایت پرفضا مقام ہے قدرتی مناظر اور رجائے وقوع کے لحاظ سے یہ مقام بہت اچھا ہے البتہ قدرت نے یہاں کے باشندوں پر ایسی عنایت نہیں کی جیسی یہاں کی سرسبزی سے توقع تھی۔ یہاں کے لوگ گو ایسے بدصورت نہیں ہیں۔ لیکن خوبصورتی سے بھی دور ہیں۔

اس جزیرے کی زمین بہت زرخیز ہے۔ ہر قسم کی پیداوار یہاں ہوتی ہے۔ علاوہ اور چیزوں کے گنا بھی یہاں پیدا ہوتا ہے اور اچھا شیریں ہے۔ مغربی شہروں کی طرح ایک مارکیٹ بنی ہوئی ہے۔ جہاں کل اشیائے خوردنی فروخت ہوتی ہیں۔ یہاں کے لوگ اخلاق میں بھی اچھے نہیں۔ بلکہ بدخلقی تک پہنچے ہوئے ہیں۔ گورنمنٹ کا انتظام بہ حیثیت مجموعی خاصہ ہے۔ یہ جزائر زیر حکومت سپین ہیں۔ چیزیں یہاں ہندوستان کی نسبت بہت گراں ہیں۔ مگر بہ نسبت یورپ یا انگلستان کے یہاں ارزانی ہی سمجھنی چاہئے۔ یہاں کوئی چیز انسانی صنعت کی قابل دید نظر نہ آئی۔ ایک عجائب خانہ تھا۔ لیکن وہ مشاہدہ اس لئے عیب ہے کہ اس میں کچھ بھی نہیں۔ سب سے بہتر عمارت اس شہر میں ایک گرجے کی ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ چند دکانیں اہل ہند کی بھی تھیں۔ جو بمبئی کے رہنے والے ہیں لیکن وہ بدنظمی کی شکایت کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس جگہ سیٹھ معلوم ہوتے اور اس وقت بڑی

خوشی ہوئی۔ جب انہوں نے اپنی اُردو میں پوچھا کہ آپ پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ بس پایہ میں نہ کوئی ہماری زبان سمجھتا تھا۔ نہ ہم کسی کی۔ دونو طرف گنگ۔ سفر میں یہ دفعہ بھی عجیب پڑتا ہے کہ طرفین کو خدا کے ہاں سے زبان دی گئی ہے۔ مگر اختلافِ زبان کے سبب سامنے کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے ہیں گویا حیوان ناطق ہی نہیں ہیں۔

جزائر کینری کے باشندے معلوم ہوتا ہے کہ پیدا تو شرقی کئے گئے تھے مگر مغرب نے بزور بازو انکو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ مردوں کا لباس یورپ کا لباس ہے اور عورتوں کا بھی علیٰ ہذا القیاس۔ لیکن ایک شرقی ۔۔ لی تک باقی ہے کہ یہاں کی عورتیں سر پر کپڑا لیتی ہیں اور رنگ و روغن میں بھی مغربی عورتوں سے ممیز ہو سکتی ہیں۔

لاس پ۔ ۔ کی سیر میں تقریباً چار گھنٹے صرف ہوئے جی تو چاہتا تھا کہ چند روز آدمی یہاں اقامت کرے مگر باگ دوسرے کے ہاتھ میں تھی تین بجے واپس جہاز میں آ گئے اور چار بجے جہاز نے لنگر اٹھایا جزائر کینری سے چلکر سفر نہایت آرام سے ہوا ہے۔ سمندر کہیں متلاطم نہیں ملا۔ برسرن راس ورد کے سامنے جہاز پہنچا۔ یہ راس سی گمبیا کے شرق میں ہے جغرافیہ میں تو راس کی تعریف سب نے پڑھی ہوئی ہے اور نقشہ پر بھی نو کدار سی چیز دیکھی ہوئی ہے مگر آنکھ سے اصل راس کو دیکھنا بالکل مختلف ہے۔ یہاں دیسی لوگ کشتیوں پر سوار ماہی گیری کر رہے تھے۔ یہ کشتیاں خوبصورت بنی ہوئی تھیں اور جب اُن کے سوار ہمارے نزدیک آئے تو اشارے سے سلام کیا۔ ان لوگوں کے لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ تمدن سے خارج نہیں ہیں۔ بعض مقامات پر یوں ہوا۔ کہ یک لخت بڑی بڑی مچھلیاں پانی سے نکلکر جہاز کے ساتھ ساتھ پھلانگیں مارنے لگیں۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ دوڑ میں مقابلہ کر رہی ہیں۔ اور ایک دوسری سے بڑھنا چاہتی ہیں۔ انکے بدن کی صفائی۔ انکی پھرتی اور وہ سہولت جس سے وہ ادھر اُدھر حرکت کرتی تھیں۔ نہایت دلکش و خوش کن تماشا تھا۔

زندۂ جاوید پھول

ناظرین! میں بچپن ہی سے پھولوں کا بڑا شوقین تھا۔ مگر بدقسمتی سے گھر کے صحن کے آگے پھولوں کا کوئی تختہ یا چھوٹا سا گنج نہ تھا جس سے میں اپنی ننھی سی تفریح کو تر و تازہ رکھتا۔ یہ ایک ناخوشگوار سی بات تھی جو مجھ کو ہر وقت مغموم اور افسردہ خاطر بنائے رکھتی تھی۔ ننھی سی جان۔ اور پھولوں کا ارمان۔ اتنی جرات کہاں کہ خود بازار جا کر گل فروشوں کی دوکان سے پھول مول لاؤں اور ان سے اپنا دل بہلاؤں۔ علاوہ اس کے باپ کی شفقت۔ ماں کی محبت اپنے صغیر سن بچے کو گھر سے تنہا باہر نکلنے کی بھلا کب اجازت دے سکتی تھی۔ مجھے کسی خاص قسم کے پھولوں سے رغبت نہ تھی۔ بلکہ میرا تعشق ان کے ساتھ عام تھا۔ میرا دل جیسا چنبیلی کی نازک نازک کلیوں سے مانوس تھا ویسے ہی مجھے گلاب کی ننھی ننھی خوشنما پنکھڑیوں سے بھی محبت تھی۔ میں نہ صرف پھولوں کو دیکھنے کا ہی شائق تھا۔ بلکہ میرے دماغ کو بھی انکی بو سے ایک فطری مناسبت تھی۔ خوش قسمتی سے میرے ہمسایہ میں دو چار مالنیں بھی رہتی تھیں جو میری ماں کو کبھی کبھی پھولوں کے ہار اور گلدستے بنا کر دے جایا کرتی تھیں۔ میں انکو دیکھ کر بے اختیار باغ باغ ہو جاتا۔ اور مارے خوشی کے جامہ میں پھولا نہ سماتا۔ اور انکو لیکر اچھلتا کودتا، ماں کی نظر بچا گھر سے باہر نکل جاتا اور اپنے ہم سن لڑکوں کے ساتھ بڑے شوق سے کلیوں میں کھیلا کرتا۔ بدنصیبی سے اگر میرے ساتھ کے کھلاڑیوں میں سے کوئی شریر بچہ میرے ہاتھ سے انکو چھین لیتا۔ تو میرے نازک دل کو سخت صدمہ پہنچتا اور میں نہایت آزردہ دلی اور مایوسی کے ساتھ روتا چیختا گھر کو واپس آتا۔ میری ماں مجھ پر بڑی شفیق تھی۔ مجھ کو غمگین اور مضطرب پا کر بازار سے پھولوں کے ہار فوراً منگوا دیتی اور میں انکو لے کر پھر اپنے چھوٹے چھوٹے رفیقوں

کے ساتھ کھیل میں مشغول ہو جاتا۔ مگر۔ آہ! یہ چھوٹا سا مشغلہ اس قابل نہ تھا جس سے میں اپنے شوق کی پیاس کو جی بھر کر بجھا سکتا۔ کیونکہ مجھ کو تو اس بات کی دھن تھی کہ سوتے جاگتے۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ ہر وقت پھولوں کا ایک تر و تازہ چمن میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں کسی لمحہ اور کسی ساعت بھی انکو اپنی نگاہ سے جُدا کرنا نہ چاہتا تھا۔ اور مجھے اُن کی مفارقت نہایت ہی شاق اور ناگوار تھی۔ شفیق باپ نے جب اپنے کمسن نونہال کو اوائل ہی سے پھولوں کا بےطرح شیدا پایا تو گلاب کے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے پودے لا کر صحن میں لگا دیئے۔ جن میں کچھ دنوں بعد متعدد پھول آنے لگے۔ مگر اُن سے میری سیری نہ ہوئی۔ کیونکہ اُن کی بہار دیرپا اور مستقل نہ تھی۔ وہ بہت جلد کملا جاتے تھے۔ مئی کی جھلجلاتی ہوئی دوپہر کی ناقابل برداشت دھوپ۔ اور بادِ سموم کے تند تند جھونکے۔ یہ دو ایسے قوی اسباب تھے جو بہت جلد اُن کے مسکراتے ہوئے چہروں کو پژمردہ کر دیتے تھے۔ اور وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں سکوڑ کر مایوسی کے عالم میں ہمیشہ کے لئے سرنگوں ہو جاتے۔ مجھ کو یہ گوارا نہ تھا کہ بیچارا اس چھوٹی سی غیر ذی رُوح معصوم مخلوق کے ساتھ ایسا بُرا برتاؤ کرے اور میری تفریح کے مشغلے میں مخل ہو۔ اس خیال سے میں اور بھی رنجیدہ خاطر رہنے لگا۔ اور مجھ کو اب پھولوں کے کسی ایسے زندۂ جاوید تختہ کی تلاش ہوئی جس کی بہار ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے تر و تازہ رہے۔ اور جس کی شگفتگی پر بےرحم زمانہ کا غاصب ہاتھ اثر نہ کر سکے۔ مہربان باپ نے جب دیکھا کہ ننھا بچہ ہر وقت ملول اور اُداس رہتا ہے۔ اور باوجود ان دلچسپ قدرتی مشاغل کے اُس کا سودا روز بروز بڑھتا جاتا ہے تو میری دلبستگی کے لئے مختلف قسم کے سامان مہیا کیے۔ شہر کے بساطیوں کی دوکانوں سے کتنے ہی رنگ برنگے گلدستے اور انواع و اقسام کے گلدان منگوا کر میرے کمرے میں جابجا آویزاں کر دیئے۔ میری چھوٹی سی میز کو مختلف قسم کے گل بوٹوں سے سجایا۔

میری ماں بھی حتی الامکان میری دلجوئی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھی۔ کبھی میرے دل بہلانے کے لئے میری قبا کے دامن پر گلاب کا کوئی خوشنما پھول کاڑھتی۔ کبھی کاغذ کے گل بوٹے تراشتی۔ میرا دل ان سے بہلاتی۔ مگر مجھ کو انکی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ یہ قدرتی شوق کا دریا جو خدا نخواستہ اس قدر تنگ دل کو نہ تھا۔ جس کو چند انسانی صنعت کے تراشے ہوئے مصنوعی پھول اپنے اوچھے دامن میں ڈھک لیتے۔ مجھ کو تو کچھ سودا ہی اور تھا۔ پھر بھلا ایسے پست و حقیر چیزوں سے شغل کا میرے دل پر کب اثر ہو سکتا تھا۔ قطع نظر اسکے مجھ کو ابتدا ہی سے تصنع سے نفرت تھی اور میرے دل و دماغ فطرتاً مصنوعی اشیاء کی بیہودہ نمود اور ظاہری زرق برق سے سخت متنفر تھے۔ میں تو فطرت کے کسی ایسے دلکش مگر مستقل نظارہ کا ہوا خواہ تھا جو ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ بالجملہ اب مجھ کو بقا کے پھولوں کی جستجو تھی۔ مگر ایسے زندۂ جاوید پھولوں کا ایک فانی کے لئے ہاتھ آنا اور وہ بھی علی الخصوص اس ناپایدار دنیا میں جو بجائے خود فنا کا مرکز ہے اور جس میں ایک ایک منٹ پر مادی اشیاء کی ہیئت اور ان کے اجزا کی ترکیب و ساخت میں بیشمار تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں کوئی آسان بات نہ تھی۔ آپ جانتے ہیں چھوٹے بچے کا شوق بڑا ہوتا ہے اور پھر اس پر ناکامی۔ یہ ایک ایسا نکیلا کانٹا تھا جو ہر وقت نشتر بنکر میرے جگر میں کھٹکا کرتا اور مجھ کو کسی پہلو چین نہ لینے دیتا تھا۔ میں اپنی کامیابی کے لئے کتنے ہی خیالی منصوبے باندھا کرتا اور میرے ننھے سے دماغ میں مختلف خیال گونجتے رہتے تھے۔ مگر بے سود۔ قصہ مختصر کمبخت شوق کی ناکامی بلا سے بے درمان سی بنکر کچھ ایسی پیچھے پڑی کہ تھوڑے ہی دنوں میں چھوٹے بچے کو بستر علالت پر لٹا دیا۔ میرے رخساروں کی سرخی جاتی رہی۔ ذرا سا منہ نکل آیا۔ اور اس غم میں گھل گھل کر تابوت سے بدتر ہو گیا۔ میرے والدین نے بفائدہ میری تسلی اور تشفی کی کوشش کی۔ نہ کہیں سے مجھ کو زندہ جاوید پھول

ہاتھ آئے۔ نہ میرے قلب ناشکیب کو تسکین ہوئی۔ میرا سودا نہ گیا پر نہ گیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں شام کے وقت اپنی خوابگاہ میں ایک بلند سی کرسی پر بیٹھا میری آنکھ پر آہستہ آہستہ پنکھا جھلتی جاتی تھی۔ قریب ہی ایک چھوٹی سی میز پر گلدستے کے پھولوں نے گلدستے کے گلدانوں میں رکھے تھے۔ جو اپنی دلفریبی سے پاس ہی کی کشش کے ساتھ بے اختیار دل کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ مگر میرا دل اب ان سے بالکل ہٹ گیا تھا۔ کیونکہ مجھ پر ان کی بے ثباتی کی حقیقت بخوبی کھل چکی تھی۔ اور ان کی دھوپ میں کملا جانے والی پتیوں سے انکی ناپائداری کا سبق سیکھ چکا تھا مجھ کو یقین ہوگیا تھا کہ ان کا ظاہری حسن ایک دھوکا ہے۔ اور کسی بازیگر کے تماشے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ نہیں معلوم اپنی اس ناپائداری پر بھی یہ گلدستے کتنی نازک مزاج نوجوان کے دل پر جو میری طرح زندہ جاوید پھولوں کا جویا نہ ہوتا کیونکر قبضہ کر لیتے۔ مگر میرے دل میں تو اب انکی ذرا بھی قدر و منزلت نہ تھی اور انکو نہایت حقارت و حسرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ میں انکی بے ثبات ہستی کا خیال کر کے انکی قسمت پر افسوس کر رہا تھا کہ اتنے میں میری آنکھ لگ گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ شہر سے کچھ فاصلے پر کسی پرفضا وادی کے دامن میں ایک آبشار بڑی دلفریبی کے ساتھ بہ رہا ہے۔ پانی کی صاف شفاف ہموار سطح پر کتنے ہی کنول کے پھول شگفتہ ہیں۔ جن پر آفتاب کی ہلکی ہلکی کرنیں بڑی نظر فریبی کے ساتھ اپنا نورانی عکس ڈال رہی ہیں۔ پھر آنکھ اٹھا کر غور سے جو دیکھا تو انکی نرم و نازک لچکدار ٹہنیوں پر کتنے ہی پانی کے سانپ لپٹے نظر آئے جنکی پیٹھ پر رنگ برنگے خوشنما داغ اور چتیاں پڑی تھیں۔ اور جو دیکھنے میں بہت ہی بھلے لگتے تھے۔ یہ خدا کی مخلوق ایسی چھوٹی تھی کہ ایک غائر نگاہ بھی اسکو بدقت محسوس کر سکتی تھی۔ آبشار

کی ایک جانب تماشائیوں کا جم غفیر نظر آتا تھا اور دوسری جانب ایک سہانا خوشگوار کُنج آنکھوں کے سامنے تھا جس کا نظارہ بے اختیار دل پر سحر و افسوں کا کام کر رہا تھا اور جس میں رنگا رنگ پھول کھل رہے تھے جن کے تر و تازہ اور شگفتہ چہرے دیکھنے والوں کو دور سے اشارے کر رہے تھے کہ انکی اچھوتی صباحت اور قدرتی نفاست کو ابھی زمانہ نے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ اور ان کا دامن رنگ انقلاب کے بدنما دھبوں سے بے لوث ہے جیسا کسی معصوم بچے کا دل دنیا کی نجاست اور معصیت کے رنگ سے پاک و صاف ہوتا ہے۔ مجھ کو ایسے خوبصورت پھول دیکھنے کا اس سے پہلے کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ انکی بہار آنکھوں کو بہت ہی بھلی لگی۔ اور مجھ کو یقین ہو گیا کہ جن پھولوں کی مجھ کو تلاش تھی وہ غالباً یہی ہیں۔ میں اُن کی طرف ٹکٹکی باندھے بڑے شوق سے دیکھ رہا تھا مگر ان کا ہاتھ آنا غیر ممکن تھا۔ کیونکہ وہ مجھ سے بہت دور تھے اور بیچ میں پانی کی دیوار حائل تھی۔ اس چھوٹے سے کُنج میں کتنے ہی سبزپوش خضر صورت بزرگوار بھی ٹہل رہے تھے جن کے سروں پر پھولوں کی خوشنما کلغیاں اور طُرّے لٹکتے تھے۔ اور جن کے مقدس نورانی چہرے روحانی نیکیوں کی صیقل سے مجلّیٰ نظر آتے تھے۔ ان کے متین اور سنجیدہ قدموں کی رفتار اس بات کی بیّن دلیل تھی۔ کہ انہوں نے اعلیٰ درجہ کی عاقلانہ احتیاط اور صابرانہ استقلال کے ساتھ اس خطرناک آبشار کو عبور کر کے آپ کو اس کنج تک امن و حفاظت کے ساتھ پہنچایا ہے اور جواب اپنی پچھلی جانفشانیوں اور عرق ریزیوں کے صلے میں ان نایاب پھولوں کی گلگشت سے متمتع اور بہرہ یاب ہو رہے ہیں۔ میں اس دلچسپ تفریح میں ہمہ تن مصروف تھا کہ یکایک ہوا کے جھونکوں کی سنسناہٹ اور پتوں کی کھڑکھڑاہٹ نے میری محویت کے رُخ کو بدل دیا اور میری نگاہ پھسل کر یک بیک مقابل کی صف پر جا پڑی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو تماشائیوں کے مجمع میں سے کتنے ہی خوش رُو جوان سطح آب پر تیرتے

دکھائی دیئے۔ جن کے نوخیز اور بے ریش چہروں سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ ابھی دنیا میں داخل ہوئے ہیں۔ اور زمانہ کے نشیب و فراز۔ پست و بلند۔ اوج و حضیض سے بالکل ناآشنا اور نابلد ہیں۔ تقاضائے سن بتا رہا تھا کہ ابھی انکو دنیا میں طمانیت اور فراغت کے ساتھ ایک کامیاب عملی زندگی بسر کرنے کے لئے بیشمار تجارب اور مشاہدات کی ضرورت ہے۔ انکے دماغوں کے فانوس تعلیم کی برقی روشنی سے تو ضرور متجلی تھے۔ مگر ابھی ان تجربہ نے پالش نہیں کی۔ انکے قدم بعینہ زندگی کے دشوار گذار زینے کی اُن خطرناک سیڑھیوں پر تھے جہاں زمانہ کی ٹھوکر اس سے پہلے کتنے ہی غیر محتاط۔ ناعاقبت اندیش عیاش طبع نوجوانوں کو دھکیل کر نکبت میں گرا چکی تھی۔ دنیا کی کتنی ہی غیر مفید بلکہ مضر نفسانی خواہشیں اُن کے ذہن سے بات نا کہانی کی طرح بیٹھی تھیں۔ اس وقت اُن پر ایک عجیب محویت کا عالم طاری تھا اور ایک غیر معمولی جوش و خروش کے ساتھ کنول کے پھول توڑنے کو جو پانی میں شگفتہ تھے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ اُن کی نگاہیں ایسی عمیق اور بیپروا تھیں جو سطح آب سے گذر کر سامنے والے کنج تک آپ کو امن و عافیت پہنچاتیں اور اُن خوشنما پھولوں کی گل چینی سے حظ اٹھاتی تھیں۔ حقیقت الامر تو یہ ہے کہ وہ اپنی محویت میں کچھ ایسے کھوئے گئے تھے کہ اُنکو ان پھولوں کا نشان و گمان بھی نہ تھا۔ وہ خفتہ صورت بزرگوار جو سامنے کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے اُنکی بدقسمتی پر تاسف کرتے ہوئے اُنکو آنے والے خطرہ سے متنبہ کرتے اور باآواز بلند کہتے جاتے تھے کہ خبردار ان پھولوں کو ہاتھ نہ لگانا ان میں سانپ ہیں۔ مگر اُن کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی تھی اور اُن کی جانب برابر بڑھتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ اب بالکل قریب پہنچ گئے اور پھول چننے میں مشغول ہو گئے۔ ابھی مشکل سے دو چار پھول توڑے ہونگے۔ کہ سانپوں نے اُنکو کاٹنا شروع کیا اور اُنکے زہر سے متاثر ہو کر پانی میں غرق ہونے لگے۔ ہرچند ہاتھ پاؤں مارے اُچھلنے کی کوشش کی۔ مگر اب کیا

ہو سکتا تھا۔ پانی کی پریاں ہمیشہ کے لئے انکو اپنے آغوش میں لے کر بیٹھ گئیں اور اس طرح ان کی آرزوئیں اور تمام امیدیں جو ان پھولوں کے ساتھ وابستہ تھیں پانی پھر گیا۔ ناظرین! میں نے اس عبرت ناک سین سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مارے وحشت کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میری آنکھ یکایک کھل گئی۔ اب جو آنکھیں مل کر دیکھا تو نہ وہ آبشار تھا نہ وہ سہانا کنج نہ وہ تماشائیوں کا انبوہ نہ وہ وادی میں تھا اور میرا کمرہ۔ میری دایہ بھی مجھ کو تنہا سوتا چھوڑ کر کسی ضرورت سے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اب میں تنہائی میں اپنے خواب کی تعبیر پر غور کرنے لگا اور بہت دیر نہ گذری تھی کہ مجھ پر اس کی حقیقت کھل گئی۔

وہ آبشار ہماری زندگی کا سرچشمہ تھا اور پانی کی سطح پر جو کنول کے پھول شگفتہ تھے اور جن پر رنگ برنگے سانپ لپٹے تھے وہ دنیا کے کیسے ہی دلفریب مگر مہلک نظارے تھے۔ جن کا دلکش سین بہت جلد نوجوانوں کو اپنا فریفتہ بنا کر شہوت۔ معصیت۔ بدی۔ شرارت اور فسق و فجور کے چاہ ہلاکت میں گرا دیتا ہے۔ وہ خضر صورت بزرگوار جو سامنے والے کنج میں دکھائی دیتے تھے اور جن کے سروں پر پھولوں کی خوشنما کلغیاں اور طرے مزین تھے۔ وہ محب قوم مشاہیر ہیں جنہوں نے اعلیٰ درجہ کی مرتاض نفس کشی۔ محتاط ریاضت۔ غیر معمولی انضباط طبیعت اور پرجوش ہمت کے ساتھ زندگی کے پرخطر بحر زخار سے گذرتے ہوئے قومی اور ملکی خدمات کو بڑی سرگرمی اور جانبازی کے ساتھ انجام دیا ہے اور جن کے فرق پر انکی بےغرضانہ حب وطنی اور بے لوث جانبازی کے صلے میں بالآخر شہرت عام اور بقائے دوام کے زندہ جاوید پھولوں کے تاج رکھے گئے۔

اے میرے بھولے بھالے نوجوانو! اگر تم کو بقا کے پھولوں کی جستجو ہے اگر تم چاہتے ہو کہ ان روشن دماغ۔ عالی خیال مشاہیر کی طرح زمانہ تمہارے سر پر بھی زندہ

جاوید پھولوں کے تاج رکھے اگر تمہاری آرزو ہے کہ تم کو بھی ان بزرگواروں کے پہلو بہ پہلو آسایش گاہ فنا کے کنج میں (جس سے میری مراد حیات جاوید ہے) جگہ ملے۔ تو اُٹھو اور فنا ہونے والی شے کے گرویدہ کرنے والے تعیش انگیز نظاروں اور شہوت انگیز تفریحوں کو، جو تمہاری ترقی کے پردہ میں سدراہ ہیں اور تم کو فاسقانہ زندگی کے ہلاکت راستوں میں پھسانے والی ہیں، بالائے طاق رکھ کر زندگی کے آبشار کو پامردی اور احتیاط کے ساتھ عبور کرو۔ اگر تم دُنیا کی غیر ضروری اور حقیقت آمیز دلچسپیوں کے دامن کو بالکل نہ چھوڑو گے اور یونہی چند روزہ عیش و نشاط کے طالب ہو گے تو یاد رکھو کہ تمہارا بھی ویسا ہی دردناک انجام ہو گا جیسا کہ ان بدنصیب نوجوانوں کا ہوا ہے جنہوں نے گلوں کے پھولوں کی ظاہری خوشنمائی پر فریفتہ ہو کر اپنی بیش بہا جانیں لطمہ امواج فنا کے نذر کر دیں۔ اور داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر ہمیشہ کے لئے گمنامی کے پردہ میں روپوش ہو گئے۔

اے یاران نشاط۔ یاد رکھو کہ دُنیا کا کوئی دلکش سین قابل التفات نہیں اور یہاں کی ساری تفریحیں اور مشغلے یہیں رہ جائیں گے۔ ان چیزوں کو اس زندگی سے بہت کم مناسبت ہے جو ہم کو ایک ایسی رُوحانی دُنیا میں تنہا بسر کرنی پڑیگی۔ جہاں زن و فرزند کی محبت۔ دنیوی عیش و عشرت۔ شان و شوکت اور مال و دولت ان میں سے کوئی بھی کام نہ آئیگا۔ دیکھو ایک نازک خیال شاعر دُنیا کی بے ثباتی کے مضمون کو چند دردناک اشعار میں کس خوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔

ہاں بدر شو ز عالم فانی — ہوس دل درد چہ میرانی
ظاہر اگرچہ ہست نقش و نگار — باطنش جملہ ہست ویرانی
دیگراں آمدند و بگذشتند — چند روزے تو نیز مہمانی

(سرور جہان آبادی)

اُردو خطوط نویسی

تعلیم و تہذیب نے جہاں اور امور میں تراش خراش کی ہے اُردو خطوط نویسی کی رسوم کو بھی نہیں سلامت چھوڑا۔ ترقی یافتہ دماغ بغیر کسی کے سمجھائے بوجھائے خطوط نویسی کی طرز میں عجیب عجیب جدتیں پیدا کر رہے ہیں۔ یہ جدتیں بعض اوقات مختصر پرانے القاب کی صورت میں نظر آتی ہیں اور بعض اوقات ان میں اہل یورپ کی تقلید پائی جاتی ہے۔ پرانے القاب پہلے زمانے میں خواہ کتنے ہی شاندار اور معقول ثابت ہوئے ہوں۔ موجودہ زمانے کی عقل و تہذیب کے موافق ضرور قابلِ ترمیم ہیں۔

ایک عام مشاہدے کی اور ہر قوم و ملت کی مانی ہوئی بات ہے کہ اجانب کے ساتھ برتاؤ ہمیشہ تکلف اور ادب کے ساتھ ہوتا ہے اور اقارب کے ساتھ تکلف اور ادب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اجانب کے معاملات میں سوائے ادب و لحاظ کے کلمات کے محبت کے خیالات ظاہر کرنا نہ صرف غیر ضروری بلکہ سخت نامناسب ہے اِس لئے کہ ایسی صورت میں اظہارِ محبت محض بناوٹ سمجھا جائیگا۔ مگر اقارب کے معاملات میں چونکہ اجانب کی سی مغائرت کی بو تک نہ ہونی چاہئے۔ اِس لئے تکلفات و آداب کا خیال رکھنا واقعی غیر مستحسن ہے۔ ایسی صورت میں بجائے تکلفات و آداب کے اظہارِ محبت کرنا لازم ہے جو دراصل ابنائے جنس کے تعلق کی بنیاد ہے۔ سچ پوچھئے تو کُل انسانی تعلقات و معاملات میں اظہارِ محبت ہونا چاہئے۔ مگر جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے اجانب کے ساتھ اس کا عمل ضرورۃً ترک کر دیا گیا ہے۔

متقدّمین حضرات نے اجانب کے لئے جو القاب تجویز کئے ہیں اُن کے

موزون ہونے میں کچھ کلام نہیں مگر چونکہ اُن میں طوالت اور شاعری زیادہ ہے اس لئے روزمرہ کے استعمال کے لئے مناسب نہیں معلوم ہوتے، البتہ اُن میں سے کئی ایک قابل قدر ہیں کہ بعد اختصار و ترمیم استعمال میں لائے جائیں۔ اقارب کے لئے جو قدیم القاب مقرر ہیں اُن میں خلافِ اصول موضوعہ عجب گڈمڈ پائی جاتی ہے۔ باپ یا کوئی اور بڑے رشتے والا جب بیٹے یا کسی خورد سے خطاب کرے گا تو ہمیشہ محبت آمیز ہوگا مگر برعکس اس کے جب بیٹا یا خورد اپنے باپ یا کسی بزرگ سے کچھ کہنا چاہے گا تو ہمیشہ بے تکلف اور باادب ہو کر کہیگا اور جہاں تک ممکن ہوگا بجائے محبت کے کلمات کے عزت و ادب کے الفاظ زبان سے نکالیگا۔ یورپ کے طرزِ تحریر و اندازِ گفتگو میں اصول مذکورہ کی پوری پوری پابندی ہے۔

ذیل میں ہم رواجاتِ انگریزی کو ملحوظ رکھ کر القابات کی ایک فہرست درج کرتے ہیں

القاب اجانب کے لئے

(۱) بہت بڑے آدمیوں کے لئے۔ اعلیٰ حضرت۔ حضرت۔ حضرت اقدس۔ حضور والا۔ حضور۔

متکلم ایسی صورت میں اپنے لئے۔ "فدوی" "کمترین خادم۔ عاجز" کے الفاظ کہے گا۔

تحفہ سلام ان القابات کے ساتھ جائز نہیں

(۲) ان سے درجہ کم رتبہ والوں کے لئے:۔ جناب عالی۔ بندہ نواز۔ بندہ پرور۔

متکلم ایسی صورت میں اپنے لئے:۔ کمترین کا لفظ استعمال کریگا۔

تحفہ سلام ان القابات کے ساتھ بھی مناسب نہیں۔

(۳) ان سے بھی کم رتبہ اشخاص کے لئے:۔ جناب من۔ جناب بندہ۔

متکلم ایسی صورت میں اپنے تئیں بندہ یا خاکسار کہیگا۔

سلام اس صورت میں بھی جائز نہیں۔

(۴) معمولی درجہ رتبہ اجانب کے لئے جن سے کچھ شناسائی ہو۔ مخدومی و مطاعی۔ مخدومی۔ مخدوم بندہ

متکلم کے لیے لفظ خادم یا نیازمند۔

تحفہ سلام تسلیم بصد نیاز۔

مخاطب کے خط کے لئے لفظ عالی نامہ۔ والا نامہ۔

(۵) معمولی درجہ کے لوگوں کے لئے جن سے زیادہ شناسائی ہو مکرم و معظم بندہ۔ مکرمی و معظمی مکرم بندہ۔

متکلم کے لئے لفظ خیر خواہ۔ کمال خیراندیش۔ خیر طلب۔

تحفہ [illegible] تسلیم بصد تعظیم یا آداب۔

مخاطب کے خط کے لئے لفظ گرامی نامہ۔

(۶) احباب کیلئے جن سے اور بھی زیادہ شناسائی ہو۔ کرم فرمائے بندہ۔ عنایت فرمائے بندہ۔ الطاف فرمائے بندہ۔ کرم گستر مشفقی

متکلم کے لئے لفظ عقیدتمند۔ ارادتمند۔

تحفہ سلام — تسلیم۔

مخاطب کے خط کے لئے لفظ عنایت نامہ۔

القاب احباب کے لئے

(۱) اچھے خاصے دوستوں کے لئے:۔ میرے پیارے مہربان۔ میرے پیارے میرزا صاحب میر صاحب وغیرہ۔

متکلم کے لئے لفظ۔ مخلص (صادق)۔

تحفہ سلام — السلام علیکم یا سلمکم اللہ الرحمٰن

خط — اخلاص نامہ۔

(۲) گاڑھے دوستوں کے لئے۔ (دیکھئے القاب اقارب)

القاب اقارب کے لئے

بزرگ کی طرف سے خورد کو:۔

عزیزی - عزیز قدر - عزیز من - نور چشم - قرۃ العین - میرے پیارے فلاں - برادر عزیز - برادر یکجان برابر - میرے عزیز - جان من - میری جان (حسب موقعہ) -

تحفہ سلام - جیتے رہو - سلامت رہو - خوش و خورم رہو - تمہیں اللہ کی امان - (بطور قافیہ میری جان) -

متکلم کے لئے لفظ - ترقی خواہ -

مخاطب کے خط کے لئے لفظ محبت نامہ -

ب - خورد کی طرف سے بزرگ کو: -

ابا جان - اماں جان - بھائی جان - آپا جان - باجی جان -

تحفہ سلام - خدا آپ کو سلامت رکھے - خوش و خورم رکھے -

متکلم کے لئے لفظ - فرماں بردار - فرماں پذیر -

مخاطب کے خط کے لئے لفظ - محبت نامہ - شفقت نامہ

ج - برابر والے کی طرف سے برابر والے کو: -

میرے عزیز - عزیزی - جان من میری جان (بیوی کیلئے استعمال ہو سکتے ہیں)

تحفہ سلام - سلامت رہو - خوش و خورم رہو - سلمکم الحفیظ -

متکلم کے لئے لفظ - مشتاق - پابند محبت - اسیر محبت - محب حقیقی ازلی صادق - دلدادہ - جاں نثار - فدائی - شیدا (حسب ضرورت)

مخاطب کے خط کے لئے لفظ - محبت نامہ -

فائدہ - متکلم کے لئے جو لفظ تجویز کئے گئے ہیں اُن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ خط کے تمام مضمون میں انہی سے کام لیا جائے - خاتمہ پر صرف ایک دفعہ کا استعمال عموماً کافی ہو سکتا ہے -

"آپ" اور "تم" کا فرق بدستورِ سابق۔

خطوط کی شکل تحریر کا جو طرز انگریزی ہے اُس سے بہتر اُردو کے لئے (بہ تغیر جزوی) دوسرا طرز مشکل ہے۔

نامِ مقام جانب چپ کو گوشہ کی طرف لکھنا چاہئیے۔ تاریخ جانب چپ گوشہ کی طرف نام مقام کے نیچے۔ القاب معہ تحیتہ وسلام۔ جانب چپ کو تھوڑا سا حصہ کاغذ چھوڑ کر جس طرح نئے قطعہ عبارت (پیراگراف) کو لکھا کرتے ہیں۔ یا اس سے بہتر شروع ہیں اور مضمونِ خط کا آغاز اس کے نیچے سطر بہ سطر۔ ...

خاتمہ۔ (نیازمند۔ مخلص۔ بندہ وغیرہ یہ خاتمہ کے الفاظ ہیں) آخر میں جانب چپ نزا گوشہ کی طرف۔ اور اس کے نیچے نویسندہ کا نام۔

(نمونہ)

لاہور
۲۲۔ اگست سنہ ۱۹۰۵ء

میرے عزیز سلمکم الحفیظ

محبت نامہ ملا..............................

....

....

مشتاق
بشیر

پتہ سب سے اوپر

سرنامہ الفاظ بغرض عرض

بعالیخدمت والا درجت
بخدمت شریف
بعالی ملاحظہ
بملاحظہ
بمطالعہ

} علی قدر مراتب مضمون سرنامہ سے اوپر شروع میں ایک سطر صرف ان الفاظ کے لئے چھوڑ کر

(نمونہ)

لکھنؤ گولا گنج۔

بعالیخدمت
مخدومی و مطاعی ا۔ ب۔ ج صاحب وغیرہ وغیرہ ...... } سید نذیر حسین

انقلاباتِ روزگار

بریں رواقِ زبرجد بجامۂ خورشید | نگاشتہ سخن خوش بہ آبِ زر دیدم
کہ اے بدولت دو روزہ گشتہ مغرور | مباش غرہ کہ از تو بزرگ تر دیدم
شہے کہ تاجِ مرصع صباح بر سر داشت | نمازِ شام ورا خشت زیرِ سر دیدم
ز حادثاتِ جہانم ہمیں پسند آمد | کہ خوب و زشت و بد و نیک درگذر دیدم

دنیا میں جس قدر تغیرات ہوتے ہیں اور انقلابات پے در پے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اُن سے ہر کلام میں ایک معقول حصہ اس کے لئے وقف رہا ہے۔ مگر فارسی کے شعراء نے زیادہ تر ان پر غور و فکر سے کام لیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اُنکے کلام بسا اوقات اس درجہ دردناک اثر دل پر چھوڑتے ہیں کہ دُنیا آنکھوں میں دھواں دھواں ہی نظر آنے لگتی ہے اور ہماری زندگی ایک بے وقعت حباب۔ پس ایک حباب کی طاقت لہروں اور موجوں کے روبرو کیا ہو سکتی ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہی آسمان اور یہی زمین۔ یہی چاندنی کے لطف اور یہی موسمِ بہار۔ یہی آفتاب کی کرن اور یہی ارمان بھری برسات ہزارہا برس سے پرلطف رہی اور ہمیشہ رہیگی۔ نسلیں گذر جاوینگی۔ ایک فرقہ مٹ کر دوسرا زور پکڑیگا۔ ایک کے بگڑنے سے دوسرا آباد ہوگا۔ ایک کے دل ہی میں ارمان رہجاوینگے اور وُہ دُنیا سے چل بسیگا مگر دُنیا اور اُس کے متعلقین اپنی رفتار پر چلے جاوینگے۔ گویا کہ وُہ ویسے ہی تازہ ہیں جیسے کہ بوقت پیدائش تھے۔ اگر خود انسان اپنی زندگی پر ذرا غور کرے اور فہم سلیم سے کام لے تو خود اُن حالات سے اس قدر سبق ملیں گے جو اسکو بہت کچھ سمجھا دینگے کہ وہ کس قدر بے وقعت ہے اور کس قدر لاچار۔ انسان موٹر کار پر سوار ہوتا ہے

اور اس کی رفتار پر خوش اور خنداں ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے چالیس میل تک فی گھنٹہ راستہ طے کر سکتا ہے۔ ریل پر تو اس سے بھی زیادہ تیز اور بہت سے ہمراہیوں کے ساتھ راستہ طے کرتا ہے۔ انسان تار پر ایک ایک منٹ کی خبریں منگا سکتا ہے اور یہاں تک نوبت پہنچی ہے حال کی ایجادات پر کہ مرنے والے عزیز کے آخری کلمات کو فونوگراف میں بند کر کے اس کی یادگار اپنے پاس رکھ سکتا ہے مگر پھر بھی باوصف ان بےشمار ترقیوں کے کیا انقلاباتِ عظیم اور تغیراتِ کثیر میں کوئی کمی ہوئی ہے؟ انسان پھر بھی مثل ایک نادان بچہ کے ہے کہ جو چند دل افزا کھلونوں سے خوش ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ بہت بڑی کائنات اس کے لئے ہیں۔ حالانکہ محض کھیل تماشے کے چند کھلونے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ آجکل کے تغیرات اور پرانے زمانہ کے تغیرات میں فرق ہے اور بہت بڑا فرق۔ سعدیؒ کے زمانہ میں جو تغیرات ہوئے ان سے وزیرزادے بقول ان کے ایک ادنیٰ درجے کے افراد سے بھی نیچے ہو گئے اور ادنیٰ ان کی جگہ آ بیٹھے۔ یہ ثمرہ طوائف الملوکی کا ہوا جو اب کمتر وقوع میں آتا ہے مگر پھر بھی یہ کس کو اتفاق ہے کہ ہمارے چند دن کے دیکھتے دیکھتے وہ شریف خاندان اور وہ امیرزادے جو شہر اور ممالک میں بطور مثال پیش ہوتے تھے اب وہ مشکل سے کچہری میں اہلمدی کے درجہ پر ہیں اور مشکل سے پیٹ پالتے ہیں۔ اور جو خاندان کہ زیر و ذلیل تھے وہ بڑھ کر یا جس طور سے اب ممکن ہے صاحبِ اقتدار اور باوقعت و باثروت ان کے خاندان کی میراث یا جائداد کا جو حشر ہوا یا ہوتا ہے وہ تو ایک طویل داستان ہے۔ مگر اس میں کیا شک ہے کہ یہی انقلاب ہر وقت اور ہر لمحہ لاکھوں صورتوں میں ہمارے آس پاس ہوتے رہتے ہیں اور بسا اوقات ہم کو خبر بھی نہیں ہوتی ہے کہ کیا ہوا یا کیا نہ ہوا۔ "بادشاہی" اور "تاجِ مرصع" تو نہ ہمارے سر پہ ہے جو ہم اس کے مرنے کو جائیں یا اس کے کھو جانے پر ملال کریں مگر ہم یہ کر سکتے ہیں

ذ بعض بدنصیب لوگ جو کسی کے ساتھ جائز محبت کو "تاج مرصّع" سے کم ہرگز نہیں تصور کرتے تھے اور اس کے موجود ہونے کو تاج مرصّع سے کم باعث ناز و فخر نہیں جانتے تھے اُن کی حالت ہماری نظروں کے سامنے ہے جب اُن کا لعل جاتا رہا اور اس کا ہونا گویا کہ بادشاہی چھن جانے سے کم پُر ملال اُن کے لئے نہ ہوا۔

ہم کو اُن پر ہنسی آتی ہے کہ وہ اس قدر دل کے بودے نکلے اور اس قدر بیوقوف اور محبت کے اندھے۔ مگر جو چاہو سو کہو لو وہ بجنسہ مثل ایک بلبل کے صاحب نعمت و تاج کے ہیں جس کی نگاہ برابر نہیں رہتی اور جس کی ساری اُمیدیں ٹوٹ ہو کر اس کو غمگین ہمیشہ کے لئے بنا گئیں۔ تاج محبت میں عظمت تھی عزت تھی پر راحت نہیں۔ مال و متاع تھا پر اطمینان نہیں۔ غرض تمام باتیں تھیں مگر محبت کے نشہ میں وہ عافیت و راحت۔ اطمینان اور صلابت سب کے مزے چکھتا تھا اور اس کے علاوہ ایک خاص قلبی راحت پاتا تھا جو ابنصیب ہیں اور بہ خاص مسرت تھی جو اب فرشتے کو اور ترساتی ہے۔ اب تو نہ موتی کا سکہ چلتا ہے نہ نوکرانی۔ یہ تو اصلی انقلاب ہے اور دراصل ان مشکلات میں ضبط اور قائم رہنے پر ہماری داد ہے۔

غرضکہ دُنیا میں انواع واقسام کے انقلابات ہیں۔ ایک سے ایک بڑا مثلاً گھر لٹ جاوے گھر برباد ہو جاوے دولت جمع ہو کر برباد ہو جاوے۔ خاندان کی عزت مٹی میں مل جاوے ذلت اور عزت پر پانی پھر جاوے۔ عزت کے بدلے ذلت ہو۔ وقعت کے بدلے بیجا تعظیم کے بدلے رسوائی۔ یہ سب کچھ مگر ان میں انسان کی ارادی قوت کو بہت کچھ دخل ہے۔ ذلت کے بعد پھر عزت حاصل کر و گو کہ بعد خیلے دشواری یہ ہوگا گھر پھر سے بنا لو مال پھر سے جمع کر لو۔ مگر وہ بدنصیب کہاں سے اور کس چیز سے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑوں کو جوڑے۔ یہ سچ ہے کہ نعم البدل لوگ کہہ کر اُمید دلا دینگے مگر یہ یاد رکھ لینا

چاہیئے کہ ہر چیز کا نعم البدل نہیں ہُوا کرتا ہے۔ ہم کو تو خُدا کی بے نیازی پر جان سو بار قربان کرنا پڑتی ہے۔ جو رحیم و کریم ہے اور پھر بھی وُہ ظاہراً ظلم اور ستم کرتا ہے جس سے عرصہ دراز تک کے لئے اس کے حقیر بندے کے دل و جگر پارہ پارہ ہو جائیں۔ گو وُہ بے نیاز ہے۔ یہ ظلم ہے تو صرف ہماری نفسانیت سے۔ اپنی خود غرضی سے اور اس جُرم کی سزا ہے کہ کیوں ہم نے دل اس قدر زیادہ لگایا کہ جو غیر معمولی ہو۔ یا کہ دُنیا کو دُنیا فانی نہیں جانا اور اگر جانا بھی تو اس کو دل سے مانا نہیں۔

غرضکہ تغیرات ظاہری تو بڑے ہوں یا چھوٹے مگر جو دل سے تعلق رکھتے یا جو دل پر کارگر ہوتے ہیں۔ وُہ تمام ظاہری تغیرات سے عظیم تر ہوتے ہیں اور نہایت سخت اثر۔ یہ تو ہم مانتے ہیں کہ اس قدر کلام کا نتیجہ عملی صُورت میں کچھ نہیں نکلا۔ اور محض زبانی گفتگو رہی اگر کچھ بھی نتیجہ ہو سکتا ہے تو اس سے زیادہ نہیں ہے کہ جو انقلابات یا تغیرات ذاتی ارادے سے متعلق ہوں یعنی کہ جو آفات انسان کے رکھے رکیں انکو ضرور عاقبت بین بنکر روکو مگر وہ آفات جن سے مفر نہیں اور جو کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی ہیں اُن کا علاج اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

اپنی عزت یا خاندان کی وقعت یا اپنی قوم کی حُرمت تو انسان کے سنبھالے سنبھلیں مگر دوست کی جُدائی۔ عزیز کی مفارقت جس سے دل پارہ پارہ ہو وہ کس کے ٹالے ٹلے اور کس کے سنبھالے سنبھلے۔

ایشیا کے باشندے تو محبت کے میدان میں بازی جیت چکے ہیں اور محبت کے زعم میں ستی کی رسم ایک عام رسم ہندوستان میں تھی۔ یورپ والے اپنے خیال میں جو چاہے سمجھا کریں۔ مگر زن و شوہر میں جس قدر اتحاد ہونا ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ممالک میں ممکن ہے اس سے زیادہ یورپ میں نہیں ہے یعنی کہ سارے وسائل موجود ہیں اور روزمرہ کے تجربہ میں بھی آتے رہتے ہیں۔ اور اس قسم کی ہزاروں

مثالیں ہیں - عورت کی محبت اگر واقعی محبت ہو تو بہت دیرپا کہی گئی ہے - مگر ہم کو دو چار ہندوستانی مسلمان ایسے ملے جو اپنی بیوی کی محبت میں ہزاروں یورپین سے آگے اور اُنہوں نے بیوی کی مفارقت کے بعد اس قدر سوگ کیا جو اصلی مفارقت کا غم کہا جا سکتا ہے -

ممکن ہے کہ اس قدر انہماک در محبت کا شدید بخار ہندوستان کی زنانہ خصلت کا نمونہ ہو - مگر اصلیت تو یہ ہے کہ محبت والا دل بچپن کی محبت سچی محبت - پاک محبت اور جائز محبت جسکو برسوں بعد والدین نے اعتراف کر کے حبیب اور محبوب کو ملایا ہو اور پھر دونوں کا ایک خاص مدعا پر نگاہ رکھ کر ساتھ چلنا اور اس عرصہ میں علیحدگی یہ کس قدر عظیم صدمہ ہے -

اے زمانے ! اپنی چال چلا جا - اپنے منہہ پر پردہ ڈالے رہ اور جو ہم سے تجھے جاننا چاہے اُسے بھی اپنی اصلی صورت نہ دکھا - کیونکہ تیرا نقاب دراصل اللہ کی رحمت ہے کہ ہم مصیبت سے لاعلم ہو کر اُس پر سے گذر جاتے ہیں - گو ہم ہزاروں کل ایجاد کریں اور سینکڑوں کو ردی کر دیں - گو آج کا لکھا ہوا کل غلط ثابت کریں - مگر پھر بھی تیری صورت نہ جانیں اور نہ کبھی جان سکیں - اور اگر بفرضِ محال جانیں تو خودخودکشی کر کے تباہ ہوں - یا معاذ اللہ کیا کیا نوبت پہنچے - تو اگر کچھ بنتا ہے جو بڑی ٹھوکر کھا کر جاننا پڑا ہے وہ صرف یہ ہے کہ انسان کی محبت انسان کے ساتھ ایک حد تک جائز ہے جہانتک کہ محبت اپنے قبضۂ قدرت میں رہے اور اُس کے آگے ناجائز - جو کچھ بھی ہو انسان کی بے قدری اور اُس کی لاچاری آگے پیچھے سے اُسے گھیرے ہوئے ہے +

شاہ منیر عالم

آئینے سے چار آنکھ ہوئی - تو جوگی کا یہ بھید ملا

ہے ہے! اس مہوش کے سر میں اک پہلا بال سفید ملا

گو عمر ڈھلی تھی لیکن پھر بھی سرخی تھی رخساروں پر چکنائی گالوں پر چھائی - یا روغن تھا انگاروں پر

جو گیسو چوٹ کیا کرتے تھے کاکل کے بیماروں پر تھے جتنے خال سیہ تن میں سب جیسے ناگن تھے ماروں پر

چہرہ اترا تھا - غیظ چڑھا تھا - لرزہ تن میں آیا تھا

غم چاند سے رخ پر چھایا تھا - یہ چاند گہن میں آیا تھا

کہتی تھی ہر کراہ الٰہی یہ کیا ستیاناس ہوا! جو سنبل نافہ عنبر تھا - وہ سنبل آخر گھاس ہوا!

یہ مشک مرا کافور بنا - دل آج اسیر یاس ہوا لالے ہونگے کالے بالوں کے - اب یہ نیا وسواس ہوا

جو زلف رسا کہلاتی تھی - کیا اب وہ رسن کہلائیگی؟

کیا آج جوانی چل نکلی؟ کیا اب سے ضعیفی آئیگی؟

وہ گیسو جو ہمراہ ہوا کے - ناگن سے لہراتے تھے وہ بال جو بچپن میں بکھرے پر اژدر ناگن کہلاتے تھے

وہ بال بلا کے جنکے بل پر پیچ ہزاروں کھاتے تھے انکی خوبی میں بل آیا! جیسے سب بل بل جاتے تھے؟

اڑ جائے! نگوڑی پیری - مجھ کو دینے داغ جگر آئی!

اس میری شام جوانی کی کیا اتنی جلد سحر آئی!

اس لٹ میں دنیا لٹکی تھی - اور دار اسی کو کہتی تھی مخلوق اسی کی ماری تھی اور مار اسی کو کہتی تھی

گل مار پھرے مارے مارے - خونخوار اسکو کہتی تھی مشکیں - آشفتہ - سرکش - سنبل بار اسکو کہتی تھی

جس جوبن پر مغرور تھی میں وہ آخر کار نہ کام آیا!

سر کا اک بال سفید ہوا اور مرنے کا پیغام آیا!

کافر اس حلقے میں پھنسکر زنار اسی کو کہتے تھے نافہ - عنبر - ظلمات - ختن - تاتار اسکو کہتے تھے

اچھے اچھے اسیر مکر - بیمار اسی کو کہتے تھے جادوگر - پرفن - پیچیدہ - طرار اسکو کہتے تھے

وہ کونسا ایسا دل تھا جو اس بحر میں غرق نہ تھا؟

اس دام میں کتنے اُلجھے تھے اور اس میں سر مو فرق نہ تھا

میں باغ گئی تو نرگس مجھ سے دم بھر آنکھ لڑا نہ سکی
کوئی بلبل میری نغمہ سنجی کے مقابل آ نہ سکی
سوسن کی زباں تعریف کی میری تاب ذرا لا نہ سکی
دانتوں سے میرے پیش کبھی نسترون کسی کی جا نہ سکی

دانا بھی میرے حُسنِ ادا کا شیدا تھا دیوانہ تھا
وہ گیسو دام تھے جن میں ہر رخسار کا ہر تل دانا تھا

کیا بال کا بندھا حُسن مرا اب چلنے کو تیار ہوا!
کیا چوٹی کے جوبن کو میرے سرتن سے انکار ہوا
یا رب یہ کیا ہر تال آیا کس دشمن کا دیدار ہوا
جو میرے سر پر چڑھکر میری خوبی کا آزار ہوا

ہیہات غضب! کیا مجھ کو کہیگا شوخ نگار نہ اب کوئی!
افسوس ستم! کیا مجھ کو کریگا دل سے پیار نہ اب کوئی!

کچھ سوچ کے دل کو ڈھارس دی - پھر یہ سخن لب پر لائی
میں طاق ہوں اب بھی حسن میں میرے شان میں کیا خفت آئی
نادان ہو خیال خام مجھے - ناحق کو طبیعت گھبرائی
اک بال جو پکا بھی تو کیا - موجود ہوا اب بھی رعنائی!

خورشید کو دعویٰ حُسن کا ہو تو چرخ سے آج اُتر آئے
مہتاب کو غرہ ہو تو میرے آگے آئے - اِدھر آئے

ناگاہ ندائے غیب آئی - "ہاں اے مہوش بیزار نہ ہو
رفتار زمانہ دیکھ کے چل اسکی شاکی زنہار نہ ہو
گلزار جہاں میں کونسا گل ہے جو مرجھا کر خار نہ ہو
تو دل کو اپنے ڈھارس دے - بیکار الم میں خوار نہ ہو

جب زیست گھٹی - اور عمر بڑھی - تو آمد بڑائی پائیگی
جو خام خرد کہلاتی تھی وہ پختہ سر کہلائیگی

جو غازہ تیری زینت تھا - اب سونپ دے وہ اپنی دختر کو
اپنے افشاں کے حسن دے اپنے بہو کے چہرہ انور کو
اولاد کو اپنی پہنا دے تو اپنے سارے زیور کو
اب دیکھ نہ زینتِ ابرو کو - اب دیکھ تو اپنے گھر بھر کو

بیٹی بہوؤں میں بڑائی کا یہ تجھ کو آج نوید ملا
اے مہوش کیا غم ہے سر میں گر پہلا بال سفید ملا"

(۱) کنیز بی بی
محمد بخش بیرسٹر

مٹّی کا پیالہ اور آئیس پروف گلاس

ہنس کے ساغرِ بلّور نے اک دن یہ کہا　　کیوں میاں مٹّی کے پیالے! یہ نکھرنا کیسا؟

تم کو جب دیکھتا ہوں زہر ہی نظر آتے ہو　　خشک ہیں ہونٹ مگر پانی پیئے جاتے ہو

پانی اک نعمتِ معبود ہے کیا پاک و لطیف　　اُس سے ہر وقت ترا دِق میں رہو تم سا کثیف

توبہ توبہ! یہ ذرا بھی نہیں بھاتا مجھ کو　　انہیں باتوں پہ بہت غصہ ہے آتا مجھ کو

جنسِ اعلیٰ ہوں میں شربت کا مزا اور ہی تھا　　مرا حصہ ہے کہ آئینۂ رخسار ہوں میں

پانی مجھ میں جو پئیں لوگ تو جھلکے اچھا　　رنگ لاتی ہے مئے ناب اُچھلکے اچھا

مجھ میں جو شے ہو اُسے دیتا ہوں میں گنی تاب　　جسکا میں ظرف ہوں کیا کہتے ہیں کیا اسکا جواب

صاف باطن ہوں کدورت سے میں گھبراتا ہوں　　اک ذرا سی بھی ہو کالک تو دکھا جاتا ہوں

پھول سا ہلکا ہوں صد باعثِ نازش ہوں میں　　خاک تودہ ہے تو - پر کالۂ آتش ہوں میں

تم یہ اس شکل و شمائل جو مری ریس کرو　　یہ حماقت نہیں تو کیا ہے ذرا بولو تو

بھاڑ سا منہہ ہے - یہ بدروپ قطع بے ہنگم　　بوجھ بھی خیر سے ادھ سیرے کا ہے کم سے کم

نازنینوں کو کبھی آپ پہ رغبت بھی نہ آئے　　ہاتھ دُکھ جائیں جو دو چار دفعہ ہاتھ لگائے

گرد جو بیٹھ گئی منہہ پہ اُٹھائے نہ اُٹھے　　مَیل جو جم گیا چہرے پہ چھٹائے نہ چھُٹے

ساتھ والوں کو بھی اپنا سا کئے جاتے ہو　　جس جگہ رکھے ہو اُس چیز کو شرماتے ہو

تم سے بہتر ہے جو ہو کاسۂ چوبیں کی ہوس　　اور پھر خیر سے رکھو لبِ لعلیں کی ہوس

کنڑی میڈ تمہیں کہتی ہے دُنیا ساری　　ڈھیلے سے بڑھ کے لگائے نہ کوئی بیوپاری

بھیک کا ٹھیکرہ ہے آپ کا مشہور لقب　　ولد الجاریۃ انجب - انجب - انجب

آن پڑتے پہ ہے ہم چشمی کا دعویٰ مجھ سے　　جاؤ اب ڈوب مرو منہہ نہ دکھانا پھر کے

جھنکے پیالے نے کہا واہ جی خوش خوب کہا — بھائی صاحب مری جانب سے عبث ہو غصا
گالیاں دینی شریفوں میں ہیں معیوب بہت — خود بخود چھیڑ کا اچھا ہی یہ اسلوب بہت
آپ جلتے ہیں جلا کیجئے جُوتی سے مری — کہ نتیجہ ہے سدا رشک و حسد کا یہ ہی
آپ کی طرح سے ایسا بھی تو نازک نہ بنے — کہ ذرا ٹھیس لگی اور ہوئے دو ٹکڑے
یہ تنک ظرفیاں کیا خوب ہیں اے نیک اساس — کریں لبریز تو مشکل سے بجھے ایک ہی پیاس
ٹوٹ جاؤ تو چُبھو ہاتھوں میں بھی پاؤں میں بھی — ساتھ آرام کے تکلیف بھی مضمر رکھی
آپ جن خوبیوں پہ مشفق من سمجھے ہیں — عقلمند اُنکو نمائش ہی کہا کرتے ہیں
خرچ ہی خرچ ہے مالک کا خریداری سے — چار دن بھی تو نہیں ٹکتے ہو دشواری سے
برف جب تک نہ ہو پانی کا مزا کچھ بھی نہیں — ظاہری شان ہو تم اس کے سوا کچھ بھی نہیں
تم کو ہے غیر ولایت سے بنا کر بھیجا — میں اسی ہند کی ہوں خاک جناب والا
ہمکو ہے حُبِ وطن اُنکے تو دل سے پوچھو — ذرہ ذرہ ہے مرا مہر منور اُن کو
سوندھی سوندھی مری خوشبو ہے تو ٹھنڈا پانی — اسی مٹی سے ہوا کرتا ہے میٹھا پانی
سانولا پن مجھے مرغوب ہے ہندی ہوں جناب — آپ گورے ہیں تو گوروں ہی کو بلوائیں شراب

آغا شاعر قزلباش دہلوی

نظم قومی

(جو انجمن حمایت اسلام لاہور کے گذشتہ اجلاس میں پڑھی گئی)

مقام عبرت ہے ہو دیدۂ گردوں - ذرا بصیرت کی آنکھ وا کر — فلک کے پردوں میں ساز کیا ہے - کبھی تو یہ راگنی سنا کر
ہے کیسا یہ انقلاب جاں میں زماں ہے ساز مکاں ہے یاری — نہ اس سے خاک بچا نہ رہی - فلک پہ پہنچا زمیں پہ چھا کر

کہیں بلندی کہیں ہے پستی۔ یہی ہے رمزِ فنا و ہستی ۔۔۔ اِسے اُبھارا اُسے دبا کر۔ اِسے جگایا اُسے سُلا کر

جبل میں دریا میں گلستاں میں۔ سمک میں ماہی میں انس و جاں میں ۔۔۔ سدا قوی اور ناتواں میں۔ رہا تنازعہ جہاں میں آکر

ہے مصر کا گاہ دورِ دوراں۔ ہے گاہ یونان کا فر و اقبال ۔۔۔ کبھی ہے ایراں کبھی ہے توراں۔ گئی ہے سب نوبتیں بجا کر

کل ایشیا کی تھی کامرانی۔ ہے آج یورپ کی لنترانی ۔۔۔ غرض یوں ہی دورِ آسمانی بگاڑتا ہے بنا بنا کر

خدا کی عادت رہی سدا لَا یُغَیِّرُ اللّٰہُ مَا بِقَوْمٍ ۔۔۔ مگر بدلتی رہی ہیں قومیں عمل کی پاداش اپنی پا کر

یہ بحرِ مواج کے تھپیڑے۔ ڈبوتے ہیں غافلوں کے بیڑے ۔۔۔ ہیں پہنچے ساحل پہ اہلِ ہمت طلب کے چپو چلا چلا کر

کئے جوانوں نے دشت رنگیں۔ لیے بلا کے حصارِ سنگیں ۔۔۔ لہو کے دریا بہا بہا کر۔ سروں کی بھینٹیں چڑھا چڑھا کر

جو قوم سے لو لگا رہے ہیں۔ وہ نقدِ جاں تک لٹا رہے ہیں ۔۔۔ وہ کاخِ ملت بنا رہے ہیں۔ بنائیں اپنے گھروں کی ڈھا کر

ہیں جنکے سینوں میں دل پھڑکتے۔ وہ مشکلوں سے نہیں جھجکتے ۔۔۔ ہیں مثلِ پروانہ سر پٹکتے۔ وہ عشق میں بال و پر جلا کر

ہیں راہرو گرتے پڑتے جاتے۔ رہِ ترقی میں بڑھتے جاتے ۔۔۔ ہیں بامِ دولت پہ چڑھتے جاتے۔ کمندِ ہمت لگا لگا کر

الٰہی خیر اپنے قافلے کی نہیں جسے فکر مرحلے کی ۔۔۔ یہ مستِ خواب اب بھی سو رہے ہیں تھکے ہیں سب انکو جگا جگا کر

کچھ ایسی قسمت ہے انکی پھوٹی۔ کہ اوجِ عزت کی آس ٹوٹی ۔۔۔ ابھی تو شاخِ مراد سے یہ۔ گرے ہیں جھولے جھلا جھلا کر

یہ دولت و ملک و کامرانی۔ تو سب ہے اک چیز آنی جانی ۔۔۔ مگر یہ سیلاب کی روانی۔ تو لے گئی دین و دل بہا کر

دلوں میں اپنے نہاں ہیں کینے۔ بھرے ہیں بغض و حسد سے سینے ۔۔۔ یہ رہ گئے قوم کے دفینے۔ وہ گنجِ الفت لٹا لٹا کر

ہے رہنما انکا زور ہر سو۔ ہے پیشوا انکا شور ہر سو ۔۔۔ بنا ہے کیا کیا طلسمِ کثرت۔ وہ رنگِ وحدت مٹا مٹا کر

رہو گے اس دار و گیرِ دوراں میں۔ ہمدمو مستِ خواب کب تک

نبھے گی امواجِ جانستاں میں۔ یہ آن بانِ حباب کب تک

خدا کی رحمت ہو اہلِ دل پر۔ جو قوم کا غم ہیں کھانے والے ۔۔۔ مجالس اسکی سجانے والے۔ سفر کی زحمت اٹھانے والے

ہیں صدرِ بزم اپنے فخرِ ملت۔ وہ ملتوں کی ملانے والے ۔۔۔ بہار بار آور بیخ تن کی۔ کدورتوں کو مٹانے والے

سدا رہا انکا فیض جاری۔ ہے شاکرِ لطف قوم ساری ۔۔۔ الٰہی انکو بنائے رکھیو۔ ہماری بگڑی بنانے والے

فضیل الفاضلین دہلی۔ وہ اکمل الکاملین دہلی ۔۔۔ کلامِ حق کی دکھا کے مشعل۔ دلوں کی ظلمت گنوانے والے

اور دنیا میں کہاں ہیں ایسے بے دام غلام　　ایسے کم قیمت سپاہی مفت کے صف شکن

ہم تمہارے ہر رنج و راحت کے شریک حال ہیں　　بے صلہ بے مزد بے اجرت ہیں تیرے غمگسار

جس طرح چاہا ہمیں تو نے دبایا رات دن　　جس طرف تو نے چلایا ہم چلے بے عذر و عار

ہم تو تیرے واسطے اک موم کی سی ناک ہیں　　پھر گئے تو نے جدھر پھیرا بشکل راہوار

ہم نے شک کی آنکھ سے تجھ کو کبھی دیکھا نہیں　　تیرے فرزندوں نے لیکن کر دیا کچھ ہوشیار

تو ہی کہدے فیصلہ قانون قدرت کا ہے کیا؟　　جب وفادار کو سمجھیگا کوئی بے اعتبار

قدرتی انجام کیا اس اختلاف حال کا؟　　آخرش کوئی ہمارا بھی تو ہے پروردگار

کیا گوارا ہے تجھے بربادی خاک عزیز؟　　کیا پسند طبع ہے اب کشتنی چشم و غبار!

ہم کو امیدیں بہت ہیں تجھ سے اے یار قدیم　　تو گل امید کو چبھنے نہ دیگی نوک خار

تو ہمارے درد دل کی تہ کو پہنچیگی ضرور　　ہم ہیں اے برطانیہ تیرے رفیق جاں نثار

میرا وطن کونسا ہے؟

ذیل کے بند ایک طویل نظم سے انتخاب کئے گئے ہیں۔ ان اشعار کا خاص جوہر حب وطن اتحاد اہل وطن اور دلسوزی۔

فوق السما ہے جسکی عظمت کا تھا ستارہ　　شوکت کا جسکی بجتا تھا چار سو نقارہ

علم و ہنر کا جس نے تھامے رکھا اجارہ　　تہذیب کا ہے جسکی دنیا یہ گوشوارہ

افسوس اے عزیزو! میرا وطن وہی ہے؟

جسکی گذشتہ دولت اب ہوگئی فسانہ　　کہتا ہے نیم وحشی اب جس کو سب زمانہ

ہے جس جگہ امیروں کا ساگ پات کھانا　　اور ہے ہوا غریبوں کا محض آب و دانہ

افسوس اے عزیزو! میرا وطن وہی ہے؟

جس ملک کی زمیں گو وادی پر فضا ہے　　پر تخم کینہ جس میں پھلتا ہے پھولتا ہے

پانی کے بغیر جینا مرنا ہی ہو رہا ہے ۔ اور اس جگہ میں ان کا ہی قحط چار سو ہے

افسوس اے عزیزو! میرا وطن وہی ہے!

جس ملک میں عزیزو اے کاش کوئی ہوتا ۔ ہر نامیوں کے دھبے جو منہ سے اُگل دیتا

یعنی کہ جو انگور اس میں بوتا ۔ اور انکے سینچنے کو آنکھوں سے خوں رلاتا

افسوس اے عزیزو! میرا وطن وہی ہے!

غزل

غنچۂ گل سے بھرے ہیں جیب و دامان بہار ۔ پہنچی ہیں گلبن کی شاخیں تا گریبان بہار

فرش گل پر اس کے موتی بچھائی ہے صبا ۔ کس گل رعنا کی خاطر ہے یہ سامان بہار

بھر دیا کس نے گلستاں میں یہ آزادی کا جوش ۔ آنکھ جس گل کی کھلی بن بیٹھا سلطان بہار

کھیلتی پھرتی ہیں نکہت کی پریاں چار سو ۔ ملک گل ہے زیر فرمان سلیمان بہار

ہر گلی کوچہ ہے گلستان کا بازار مصر ۔ نکلا ہے چاہ عدم سے ماہ کنعان بہار

ہو گئی مجنوں یہ لیلیٰ آپ اپنے حسن پر ۔ تا بداماں پہنچا ہے چاک گریبان بہار

کھینچ کر پہلو میں چھپا کر اپنے دل کو اہل دل ۔ چھین لیگا نالۂ مرغ سحر خوان بہار

گھر میں کیا بیٹھا ہے تو او زاہد تنہا نشیں ۔ کنج عزلت چھوڑ کر بن مرد میدان بہار

پھول جگنو بن گئے ہیں تیرہ کنج باغ میں ۔ جگمگاتا ہے ستاروں سے شبستان بہار

پتے پتے بوٹے بوٹے کو ہے گلشن میں خبر ۔ مجھ پہ شیدا ہے بہار اور میں ہوں قربان بہار

ہے بہار طفل دل عہد کردہ جو خزاں ۔ ہاتھ سے جانے نہ دیگا اپنے دامان بہار

بند دیگی بارش خیں مٹی کر جائیگی کیچ ۔ چار دن کے سبزہ و گل بھی ہیں مہمان بہار

ہیں نجفی برق زمیں پر شاعرانِ پُر ہنر

اُٹھ نہیں سکتا ہے صادق بار احسان بہار

عرق ماءاللحم انگوری

اور

درازئی عمر

یہ تازہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ دو بزرگ ہم عہدہ دار جو اتفاق حسنہ سے ایک ہی محلہ میں مقیم تھے ایک ہی مرض میں مبتلا تھے ضعف دماغ اور تاریکی چشم سر کا گھومنا چکرانا تھوڑی کام کر دل پر تناؤ بیس منٹ دو چار گھنٹہ بیٹھ کر کام کرنا پڑے تو سر درد ہو جانا بھوک کا بند ہو جانا اتفاق ان دونوں کبھی گھر میں تخلیہ کا موقع ملا تو صبح کو کوفت اعضا شکنی معلوم ہونا چارپائی سے اٹھنے کو دل چاہنا ایک صاحب نے عرق ماءاللحم کا استعمال شروع کیا اور دوسرے صاحب نے مختلف معالجہ ڈاکٹروں حکیموں کا کرتے رہے چند دنوں بعد عرق پینے والے کا رنگ روسرخ ہو گیا اور زردی چہرہ دور ہو کر گال جو پچکے ہوئے تھے پُر ہو کر رنگ چمکنے لگا تو دوسرے مختلف ادویہ کھانے والے کو دوست نے بڑے تعجب سے پوچھا یار کیا بات ہے تم تو چار بجے کے بعد سات بجے تک کچہری میں کام کرتے رہتے ہو صبح دم دیکھو سویرے ہی اٹھ کر پھر ہوا خوری کیلئے تیار ہو یہ ماجرا کیا ہے اس نے کہا بات یہ ہے کہ میں **عرق ماءاللحم انگوری دو آتشہ** ساختہ حکیم غلام نبی لاہوری پیا کرتا ہوں چنانچہ وہ سن کر نہ رہ سکا جھٹ تار دیا عرق بھیجدو +

اب ان ڈپٹی کلکٹر کا سارٹیفکٹ ملاحظہ کیجئے جس نے سول سرجنوں اور معزز ڈاکٹروں کا علاج کیا اور ناکامیاب رہے دیکھئے وہ کیا کہتا ہے۔ ادھ آنہ کا ٹکٹ بھیجکر سارٹیفکٹ صحت یافتہ اصحاب کے بھیجدونگا قیمت فی بوتل ۱۲؍ تین بوتل ۳ چھ بوتل ۵ فی درجن ۱۰ بذریعہ ریل منگانے میں محصول کی رعایت ہوگی ریلوے اسٹیشن ... بذریعہ ڈاک منگوانے میں ... محصول ڈاک مشتری کے ذمہ ہوگی

پتہ: **حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکماء لاہور موچی دروازہ اخوان منزل**

٦

ممیرے کا سرمہ

پیٹنٹ (رجسٹرڈ) اور مصدقہ جناب اسسٹنٹ سرجن کرنل انسپکٹر جنرل صاحب بہادر آف گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریز میڈیکل کالج کے پروفیسروں نامور ڈاکٹروں والیان ریاست اور ولایت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ یورپین ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ یہ سرمہ امراض ذیل کیلئے اکسیر ہے ضعف بصارت تاریکی چشم۔ دھند جالا پروال غبار ڈھلکا سرخی پھولا ابتدائی موتیا بند۔ پانی بہنا خارش وغیرہ معزز ڈاکٹر اور حکیم بجائے اور ادویہ کے آنکھ کے مریضوں پر اب اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں چند روز کے استعمال سے بینائی بہت بڑھ جاتی ہے۔ اور عینک کے استعمال کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔ بچے سے لیکر بوڑھے تک کو یہ سرمہ یکساں مفید ہے قیمت بہت کم رکھی ہے کہ عام و خاص اس سرمہ سے فایدہ اٹھا سکیں قیمت فی تولہ جو سال بھر کیلئے کافی ہے مبلغ میرے کا سرمہ سفید اعلیٰ قسم فی تولہ مبلغ ۱۰ روپیہ ہے خالص ممیرے ناشتہ مصری سرمہ فی تولہ ۸ علاوہ خرچ ڈاک

المشتہر پروفیسر مہا سنگھ اہلووالیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور

ان سے بڑھکر اور کیا معتبر شہادت ہو سکتی ہے

(۱) میں نے ممیرے کا سرمہ مسٹر مہا سنگھ اہلووالیہ کا تیار کیا ہوا ان مریضوں پر جنکی آنکھیں بہت کمزور تھیں استعمال کرایا۔ نہایت مفید پایا میری رائے میں خاصکر ان مریضوں کو جنکی آنکھوں سے پانی جاری رہتا ہے اور دھند غبار کمزوری نظر ہو یہ سرمہ نہایت ہی مفید ہے +

راقم۔ ڈاکٹر برج لال گھوش ایم اے ایم بی اسسٹنٹ سرجن پروفیسر میڈیکل کالج لاہور دائریکٹر سرجن جنرل ہند

(۲) میں اس امر کی بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ میں نے ممیرے کا سرمہ جو کہ سردار مہا سنگھ اہلووالیہ کا تیار کیا ہوا ہے اپنی زیر علاج کئی ایک قسم کے مریضوں پر استعمال کیا۔ میری سمجھ میں بینائی قائم رکھنے اور آنکھوں کی بیماریوں سے بچنے کے لئے ممیرے کے سرمہ کا استعمال بہت مفید ہے:

راقم: ستان بہادر ڈاکٹر میر شاد ایل ایم ایس اسسٹنٹ سرجن پروفیسر میڈیکل کالج لاہور پنجاب:

پانچ ہزار روپئے انعام — اگر کوئی شخص ممیرے کے سرمہ کی اسناد میں سے جو کہ قریب بیس ہزار کے ہیں ایک کو بھی فرضی ثابت کر دے اسکو مبلغ پانچ ہزار روپیہ انعام دیا جائیگا جو لاہور کے پنجاب بنک میں اسی مطلب کیلئے بتاریخ ۹ مارچ ۱۹۱۰ء سے جمع کیا گیا ہے +

یہ چیک کیسا ہے؟
تجربہ - تجربہ - تجربہ
پنجاب کوآپریٹو بنک لمیٹڈ لاہور
کیا یہ اطمینان کافی نہیں؟
اکسیر عشبہ
اکسیر عشبہ
قیمت شیشی کلاں
شیخ خیر الدین رحیم بخش دواساز
شفاخانہ یونانی ڈلگری لاہور

ڈال رہا تھا۔ فضا میں خاموشی؛ بے پایاں سمندر؛ ڈراؤنی تنہائی؛ وحشت انگیز
سکوت؛ کوئی صدا نہیں، کوئی اثرِ حیات نہیں۔ ایک غیر محدود گہری تنہائی،
ایک عنبر سکون! یہ عالم ہے۔ چاند خاموشی کے ساتھ گویا سوچ رہا ہے، موجیں بھی
سوچ رہی ہیں۔ چاندی کی کرنوں کے سیلاب سے بچا ہوا سایہ سوچ رہا ہے، بادلوں کے
منتشر ٹکڑے بھی سوچ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا، اس خاموشی کا بھید چپکے
چپکے سمندر کے کان میں کہنا چاہتی ہے اور نہیں کہہ سکتی؛ سمندر کا سینہ سانس لینے کی
کوشش کرنا چاہتا ہے، تمام موجودات میں گویا ایک کروٹ لینے کی خواہش معلوم ہوتی
ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بے پایاں مستی اور سکوت میں اگر کہیں سے ذرا سی صدا
بھی آ جائے تو دنیا ہنس پڑے گی، اچھل پڑے گی۔

نسرین نوش [illegible] سمندر کے ریت پر ایک سروِ زریں کی طرح جو زمین پر
گر پڑا ہو لیٹی ہوئی تھی کہ دفعتاً اس میں کچھ حرکت پیدا ہوئی؛ اور وہ نسرین نوش کے عریان سیم
چاند جیسے عریاں جسم پر [illegible] بالوں میں سے گذرنے لگیں۔ اُدھر سلسبیلِ قمر اس کے
بدن پر پڑ رہی تھی، اور چھوٹی چھوٹی موجیں ایک دوسرے کو ہٹاتی آتی تھیں اور اس میں
سے کبھی بالوں میں سے گذرتی تھیں کبھی اس کے گورے بازوؤں سے لپٹتی تھیں کبھی
اس کے بلوریں سینہ سے ملاعبت کرتی تھیں کبھی اس کے ارغوانی پاؤں کو سہلاتی تھیں
اور اس کے بوسے لے لے کر آگے چلی جاتی تھیں، اور پھر لوٹ کر آتی تھیں اور قعرِ بحر
سے موتی لا لا کر اس کے پاؤں پر نثار کر کے نہایت تعظیم و احترام کے ساتھ واپس
جاتی تھیں۔

نسرین نوش ایک پُرلطف تھکن سے، ایک بیہوشی نشے سے آہستہ آہستہ بیدار ہوئی۔
اس کے چاروں طرف جو پریاں ایک ہالہ بنائے کھڑی تھیں انہیں نظر ڈالی، اور اپنے لعل
لبوں سے برقِ تبسم گرا کے کہا: "میری پیٹھ ملو" اس پر چند خادمہ تعمیلِ حکم میں مصروف ہو گئیں،

اور اس کے بعد چند اور پریاں جو ریشمی تولیا، چادر وغیرہ لئے کھڑی تھیں انہوں نے اس کے بازوؤں، سینے، اور پاؤں کو پونچھنا اور بالوں کو سکھانا شروع کیا۔ نسرین نوش بن ناہراہ نسرین کو جو چاند نے اس تاک بنا رکھی تھی دیکھنے اور موجوں کی ارگن کو سننے لگی۔

اتنے میں ایک قسم کی چھوٹی پریاں، صدفِ بحر کی بنی ہوئی نفیریں، اور دف اور سارنگی اور ستار غرضکہ ہر قسم کے ساز لئے ہوئے، نسرین نوش کے گرد آ کھڑی ہوئیں اور ساز بجانے لگیں۔ نسرین نوش اٹھ کھڑی ہوئی اور ماہتاب کی طرف ہاتھ بڑھا کے، اُس رات کے لئے اُسے "خدا حافظ" کہا اور اپنی سہیلیوں کے کبھی کندھوں پر ہاتھ رکھ کے کبھی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے پھولوں سے چھپے ہوئے راستے پر نسیم کی طرح خرام ناز سے چلنا شروع کیا۔ اس وقت پھول جھک جھک کے اُسے سلام کرتے تھے، اور ایک دوسرے سے ٹکرا کر گویا تالیاں بجاتے تھے۔ شبنم اس کے پاؤں چومنے اور روندے جانے کی تمنا سے راستہ میں آ پڑتا تھا۔ نسرین نوش پانچ منٹ تک چلی ہوئی گئی، ایک کاشانہ نور میں داخل ہوئی۔

چاند کا عکس اس محل کی کل دیواروں، اور صحن کے فوارے پر پڑتا تھا، اور اس فوارہ نور سے ایک زمزمۂ روح نواز پیدا ہو رہا تھا۔ حوض کے کنارے لیموں، نارنگی، ترنج کے پودے پھولوں سے لدے ہوئے دماغ کو فرحت دے رہے تھے۔ یہ سب ایک سبزہ زار پر بچھا دی گئیں۔ زبرجد کے طباقوں میں طرح طرح کے کھانے اور میوے، انناس، کیلے، خربوزے، انار، انگور، سیب، شکار کے گوشت، مچھلیاں، لائی گئیں۔ لعل کے پیالوں میں شراب، شربت، گلاب پیئے گئے۔

حوض کے دوسری طرف، ناچنے والیوں، گانے والیوں نے ایک حلقہ باندھا اور رباب، مزمار، بربط، ستار پر نسرین نوش کی حسن و ادا کی تعریف میں قصیدے، غزلیں، ٹھمریاں گانی شروع کیں۔ گانا بھی وہ گانا جو ایک جوئے رواں کی طرح مسلسل تھا۔

ادھر سہیلیوں نے چھیڑ خانی شروع کی، رفتہ رفتہ لالوں، اور اور پھولوں کو پھینک پھینک کے لڑائی شروع ہوئی، اور تھوڑی دیر میں پھولوں سے زخم کھا کھا کے پریاں گرنے لگیں -

لذیذ شراب کے نشہ سے، نسرین نوش ہنستی ہوئی ایک سہیلی کی گود میں گر پڑی، اور اپنے ہونٹ چوس چوس کر، نظر اس طرح دُور دُور ڈالنے لگی گویا عالمِ خیال میں ہے +
سہیلیاں اپنی مالکہ کے ہاتھ چوم چوم کے، اُسکی بالوں کی خوشبو سے دماغ معطر کر کے، شراب کا ایک ایک گھونٹ پینی تھیں +

نشہ کا خمار چڑھنا شروع ہوا تھا کہ ناچنے والیوں کو پھر حکم ہوا - ساز پر پریوں کا ایک خاص ناچ، ایک رقیق، نازک، نورانی ناچ ناچا گیا +

وہ گلابی، چمپئی، دہانی ریشمی ساڑھیاں جو پریوں کے سڈول جسموں سے لپٹی ہوئی تھیں وہ اس ناچ کے چکروں میں طرح طرح کے نئے رنگ پیدا کرتی تھیں، پریاں تیتری کی تیز پرواز کی طرح اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر ٹھمک ٹھمک کے آتی جاتی تھیں۔ کبھی دو ایک دوسرے سے ملیے کبھی علیحدہ ہو جاتیں کبھی دو کے درمیان میں سے تیسری گذر جائے کبھی حلقہ بندھ جائے کبھی ٹوٹ جاتے - اِس ملنے جدا ہونے چکر کھانے سے رنگ اور نور کا اتصال اور اجتماع ایسا مختلف ہوتا جیسے ہشت پہلو شیشے میں سے آفتاب کی کرنیں گذر رہی ہوں - ان پریوں کا تھرک تھرک کے ملنا، پھر تتر بتر ہو جانا، شانوں کا ہلنا، بالوں کا بحر سنبل کی طرح لہرانا، نازک کمروں کا لچکے کھانا، جھک جھک کے دوہرا ہو جانا، یہ سب باتیں سلیس و بلیغ گیتوں سے (جو سازندے پریاں بجا رہی تھیں) ملکر ایک ایسا نشہ آور منظر پیش کرتی تھیں کہ کان موسیقی اور رقص میں تمیز نہیں کر سکتے تھے؛ اور آنکھ نہیں بتا سکتی تھی کہ آیا موسیقی رقص کر رہی ہے، یا رقص نغمہ ساز ہے، کیا ہو رہا ہے +

نسرین نوش، ان تمام توجہات رقص و آہنگ کو، ایک سہیلی صبیح خندہ اس کے زانو پر

نسرین کھڑے ہوئے ایک بے پروا، لاأبالیانہ نگاہ سے دیکھ رہی تھی اور ایسا نظر آتا تھا کہ وہ ان چیزوں کی طرف زیادہ ملتفت نہیں کیونکہ اس کی نگاہ کسی دور نقطہ پر گڑی ہوئی تھی +

ٹیپ ٹاپ، ناچ گانا، ہر رات ان کی سنی تھی اس نے اسکی روح خفتہ کو جگانے یا اس کے دل میں حرکت پیدا کرنے کے لئے یہ کافی نہ تھے +

اس رات محل میں داخل ہوتے ہوا اس کا دل نہ چاہا + اسکی طبیعت میں چاند کو دیکھ دیکھ کر یہ اُمنگ پیدا ہوتی تھی کہ اس کے عروج تک جا کر لیٹ جائے، وہ اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ سہیلیوں نے اسکی طبیعت بہلانے کے لئے لطیفے سنائے۔ بوجھ پہیلیاں کہنی شروع کیں کہ چاند اور ... میں کیسی دوستی ہے، شہد کی مکھیاں پھولوں سے کیا کہا کرتی ہیں، بھونرا چنبیلی کے کان میں کیا بھنبھنایا کرتا ہے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ ان نورانی آنکھوں میں نیند آنی شروع ہوئی۔ اس کے نرم نیند کو سہلا سہلا کے، اُس کے دماغ کو تھپکا تھپکا کر، ہلکے بادلوں کے نیچے دبا گئے ہوئے چاند کو پیش نظر رکھ کے خضاب تعجب ہوکے دیکھ رہے کے، نیند اُسکی آنکھوں میں چپکے سے آگئی اور ان گھنی پلکوں کو ملا دیا +

نسرین نوش کا نیند میں جانا تھا، کہ ناچ بند کر دیا گیا، لطیفے پہیلیاں ختم ہوگئیں + نہ صرف یہ بلکہ فوارے بند ہوگئے، وہ عندلیب جو پنجرے میں بند چہکی گا رہی تھی، چپ ہوگئی، ہوا کی سنسناہٹ بند ہوگئی، تاکہ نسرین نوش آرام سے سوئے۔ تمام رامشگر پریاں، سہیلیاں دبے پاؤں علیحدہ ہوگئیں، گھونگرو آہستہ آہستہ اُتار ڈالے گئے + اتنے میں سفید بازوؤں والی چھوٹی چھوٹی پریاں حلقہ باندھ کے آئیں، اور نسرین نوش کے گرد اُڑنے لگیں + اُن کے پروں سے کوئی آواز نہ نکلتی تھی + یہ پریاں نسرین نوش کی نگہبان تھیں +

دو تین منٹ کے بعد ایک بڑھیا درختوں میں سے نکل کے جریب ٹیکتی ہوئی آہستہ

آہستہ نسرین نوش کے پاس آئی، اور نسرین نوش کے بدن پر جو چادر ڈال دی گئی تھی، اُسے چہرے پر سے ہٹا کر، غور سے دیکھنے لگی + اُس کے سوکھے چہرے پہ آثار خوشی ظاہر ہوئے، "الحمد للہ" کہ کے جیسی آئی تھی ویسی ہی غائب ہو گئی +

یہ نسرین نوش کی ماں تھی + اپنی لڑکی کو نہایت احتیاط، اور بدگمانی سے رکھتی تھی، اور اس طرح ہر شام کو آ کر تحقیقات کرتی تھی۔

یہ معمر عورت سوچا کرتی تھی کہ "میرے بالوں کو سفید کرنے والے، میرے دانتوں کو گرانے والے، میرے چہرے کو خراب کرنے والے یہ مرد ہی تو ہیں، ان کے ظلم ہی تو ہیں! اپنی اولاد کو میں ان مصیبتوں سے بچاؤنگی + اسی لئے میں اس لڑکی کو اس جزیرے میں لائی ہوں + اُسے کھیل تماشے، دل بہلاوے، ہنسی دل لگی، آرائش و نمائش سب کچھ دونگی، لیکن مرد کیا شے ہے یہ نہ جاننے دونگی + وہ فلاکت جس کا نام مرد ہے، اُسے اس کے قریب نہ آنے دونگی؛ لیکن اگر ڈر ہے تو اتنا کہ مجھے اطلاع ہوئے بغیر اس جزیرے میں کوئی مرد آ جائے، بہر حال اس وقت تو میری کُل تدبیریں مکمل ہیں اور میرے دل کو اطمینان ہے"

ماہتاب، دھیما ہو ہو کے، غائب ہو گیا، مگر نسرین نوش کے جسم نازک کو طلوع آفتاب کے سپرد کرتا گیا + سفید بازوؤں والی نگہبان پریاں ہٹ گئیں، اور ان کے بجائے بلبلیں، اور گانے والیاں آ گئیں، جنھوں نے نرم و نازک آواز سے اُسے جگانے کے لئے پیاری پیاری راگنیاں کا شروع کیں + تھوڑی دیر میں نسرین نوش نے اپنی ... آنکھیں کھولیں، اور انگڑائیاں لیتی ہوئی، اور اپنے پریشان بالوں کو سنوارتی ہوئی اُٹھ بیٹھی + پھر ایک صاف شفاف نہر کے کنارے، نیلوفر کے پھولوں کی ایک چوکی پہ جا کر بیٹھ گئی؛ پریاں بھی آ کر اس کے گرد جمع ہو گئیں +

مشاطہ پریوں نے نسرین نوش کا سنگار کیا، نسرین نوش نہر کے صاف پانی میں اپنے عکس جمال کو دیکھ رہی تھی + تیتریاں ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی اُڑ رہی تھیں،

حقیقتاً وادیٔ گل تھی۔ نسرین نوش کی تشریف آوری کی خوشی میں تمام غنچے ایک دم کھل گئے، اور اُن کی خوشبو نکل نکل کے اُس کے جسم کو، کندھوں کو، چہرے کو احاطہ کر کے چومنے لگی۔ نسرین نوش گاڑی سے اُتری: اتنے میں سہیلیاں، نوکرنیاں اور سازندے وغیرہ بھی پہنچ گئیں +

اب نسرین نوش نے اس زمان و مکان لطافت میں آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ سہیلیاں تعظیم اور احترام کے انداز سے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں + اونچے درخت بھی اس ملکۂ ملاحت کے سامنے جھک جھک کر اُس کی خدمت میں پھول پیشکش کرتے تھے اور نسرین نوش ان پھولوں کو اپنے اُن پیارے ہاتھوں سے (جن میں اور پھولوں میں صرف اس قدر فرق تھا کہ یہ پھولوں سے زیادہ خوبصورت تھے) چھو چھو کر سہیلیوں کو ایک عظمت آمیز نیم غمزہ سے حکم کرتی تھی کہ انہیں توڑ لو۔ زہرہ جبیں گل چکاں کی گود ان پھولوں سے بھر گئی + ان پھولوں کا ایک تاج بنایا گیا جسے نسرین نوش نے پہنا۔ غرضکہ اس طرح نسیم صبح کے ساتھ، اور نسیم صبح کی مانند سب آہستہ آہستہ چل کے ایک اونچے موقع پر پہنچیں جو مطلع آفتاب کے مقابل تھا۔ نسرین نوش کھڑی ہو کر آفتاب کی طرف جھکی اور پھر سیدھی ہو گئی۔ ازاں بعد اپنے ہاتھ کو چوم کر گویا سورج کو ایک بوسہ بھیجا + یہ ایک آئین آفتاب پرستی تھا + اس بوسہ کے بھیجتے ہی سہیلیاں ہنس ہنس کے دوڑ دوڑ کے، ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کے، بالوں میں پھول لگا لگا کے، ہاتھوں میں پھولوں کے پنکھے ہلا ہلا کے، نازک کمروں کو بل دے دے کر، آنکھوں کو شرارت سے پھرا پھرا کے، نسرین نوش کے گرد چکر لگانے لگیں + پھر کھڑی ہو کر آفتاب کی شان میں گانے لگیں + پھر ان سب نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر، کبھی ہوا میں اُڑ اُڑ کر کبھی زمین پر پاؤں مار کے آفتاب کے لئے ایک مستانہ ناچ ناچا، اور ایک دلربا گانا گایا + اس گلبانگ رقص و آہنگ

کھلتا ہوا پتّا

اس کی صناعیاں اس کی دستکاری اس کی رنگیلی طبیعت اور ایک سے دُوسرے کی صُورت نہ ملنے دینے والی قدرت کاملہ بھی کس شان کی مُوجب ہے کہ ہر خاک میں ایک جوہر ہر جوہر سے ایک تصویر اور ہر تصویر میں وہ وہ باتیں پیدا کر دیتی ہے جو دیکھ کر عش عش کرنے کے سوا ذرہ برابر بھی نقل نہیں کیجا سکتیں ؎

ہوا و سبزہ و گلہائے رنگیں
یہ ساری شوخیاں ہیں اک حسین کی

اس بھری پھری دُنیا میں کیا کوئی ایسا چابکدست مصور سائنسٹ ۔ بوٹینیکل آرٹس کا ماہر ۔ باغبان یا مالی موجُود ہے جو اک جوہی کے نازک پھول کی نظیر اپنی قوت مدرکہ یا کاریگری سے بنا سکے ؟ کیا اک سادے سے پتے پر ویسے ہی نرم اور نازک نازک نقش کسی مشین یا دوا کے زور سے پیدا ہو جائینگے جو ایک معمولی کیلے کے چوڑے پتے پر دیکھے جاتے ہیں ۔ ہاں ہاں ! امریکا کا مشہور حکیم اڈیسن جو اپنے قول کے موافق ایک بٹن کے دبانے سے گریٹ برٹن کو اڑا دینے کی دھمکی دیتا ہے ۔ بلکہ اُس کے بنائے ہُوئے عجائبات اس وقت سیاحوں کے لئے اعجاز و سحر عالم آشکارا کا مرتبہ دکھا رہے ہیں کیا اس سے یہ ممکن ہے کہ وہ اک چھوٹی سی ہری ٹہنی کو توڑ کر اُس کی جگہ ویسی ہی دوسری لگا دے ۔ ایک دن میں نہیں سو دن میں سو دن میں نہیں ہزاروں میں ۔ نہیں یہ ناممکن ہے قدرت کے مقابلے میں کس کی مجال ہو سکتی ہے جو اک تنکا بھی بنا سکے ۔ قدرت کی صنعتیں ۔ زبردست حکمتیں ہیں اور حکمت کی شان ہر ذرے ذرے پتی پتی ۔ روئیں روئیں سے ظاہر ہے اگر دیکھنے والے کو سیقہ ہے اگر سمجھنے والے کو سمجھ ہے تو وہ دن رات میں کیا کچھ نہیں دیکھ سکتا اور ذرا سے غور

میں کیا کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ وقت پر لگا کر اُڑ رہا ہے زندگی موت کے دن گن رہی ہے۔
خواہشیں جان لئے لیتی ہیں اور آنکھیں کھلے رہنے پر بھی بند ہیں۔

کھلتا ہوا پتا۔ آیئے میں آپ کو بتاؤں کہ اس سُرخی میں کیا بھید ہے اور نفس مضمون کو
اس سے کیا دست وگریبانی ہے۔ میرے مضمون کے پڑھنے والو! میرے گھر میں ایک
بیت دوزخ کا گملہ ہے جس میں پھول پھل تو نہیں آتا مگر ہاں اس کے پان کے سے پتے لال
لال اور بڑے بڑے ہو کر بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ گملہ میں یہ ایک چھوٹا سا
پودا ہے اس لئے اُس کی بساط کے موافق ہر شاخ میں دو دو تین تین ہی پتے آیا کرتے
ہیں مگر وہ بھی باری باری سے۔ یعنی جب ایک پتہ پورے طور پر اپنی بہار دکھا جاتا ہے تو
جل کر گر پڑتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے کھلنے کا بھی عالم نرالا
ہوتا ہے۔ لال لال ڈنٹھل میں سے پہلے ایک مہین سی سنگھی نوک پیدا ہوتی ہے جو بڑھتے
بڑھتے نکھرتے نکھرتے کوئی پانچ چھ دن میں ایک سبز بتی سی بن جاتی ہے اور یہی
درحقیقت وہ لپٹا ہوا پتا ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ
جتنی جتنی نسیم سحر کے پولے پولے ہاتھوں کی ہلکی ہلکی جنبش اور دریا دل شبنم کے گول گول
موتیوں کی بچھاور اسیر ہوتی جاتی ہے سُورج کی دھیمی دھیمی شعاعیں ادھر اُدھر سے پڑتی
جاتی ہیں اُتنی ہی اتنی یہ پھول سی پتی لمبی ہو ہو کر کھلتی بھی جاتی ہے اور آخر ایک ہفتے
کے بعد وہی رازِ سربستہ ایک پنجۂ نگارین ہو جاتا ہے۔ جب یہ کھلنا شروع ہوتا ہے تو
اس کی نیم وا حالت اُن نازک انگلیوں کی جھلک مارتی ہے جو حنا کی بدولت خون میں ڈوبے
ہوئے نشتر کہلاتی ہیں۔ اسکی سُرخ سُرخ رگیں جب آپس میں پھیل پھیل کر مل جاتی ہیں تو پتہ کن
میں اُس نازنین مظلومہ کا کمزور ہاتھ معلوم ہوتا ہے جس نے قاتل کی ننگی تلوار روکنے کے
لئے گھبراہٹ میں اپنی گوری گوری ہتھیلی آگے کر دی ہو اور وہ لہو لہان ہو کر رہ گئی ہو
میرے دوستو! جب تک یہ کھلتا نہیں ہے اور اک سربند کلی کی طرح رہتا ہے

اُس وقت تک میں کیا بتاؤں کہ دِن بھر میں کے دفعہ میری نگاہیں اس تک جاتی ہیں اور مایوس پلٹ آتی ہیں یہ کھلنا شروع ہوتا ہے اور میری بیقراری پہلے سے بھی دو چند و سہ چند ترقی کرجاتی ہے۔ یہاں تک کہ وُہ بالکل کھل جاتا ہے اور میری لب تشنہ نظریں اسکی رنگینیوں سے لبریز ہوکر بالکل سیر ہو جاتی ہیں پھر وُہ اپنی عمر کی پُوری میعاد تک برابر کھلا رہتا ہے مگر خدا جانے کیا بات ہے کہ پھر مجھے اسکی طرف سے کچھ ایسی مساوات ہوجاتی ہے کہ کبھی بھُولے سے بھی نظر اُٹھا کر اُس کی طرف نہیں دیکھتا ہاں جب کبھی دھیان بٹتا ہے تو کدھر ؟ اس دوسری پتّی کی طرف اس امید میں کہ دیکھئے وُہ کب کھلتی ہے۔ آہا اس میں اک عجیب بھید ہے اس میں اِک طُرفہ جدت ہے بلکہ اس میں اِک اچھی خاص نصیحت پوشیدہ ہے۔ جیسے کھلے ہُوئے پتے کے خطوں نے ذرا سے غور کے بعد حرف بحرف کہدیا۔ کمال اور نقص میں کچھ یُوں ہی سا فرق ہے کمال کے بعد ہی زوال شروع ہوجاتا ہے جس کی دھیمی نمایش بہت کم دکھائی دیتی ہے صرف مُٹھی کھلنے کی دیر ہے۔ خدا نہ کرے جو کسی کی مُٹھی کھلے کلی کلی کی رسیا نگاہیں ساری خوشبو بنکر اُڑجاتی ہیں اور پھر اُدھر بھُولے سے بھی نہیں پھٹکتیں۔ رازِ سربستہ جب تک سربستہ ہی بالکل محفوظ اور مقید ہے۔ جہاں اُس کی ذراسی بُو پھوٹی اور بس ہونٹوں نکلی اور کوٹھوں چڑھی۔ اپنا راز جان سے زیادہ عزیز چیز ہے۔ اپنی مُٹھی کھولدینی سراسر نادانی ہے۔ دُوسرے سے اپنا بھید کہدینا اُس کا غلام بن جانا ہے۔ بھلا یہ کونسی دانائی ہے کہ اپنی تمام قوتیں اپنا جوش اپنی عزت اپنی آبرو دفعتاً دُوسرے کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں دُنیا والو ! دُنیا میں بھرم عجب چیز ہے اور بے اعتباری سخت ذلت۔ اپنا بھرم رکھنا گویا دوسروں سے اپنی عزت کرانا ہے۔ اِس لیئے اپنے خزانے کی کُنجی دوسرے کے جیب میں ڈالدینی دیدہ و دانستہ اس کا محتاج بننا ہے۔ مُٹھی کھلنے کے بعد کبھی بند

نہیں ہوسکتی اور گئی ہوئی خوشی پھر نہیں ملتی - اپنا راز جب تک اپنے دل میں ہو اُسے ذرا آنچ نہیں اور جہاں دوسرے کو ہمراز بنایا ہمیشہ لگا ہی پیچھی ہوئی ہوئی دیکھیں - اے اس ہی روشنی کی جھلک سے ٹٹول ٹٹول کر چلنے والو! کھلتا ہوا پتا گویا دو دن کی بہار تھا جو پھر دفعتاً نظر سے گر گیا - اور نظر سے گرتے ہی جل کر تھالے میں آ پڑا جہاں سے ہوا نے اُسے زمین پر پھینکدیا اور دُوسرے دن جھاڑو کی سینکوں اُسے دروازے سے باہر بھی کر آئیں میں نے اُسے پھر بھولوں کبھی نہ دیکھا کہ اُس کی کیا نوبت ہوئی اور وہ کس درجہ کو پہنچا - ع

کیوں کسی غیر کا محتاج بنے او ناداں
ہونٹ سی لے کہ یہاں لذتِ گفتا نہیں

کلامِ شاعر

مسکین ہی کوئی قبر سے بہتر نہیں ملتا ‏ آرام کہیں گھر کے برابر نہیں ملتا
تقصیر مری جرم مرا - کوئی خطا بھی ‏ کہہ تو سہی کیا سوچ سمجھ کر نہیں ملتا
پھر دیکھ لوں ان روٹھی نگاہوں کے میں قربان ‏ اُٹھنا اسی انداز سے کہکر نہیں ملتا
ساقی ترے پیمانے کا محتاج نہیں ہوں ‏ چُلّو ہی سے پیتا ہوں جو ساغر نہیں ملتا
کیا اشک بھرے بیٹھے ہیں وہ بزمِ عدو میں ‏ نرگس کے کٹوروں میں یہ جوہر نہیں ملتا
اِک بات کہیں تم سے خفا تو نہیں ہوگے ‏ پہلو میں ہمارا دلِ مضطر نہیں ملتا

اسواسطے کہتے نغمے ستا نہیں اچھے
شاعر کئی دن سے ترے در پہ نہیں آتا

دارُالغرور

سروالٹر سکوٹ کا یہ خیال کہ تمام کائنات میں دو چیزیں بھی ایسی نہیں جو یکساں ہوں۔ اینتھروپومیٹری کی ان تحقیقات سے اور بھی پختہ ہوگیا کہ جس طرح انسان باعتبار شکل و صورت ظاہری مطابق نہیں اسی طرح ساختِ اعضا بھی مختلف واقع ہوئی ہے!
تھمب امپریشن یعنی دو شخصوں کا انگوٹھے کا نشان خواہ وہ شہری ہوں یا دہقانی۔ جرمنی ہوں یا ازابستانی آپس میں مطابق نہ ہوگا! قس علیٰ ہذا یہی اختلاف طبائع انسان میں موجود ہے: خیال مختلف رائیں مختلف مذہب مختلف یقین مختلف!

دُنیا کے دارالعشرۃ اور دارالغرور ہونے پر ہر طبقہ اور قوم کے اہل قلم نے مختلف خیال ظاہر کئے مگر ایک شخص واحد کا خیال استدلال کے واسطے کافی نہیں ہوسکتا امر متنازعہ فیہ کے فیصلہ قطعی پر دیکھنا یہ ہے کہ جماعت کا مذہب کیا ہے اور سوسائٹی کا رجحان بیشتر کس طرف ہے!!!

ہیجمینٹس یعنے قوت تمیز نے بسا اوقات ایسا بھی کیا ہے کہ ایک ہی شخص ایک ہی صنعت کے معنے کرنے میں متفرق اوقات میں مختلف الخیال ہوگیا مگر یہ صورت شخص متعلق کی غلط فہمی سے زیادہ صنعت کے مختلف التاثیر ہونے پر دلالت کرتی ہے! شیکسپیئر جو ایک جگہ انسان اور حیاتِ انسان کے واسطے اچھے لفظ لکھ رہا ہے دوسری جگہ تماشا گاہِ عالم کو ایک تھیٹر قرار دیکر اسی انسان کی بابت لکھتا ہے:۔

سب سے آخر سین بڑھاپے کا ہے جو اس تمام کائنات کا خاتمہ کر دیتا ہے اور یہ وہ وقت ہے جب ذائقہ اور زبان آنکھ اور کان سب وبالِ جان ہو جاتے ہیں۔
دیکھنا صرف یہ ہے کہ دارالعشرۃ اور دارالغرور دونوں میں بحیثیت مجموعی اطلاق

جائز کس کا ہو سکتا ہے؟ اس بحث میں مختلف بنی نوع انسان کے خیالات پر نظر ڈالنی ہو!!
ایک سمندر پار کا رہنے والا دُنیا سے اس طرح مخاطب ہو رہا ہے۔

"آہ! لا تپہ دنیا تیرا منظر کیسا دلفریب ہے!
تیری خوشیاں بہت ہیں! اور ہر خوشی نئی ہے۔
آہ پیرزال! تیری کونسی چیز پُرانی ہوگئی
کس قدر تھوڑی تیری خوشیاں!! اور وہ تھوڑی بھی کب تک۔"
(کریب)

"اِس دُنیا نے مجھ کو مارڈالا۔
دن کی روشنی اور سورج سب تکلیف دہ ہیں۔" (ایڈیسن)

شیکسپیر اپنے ایک مشہور پلے مرچنٹ اوف وینس میں کہتا ہے "دُنیا ایک سٹیج ہے جہاں ہر شخص اپنا پارٹ کر رہا ہے اور سب سے زیادہ دردانگیز پیرا ہے" لونگ فیلو اس شخص کے واسطے جو فرائض ادا کر رہا ہے نہایت بیش قیمت الفاظ لکھتا ہے۔

مرحوم داغ فرماتے ہیں:-

دُنیا بھی اِک بہشت ہے اللہ رے کرم کن نعمتوں کو حکم ملا ہے جواز کا

(حالی) جو لوگ یہ کہتے ہیں جہنم دنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

جن لوگوں نے بہشتِ شداد طلسم نمرود وغیرہ کو آنکھ سے دیکھا فطرتِ انسان متقاضی تھی کہ اُن کی انتہا نظر اور خاتمہ عقل اسی حد پر ہو جاتا! کوئی وجہ نہ تھی کہ بہشت شداد کے دیکھنے والے جنتِ آسمانی کا یقین کر لیتے! یہ تقاضا سرشتِ انسانی تھا کہ آخر بنی اسرائیل کہہ بیٹھے لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (ہم جب تک اللہ کو آنکھ سے نہ دیکھ لیں یقین نہ کریں گے)! دائرہ مذہب سے باہر نکل کر اگر ایک آدمی مافوق الفطرۃ

اُمیدوں کو ڈھکوسلا بتا کر یہ کہدے، ۔ ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش کرنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

تو فطرتِ انسانی کے بموجب وہ کس گناہ کا مرتکب ہوا؟ جہانتک اس کی عقل نے رہبری کی وہ پہنچا۔ جب عقل ہی جواب دے چکی تو اب کیا کہتا اور کیا کرتا؟ وہ مصیبت زدہ جس نے تمام عمر رنج و افلاس میں بسر کی نہ پیٹ بھرنے کو ٹکڑا نہ تن ڈھانکنے کو چیتھڑا۔ جنازے ڈھوتے ڈھوتے کندھے شل ہو گئے۔ اور کفن دیتے دیتے دل مُردہ ہو گیا اُس سے یہ کہنا کہ مرنے کے بعد ساتویں آسمان پر تیرا مقام جنت الفردوس میں تیرا قیام غلمان کے پڑوس میں تیرا گھر حوروں کی گود میں تیرا سر! آنکھ بند کرنے کی دیر ہے دوسرے جنم میں ہفت اقلیم کی بادشاہت تیری ہی ہے! اِدھر دم نکلا اور اُدھر روح القدس کا ساتھ ہوا! فطرتاً یہ کلمات موجودہ مصائب کے اثر کو کہاں تک زائل کرینگے اور یہ اُمیدیں کس حد تک ان نقصانات کی تلافی ہو سکتی ہیں؟ اس بدنصیب سے یہ توقع رکھنی کہ دنیا کو جنت سمجھنے میں مرحوم داغ کا یہ خیال ہو درست ہے؟

وہ جو اس تمام کائنات کا خالق سمجھا گیا ہے خواہ اُس کا خواہ قوانینِ قدرت کا منشا اگر کسی خاص وقت تک اس دنیا کے باقی رکھنے کا تھا تو ضرور تھا کہ طبیعتِ مخلوق میں تھوڑا بہت مادہ اعتبار موجود ہوتا اور دنیا کی قوتِ مقناطیسی بلا امتیاز ہر متنفس کو اپنی طرف کھینچتی! حیوانی طاقتیں نفسانی خواہشیں جہاں انعامِ الٰہی ہیں وہاں بقائے نسل و تسلسل کے واسطے بھی اُنکا وجود لازمی تھا! اگر اس مکروہ صورت پیرزال کے چہرے پر دلچسپیوں کا غازہ نہ ہوتا تو کوئی تھوکتا بھی نہیں!!! ایک معقول آدمی کہتا ہے کہ وہ لوگ جو وجودِ صانع پر دلیل طلب کرتے ہیں اُن کے واسطے صرف یہ ہی صنعت ثبوت صانع ہے کہ جو اُس کو مکروہ صورت پر بہ سیرت یقین کر رہا

ہے وہ بھی اس کا دلدادہ ہے!

بہتر تو ہے یہی کہ دنیا سے دل لگے۔ پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

مولانا جامی علیہ الرحمۃ اسی تعلق کو جزو مذہب قرار دے رہے ہیں۔

پانچویں صدی ہجری کے ایک زبردست فلاسفر سعدی جس نے عباسیہ کی بھٹی ہوئی سلطنت کا چراغ اُس وقت روشن دیکھا جب اُس کی شعاعیں تمام یورپ ایشیا اور افریقہ کو منور کئے ہوئے تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسا جھوکا آیا کہ وہ روشن چراغ ٹمٹماتا ہوا ہمیشہ کے واسطے گل ہو گیا۔ مستعصم باللہ کی تباہی اور نیرنگی دنیا کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

تکیہ بر دنیا نہ باید کرد دل بر وے نہاد — کاسمان گاہے بر مہر ست اہی بار گہ کین
ہرگیا بند از پئے مردار دنیا جنگجوئے — اے برادر گر خردمندی چو سیمرغ ان نشیں

یہی محقق تباہی بغداد پر دنیا کے معنے یوں کر رہا ہے۔

وَجَادِبَةُ الدُّنیا لعومَۃ کُفّہا — محیّنۃ لکنّہا الکلبُ ذوالطغرِ

حیات و ممات کا فیصلہ اس طرح فرماتے ہیں۔

آں گل کہ ہنوز تو بدشت آمدہ بود — نا شگفتہ تمام باد مہر شش بربود
بیچارہ بسے اُمید در خاطر داشت — اُمید دراز عمر کوتاہ چہ سود

جن بچوں کے ساتھ آئندہ کی تمام اُمیدیں وابستہ تھیں جنکو دیکھ دیکھ کر ماں باپ نہال ہوتے تھے اُنکا حسرت ناک فراق مرحوم ذوقؔ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے — حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

حیات و دار الحیات کے تعلقات کا شیخ نے کیا خوب نتیجہ نکالا ہے۔

الا اے کہ برخاک ما بگذری — بہ خاک عزیزاں کہ یاد آوری
کہ گر خاک شد سعدی اورا چہ غم — کہ در زندگی خاک بود ست ہم

شاید مرزا صاحب کا ذکر ہے کہ عمر بھر کی کمائی ایک بچی تھی جو پل بلا کر جوان ہوئی شادی ٹھہری جہیز تیار ہونا شروع ہوا۔ جہیز میں ما یہ بھی مدنظر رکھتی ہے کہ ہر چیز بیٹی کی مرضی کے موافق ہو۔ تمام چیزیں جو آئندہ زندگی اور خانہ داری میں کام آنیوالی ہیں حسب حیثیت فراہم کردی جائیں! چنانچہ ماہر تجویز میں کسی نہ کسی ذریعہ سے لڑکی کی رضامندی بھی حاصل کرلیتی ہے۔ خواہ براہ راست خواہ کسی ہم عمر لڑکی کے وساطت سے خواہ صرف خوشی سے المختصر بدنصیب باپ کی صاحبزادی میکے سے جہیز لیکر نکلی اور سسرال پونچی۔ چند روز بعد بیمار ہوکر میکے آئی اور دو تین دن میں مرگئی!

دلی میں اکثر جگہ دستور ہے وداع کے وقت باپ بھائی عزیز اقارب دولہن سے ملنے آتے ہیں اور لڑکی اپنے اُن تمام عزیزوں کو جن میں چھوٹی سے بڑی ہوئی روتا اداس گھر کو جس کی ایک ایک دیوار اور کولا اسکی بو پہچانتا ہے سنسان اور اُس ماں کو جو دنوں اور راتوں گود میں لئے لئے پھری حیران چھوڑ چھاڑ اُس زمین پر سے جہاں ڈھائی تین برس کی عمر میں بنگالے کی مینا بنی ہوئی تھی گم سم پالکی میں سوار ہوجاتی ہے! اسی طرح جب مُردے کو نہلا دُھلا کر کفن دے چکتے ہیں تو پسماندگان اپنے عزیز کا آخری دیدار دیکھ کر ہمیشہ کے واسطے رخصت کرتے ہیں!!!

جب عورتیں لڑکی کو نہلا کر کفنا چکیں مصیبت زدہ باپ کو بلایا کہ اس بچی کو دیکھ جاؤ جو اب پیوند زمین ہوتی ہے!!!

جس لڑکی کو دیکھ دیکھ کر باپ کا چلوؤں خون بڑھتا تھا اُس کا دل کیا کہتا ہوگا یہ دیکھ کر کہ مہینہ بھر کی دُلہن کفن میں لپٹی پڑی ہے۔

مرزا صاحب دیکھ کر فرماتے ہیں:-

اب آیا یاد اے آرام جاں اس نامرادی میں
کفن دینا گئے تھے بھول ہم اسباب شادی میں

شعر کے معنے یوں ہوں گے، بیٹی جہیز میں ہم نے ضرورت کی تمام چیزیں دیں مگر کفن بھول گئے چونکہ یہ بھی کچھ کم ضروری چیز نہ تھی تم اسکی طالب ہوئیں، حیا مانع تھی سب سے اچھا طریقہ یہ نصیب آپ سے کفن وصول کرنے کا تم نے یہ سوچا!!

مصائب و تکالیف کے ساتھ ہی ساتھ فطرت نے قلبِ انسان میں یہ مادہ بھی رکھا ہے کہ رنج و الام سے پژمردہ ہو کر راحت و اطمینان بھی محسوس کرے اگر ایسا نہ ہوتا تو زندگی وبال ہو جاتی مگر وہ بدنصیب جس کے پاس کوسوں کوئی خموشی کا سامان نہیں وہ کس برتے پہ زندگی بسر کر رہے ہیں؟

جس آفت زدہ کے تین چار جوان جوان بیٹے آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ گئے ماں مری، باپ مرا، ایک بیٹی رہ گئی تھی وہ بھی مری یہاں تک کہ میاں بھی چل بسا دکھڑا کیا اور پیٹ پالا آنکھوں میں پانی اُتر آیا اس سے بھی گئی اس کی عمر کیونکر گذر رہی ہے؟ اُمیدوں کا ڈھیر اس کے پاس بھی لگا ہوا ہے چار برس کا ایک بچہ گود میں ہے دُنیا کی تمام خوشیاں اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ خدا کی شان مرنے سے چند روز پہلے وہ بھی رخصت ہوا۔ تمام امیدیں ختم ہوئیں اب اس کے سامنے اگر کوئی دُنیا کو جنت کہے تو منہ نوچ لیگی! وہ تو دنیا اور مافیہا سب کو اپنے ہی جیسا سمجھ رہی ہے۔

متمم ابن نویرہ اپنے بھائی مالک کے مرثیہ میں فرماتے ہیں:-

فقلت له ان الشجا یبعث الشجا فدعنی فهذا کُلّہ قبرُ مالک

مجھ کو تو قبرستان میں ہر قبر مالک ہی کی قبر دکھائی دے رہی ہے!

خندۂ گل بے نمک فریادِ بلبل بے اثر اس چمن سے کہہ تو جا کر کیا کرینگے یاد ہم

حضرت علیؑ اپنی نہایت محبوب و مقدس بی بی سیّدۃ النساء کے انتقال پر فرماتے ہیں:-

لکلّ اجتماعٍ خلیلین فرقت وکلّ الذی دون الفراقِ قلیلُ

وانّ افتقادی فاطماً بعد احمدٍ دلیلٌ علیٰ ان لا یدوم خلیلُ

دوسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ رسول خدا کے بعد سیدہ کی موت دلیل ہے اس بات کی کہ ہر وصال کے ساتھ فراق ہے۔ یعنی دوسرا شعر پہلے شعر کے مضمون کا نہایت مدلل ثبوت ہے۔

مومن مرحوم مصائب دنیا و حیات انسان کے ساتھ مستقل سلسلہ قرار دے رہے ہیں

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آسماں نہیں

آتش اس مضمون کو ذرا کوشش بجالانے کی دیر تھی چاروں طرف سے مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا یوں ادا کرتے ہیں۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

سعی فلاح و بہبود اور ان اسباب کا فراہم کرنا جو زندگی میں درکار ہیں دوسری بحث ہے کلام اس میں ہے کہ دنیا جنت الفردوس ہے اور سوال یہ ہے کہ دنیا دار العشرۃ ہے یا دار الغرور؟

دنیا کا عالم اسباب ہونا مسلّمہ ہے اور ہر وقوع ایک وجہ کا طالب ہے یہ دو چیزیں رنج و خوشی جو زیر بحث ہیں ان کا امکان بھی بلا سبب محال ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ چھپر پھاڑ کر کسی کے پاس خوشی کا ڈھیر لگ گیا ہو! بنی نوع انسان کے تعلقات باہمی ایسے وابستہ ہیں جیسے اشعار مثنوی یا زنجیر کی کڑیاں۔ دعویٰ یہ ہے کہ کوئی شخص کوئی خوشی بلا کسی دوسرے شخص کو نقصان دیئے یا رنجیدہ کئے محسوس نہیں کرسکتا (اگرچہ بعض حالتوں میں یہ نقصان ناگوار نہ ہو) ایک وزیر اعظم مہینہ بھر فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد تنخواہ کی معقول رقم پاتا ہے اور یہ اس کی بڑی خوشی کا سبب ہوا لیکن جس کی گرہ سے یہ رقم گئی اس کا نقصان ہوا یا نہیں؟ خزانہ شاہی سے یہ رقم کم ہوئی نہ ہوئی؟ یہ ہی کیفیت تمام تعلقات کی ہے۔ بزاز روپیہ لیکر کپڑا دیتا ہے۔ معمار مزدوری لیکر مکان بناتا ہے اور اسی طرح ایک شخص کا نقصان دوسرے کا فائدہ سمجھا گیا ہے۔ تجارِ غلہ شب و روز دست بدعا ہیں کہ امساک بارش بنی اسرائیل کا قحط دکھا دے۔ غیر تجار کہہ رہے ہیں خدا کرے من بھر کے گیہوں ہو جائیں!

فریقین میں سے ایک خوش اور دوسرا رنجیدہ ضرور ہوگا ۔

یہ انکا حال ہے جن کے ذرائع معاش مختلف ہیں۔ اب انکو دیکھو جو حریف یعنی ہم پیشہ ہیں ۔ دو پٹوئے برابر برابر دو دکانوں میں بیٹھے ہیں ہنس بھی رہے ہیں بول بھی رہے ہیں اتفاق سے ایک شخص ڈورا ڈلوانے آیا اور ایک سے چکانے لگا فطرتِ انسانی شاہد ہے کہ دوسرا منتظر ہے کسی طرح اُس کے ہاں سے اُکھڑے اور میں جماؤں ۔

اہلِ صنعت و حرفت سے آگے بڑھ کر تعلیم یافتہ گروہ کو پرکھو! صاحب ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں پچاس روپیہ کی ایک جگہ خالی ہے سیکڑوں اُمیدوار ہیں اور ہر ایک اپنی کامیابی کا خواستگار۔ ان میں ایک کی کامیابی باقیوں کی کس قدر افسردگی کا باعث ہوگی ۔ بیرسٹر وکیل مختار کسی مقدمہ کا فقط شروع ہونا تھا پہلے اس بات کے خواہاں رہے کہ ایک فریق کی طرف سے ہم بھی پیروی کریں ۔ اس کے بعد کامیابی کے اب یہ کامیابی فریقِ مخالف پر کیا اثر کریگی ۔

حکیم ڈاکٹر وید زیادہ تر اس خیال سے تندرست ہیں کہ لوگ بیمار ہونگے گورکنوں کی زندگی صرف اس پر ہے کہ لوگ مرینگے ۔ میرے جدِ امجد کا ذکر ہے ایک شخص ترقی روزگار کا تعویذ لیکر چلا گیا چند روز بعد پھر آیا اور کہا مولوی صاحب تعویذ کا اثر تو ضرور ہوا مگر پورا نہ ہوا فقط بچکانوں کا زور رہا ۔ دریافت سے معلوم ہو گورکن تھا ۔

کہا جاسکتا ہے کہ بعض صورتوں میں انسان ایسی خوشی بھی محسوس کرتا ہے جسکا بیج وہ تعلق بظاہر کسی متنفس سے وابستہ نہیں مثلاً بیٹے کی پیدائش ۔ مایوس مریض کا جانبر ہونا کامیابی امتحان وغیرہ وغیرہ مگر اس کا جواب کیا ہوگا کہ جہاں تعلقاتِ انسانی بہت سے دوست پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں وہاں چند دشمن بھی

اسکی بدولت میسر ہو جاتے ہیں۔ اس بات کا یقین شاذ صورتوں میں ہوگا کہ تمام تعلقات
میں ایک شخص کا کوئی بھی بد خواہ نہیں اگر بہ ہزار تجسس دو چار اللہ کے بندے ایسے نکل
بھی آئے تو اُن سے زیادہ ایسے ملینگے جن کی تمام عمر بغض للّٰہی میں گذر گئی ذرا کسی
کو خوش دیکھا اور اُنکا دل پھوٹ گیا! ایک عورت جو لڑکا پیدا ہونے سے
نہال نہال بیٹے چھٹی کی تیاری دھوم دھام سے کر رہی ہے بظاہر اُس نے کسی
ہمجنس کی خوشی میں ساجھا نہیں لڑایا مگر بندہ کا دل کیا کہتا ہوگا جس کے ہاں مفلسی
میں اوپر تلے سات بیٹیاں ہوگئیں اجھانی سے پوچھو جس کے ہاں ایک چھوڑ
پانچ چھ لڑکے ہوئے اور سب پل پلا کر آٹھ آٹھ دس دس برس کے رخصت ہوئے!

بسا اوقات یہ دیکھا کہ صرف ایک خوشی کے واسطے آدمی نے سخت سے سخت
مصیبت اُٹھائی مگر وقت آیا تو خوشی بھی رنج سے بدل گئی۔

ایک شخص جس کی تمام عمر بیٹے کے ارمان میں گذری۔ بیسیوں جتن سیکڑوں
کوششیں ہزاروں روپے دو دو تین تین بیویاں غرض سب ہی کچھ کیا مگر بچہ کیسا کبھی
کچا بھی نصیب نہ ہوا خدا خدا کرکے بڑھاپے میں آکر اُمید ہوئی ایک ایک دن
گن گن کر مدت پوری کی! وضع حمل ہوا تھوڑی دیر بعد اِدھر بچہ اور اُدھر زچہ دونو
ختم ہوئے!

دُنیا کو دار العشرۃ ثابت کرنا تو درکنار دار الغرور ثابت ہونے دینا بھی بہت
مشکل ہے اگر یہ دیوار ناپایدار بہشت ہو تو اس کا جزو اعظم الفراغ کلّی ہوگا جو قطعی
میسر نہیں۔ یہاں اُس حکیم کے مقولہ کی تصدیق ہوتی ہے جو کہتا ہے کہ کوئی شخص اپنی
حالت کو دوسرے سے تبدیل نہیں کرنا چاہتا کیونکہ ہر دوسرے شخص کی حالت میں
کوئی نہ کوئی سُقم کچھ نہ کچھ عیب تھوڑا بہت نقص ایسا موجود ہے جو اُس میں خود نہیں!
یہ صنعت ہے کہ با وجود ان تمام نقائص کے ایسی دلبستگی کے سامان بھی موجود ہیں

جو طبیعت کو اکتانے نہیں دیتے اور یہ فطرت ہی کہ ان تکلیفوں پر بھی آدمی اس کا گرویدہ بنا ہوا ہے !

سیکرز آف دی گوڈ میں ایک جگہ سینیکا کا خیال اس طرح ظاہر ہوتا ہے۔

جنکو تم خوشحال خیال کرتے ہو اگر تم انکی بیرونی حالت پر نہیں بلکہ اندرونی حالت پر نظر ڈالو تو وہ کمبخت و ذلیل و خوار ہیں وہ اپنی دیواروں کی مانند ہیں جو اوپر سے اچھی طرح آراستہ ہیں !!

ایک جگہ وہ کہتا ہے ہپوکریٹس نے مریضوں کو شفا دی اور مر گیا جالڈینز نے بیشین گوئیاں کیں اور مر گیا۔ الگزنڈر پومپی سیزر نے ہزاروں کو ہلاک کیا اور مر گئے ایک اٹلس نے دس کریٹیز اور دوسرے نے سو کریٹیز کو مار ڈالا اگسٹس اس کی بیوی بیٹی اور تمام اولاد اور اجداد مر گئے اور ویسپیسین اس کے اہل دربار . . . . . . سب کو موت لیگئی !

اسی سلسلہ میں وہ کہتا ہے جب تک تو زندہ ہے موت تیرے سر پر کھڑی ہے اور تیرے اختیار میں ہے کہ تو نیک بن ! بعض جگہ اس کے خیالات اہل اس کے مطابق ہو گئے ہیں۔ ؎

غم آور د نقصانے نشادی داد سامانے بہ پیش ہمت ما ہر کہ آمد بود مہمانے

امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ کیا معقول بات کہہ رہے ہیں ! فرماتے ہیں ! سواد چشم و سویدائے قلب یہ دو چیزیں بھی انعامات الٰہی ہیں ! آنکھ کی کیفیت یہ ہے کہ اگر پتلی کے مقابل ایک انگلی کھڑی کر دو تو آنکھ کا کام ختم ہو گیا ! دل کے سامنے تمام دنیا کی محبت آموجود ہو تو دل اپنا کام کس طرح انجام دیگا !

ایک بات اور بھی قابل بیان ہے "تکلیف خواہ کتنی ہی کم مقدار کیوں نہ ہو اور رنج خواہ کتنا ہی خفیف کیوں نہ ہو بڑے سے بڑا آرام اور اچھی سے اچھی

خوشی اُس کو قطعی زائل نہ کردیگی لیکن خوشی خواہ کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو چھوٹا سا رنج
اُس کو کرکرا کر دیگا۔ درد سر کی معمولی شکایت چاروں طرف سونے کا ڈھیر لگا دینے سے بھی
رفع نہ ہوگی لیکن یہی معمولی شکایت جواہرات کی خوشی کو بھی پھیکا کر دیگی۔ ایک لگن
میں پانی بھر کر ماشہ بھر رنگ ڈال دینے سے گو تمام پانی رنگ نہ ہو مگر پانی کا رنگ ضرور
تبدیل ہو جائیگا۔ تمام دنیا چھان مارو کوئی فرد بشر ایسا نہ ملیگا جو حوادثات سے مطمئن ہو۔
عمرِ گراں بہا کا بیشتر حصہ رنج و آلام میں گذرا اور بمشکل تمام چند گھڑیاں ایسی ملیں کہ قلب نے
بلا کسی رنج دہ خیال کے خالص خوشی محسوس کی! اسی مضمون کو سوکریٹیز نے اس طرح
ادا کیا کہ اگر تمام دُنیا کی خوشی اور رنج ایک جگہ جمع کئے جائیں اور پھر تمام بنی آدم پر
مساوی تقسیم ہوں تو ہر شخص تقسیم شدہ رنج و راحت کو مصیبت اور حالت سابقہ کو
نعمت سمجھیگا۔

اب حالتِ انسانی کو تین حصوں میں تقسیم کرو عُسرت غیر عُسرت اور عشرت۔
جس طرح رفتارِ زمانہ نے بڑے بڑے سورما اور کجرفتار اپنے ڈھڑے پر ڈال لئے
اسی طرح مُصیبت بھی رفتہ رفتہ عادت میں داخل ہو جاتی ہے۔

رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مصیبت یا عسرت میں استقلال چنداں مشکل نہیں مگر غیر عُسرت میں قناعت
اور عشرت میں شکر نہایت مشکل کام ہے غزالی کی رائے ہے کہ مصیبت میں صبر مومن کا
کام ہے اور غیر مصیبت میں شکر صدیق کا کام ہے!!
کرسچینیٹی ہندوازم اور اسلام صبر کو نہایت اچھی صُورت میں آدمی کے سامنے
پیش کر رہے ہیں لیکن غزالی علیہ الرحمتہ کے الفاظ شکر کو صبر پر اس وجہ سے ترجیح
دے رہے ہیں کہ اہلِ مذہب جو اپنا بندہ ہونا تسلیم کر رہے ہیں اُن کا یقین یہ ہے
کہ انسان سے ہر حال میں شکر کی توقع کی گئی ہے! مگر تجربہ یہ کہتا ہے کہ کوئی شخص خواہ

صاحب مذہب ہو یا لا مذہب اس تصویری پر کاربند نہیں ! اب وُہ جگہ جہاں کوئی مطمئن نہ ہوا دار العشرۃ ہو سکتی ہے ؟

ایک سرسری نظر اُن دلبستگیوں اور دلچسپیوں پر بھی ڈالنی چاہیئے جو دورانِ زندگی میں نہایت خوشگوار ہیں اور جن پر دار العشرۃ کا تمام دار و مدار ہے !!!

خوشیوں میں خوشیاں دو بہت بڑی خوشیاں مال اور اولاد ہیں۔ دولتمند کو بیٹے اگر سونے کی کان ہیں تو مفلس کو بیٹیاں وبالِ جان ! ذوق مرحوم کہتے ہیں ۔ ؎

توڑا کمرِ شاخ کو کثرت نے ثمر کی ۔ دُنیا میں گراں باری اولاد غضب ہے

اولاد اور اولاد میں بھی بیٹے بہت بڑی نعمت ہیں لیکن یہی نعمت بعض دفعہ ایسی آفت ہو جاتی ہے کہ چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ ؎

زنانِ باردار اے مردِ ہشیار ۔ اگر وقتِ ولادت مار زائند

ازاں بہتر بہ نزدیکِ خردمند ۔ کہ فرزندانِ ناہنجار زائند

مال تمول جس کا پیش خیمہ غرور و نخوت ۔ سنگدلی و نخسن کشی ہیں اس کی ایک ادنیٰ صفت یہ ہے کہ ہمدردی جو شیوہ انسانیت ہے اسی کے بدولت رخصت ہو جاتی ہے !

الخلق عیال اللہ کی تلقین تقریباً ہر مذہب نے کی مگر دولتمندی وہ پہلی آفت ہے جس کی بدولت یہ اصول ہاتھ سے جاتا رہتا ہے ! اہلِ مذہب کے واسطے اس سے بڑی مصیبت کیا ہوگی کہ دائرہ مذہب سے باہر نکل جائے ! تمول پر استقامت مشکل سہی مگر محال نہیں اور اگر محال ہے تو یہ دلیل اس بات کی ہے کہ اس مذہب کے اصول بالکل لچر ہیں !

المختصر تمول جو سب سے زیادہ محبوب و مرغوب چیز ہے وُہ بھی اتنے بڑے سقم سے آلودہ ہے ! ایسے بھی ہونگے کہ دولتمندی میں احکامِ مذہب پر قائم رہے مگر ایسے بہت ہونگے کہ دولت کی صورت دیکھتے ہی فنا فی العشرۃ ہو گئے !!!

ہارون جس وقت عرفات سے واپس آ رہا تھا رستہ میں بہلول سے ملاقات ہوئی

ہارون نصیحت کا طالب ہوا بہت بڑی گفتگو کے بعد بہلول نے کہا۔

ہارون! مال وجمال ایک کسوٹی ہیں ذرا ہشیار رہنا!

تجربہ بتاتا ہے کہ مالدار خواہ تن تنہا خواہ عیالدار مطمئن ہرگز نہیں۔

ع جنکے رتبے ہیں سوا انکو سوا مشکل ہے!

ایک نعمت مرد کے واسطے عورت اور عورت کے واسطے مرد ہے! جیساکہ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:۔ ؎

زنِ نیک فرمانبر و پارسا کند مردِ درویش را بادشاہ

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

زن دوست بود وے زمانے تاجز تو نیافت مہربانے

خود شیخ کے بیان نے اس نعمت کو مشروط کردیا اور یہ اصول کلی نہ رہا!

اس نعمت کی قدر و منزلت اُن مردوں سے پوچھنی چاہیئے جن پر عورتوں کے ہاتھوں سخت سے سخت مصیبتیں گذر رہی ہیں!

فرقۂ اُناث کا اطمینان وآرام اُن کے اس مقولہ سے معلوم ہوتا ہے!

اوتی روئے ستپوتی روئے رات کی بیاہی روئے

الغرض یہ تمام گلہائے رنگین کانٹوں سے پٹے پڑے ہیں اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ صورت ظاہری پر فریفتہ ہوکر خاصیت کو نظرانداز کردیں۔

اعتراف انعام میں کلام نہیں مگر جہاں اس کا اِنکار محسن کشی ہو وہاں تکلیف کو راحت بتانا بھی بوالہوسی ہے۔

جعفر وزیر ہارون کی موت خاندان برمکی کا انقلاب تاریخ بغداد میں دنیا کے معنے یوں کر رہا ہے جعفر کی ماں یعنی وہ عورت جس نے ایک عید کو چار سو خلعت گراں بہا تقسیم کئے دوسری عید کو بدن پر ثابت کپڑا نہ تھا!

کیسا دہشت انگیز وقت ہوگا۔ جب پانی پت کی لڑائی کے بعد ابراہیم کی ماہمایوں کے روبرو آئی اس کی ظاہری ہیئت بتا رہی تھی کہ اِن محلوں کی بیٹھنے والی نے زمین پر بھی مشکل سے پاؤں دھرا ہوگا۔ شہزادے کے سامنے آکر جس وقت کھڑی ہوئی تمام جسم کانپ رہا تھا بالآخر اُسے ہاتھ نکالا۔ کوہ نور ہیرا جو الماس کی ڈبیا میں بند تھا ہمایوں کو دیا اور کہا۔

"شہزادے یہ ہمارے پاس امانت تھی۔ اب چونکہ اقبال تیرے ساتھ ہے سلطنت تیری حکومت تیری یہ امانت بھی لے"!

جان کا وہ واقعہ بھی قابلِ غور ہے جب اُس نے بھتیجے کی آنکھیں نکلنے کا ارادہ کیا! ارتھر کی گریہ و زاری ہیوبرٹ ڈی برگ کی منت وسماجت۔ سنگدل جان کی شقاوت اور میلیک کی مدد سے بھتیجے کو قتل کرنا عبرتناک سین ہے۔ ڈیوک ووف گلوسیسٹر کا کمسن شہزادوں کے قتل پر آمادہ ہونا اور ٹائرل کا ڈائیٹن اور فوریسٹ کو ترغیب دینا ان ہر دو جلادوں کا اس کمرے میں داخل ہونا کیسا دردناک سماں ہوگا! تاریخ انگلستان میں لکھا ہے جس وقت یہ سفاک داخل ہوئے دونوں بچے ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے رخسار پر رخسار رکھے سوتے تھے ظالموں نے ایک کپڑا اوڑھا کر صاف کر دیا!!!

اگر یہ تمام موجوداتِ طبقہ ادنی و اعلٰی لذائذ انسانی سے متعلق ہیں بیش بہا انعام سمجھے جا سکتے ہیں تو اس کا کیا جواب ہوگا کہ ابقائے حیات و اجرائے تسلسل سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اگر مقاصدِ قدرت میں استقرار دنیا بھی شامل ہے تو کوئی عطا نعمت نہ رہی! جب زندگی بنفسہ نعمت نہیں تو بقائے زندگی کے اسباب کس اصول پر نعمت ہونگے! ہوا نہ ہوتی نہ سہی پانی نہ ہوتا بلا سے آدمی مرجاتے اچھا ہوتا! آنکھیں اگر نعمت ہیں تو حافظ جی کس جرم میں اندھے ہو گئے! اعضائے جسمانی

اگر نعمتیں ہیں تو شیکسپیر نے اس نعمت کا اعتراف کیا بُرا کیا ہے کہ یہ ہی اعضا بڑھاپے میں وبال ہو جاتے ہیں؟

اگر قویٰ نعمت ہیں تو ان کا انحطاط مصیبت!!!

اِن تمام واقعات پر غور کرنے کے بعد ایک صحیح الدماغ آدمی دُنیا کے معنی یُوں کریگا:

کُنْ فِی الدُّنیا کاَنَّکَ غَرِیبٌ اَوْعَابِرُ سَبِیْلٍ!

ایک سرسبز و شاداب باغیچہ ہے خوشنما پُھول چاروں طرف کھلے ہوئے ہیں ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ وسط چمن میں لہریں لے رہا ہے جابجا فوارے چھُٹ رہے ہیں۔ ننھی ننھی بوندیں سبزۂ خوابیدہ کو چھینٹے دے دے کر جگا رہی ہیں۔ سرو اور ناز اور درختوں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں۔ صبح کا سہانا سماں پرندان خوش الحان کی چہکار نسیم کی اٹھکھیلیاں بلبل کی چہک پھُولوں کی مہک پپیہے کی لہک اُس خطہ زمین کو جنت الفردوس بنا رہی ہے! ایک بھُولا بھٹکا تھکا ہارا مسافر کسی طرف سے آنکلا دیکھتے ہی آنکھیں کھل گئیں۔ رستے کی کلفت منزل کی پریشانی مسافت کی تکلیف سب بھُول گیا۔ مصیبت کا مارا۔ دم لینے کو بیٹھا آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے تو میوہ دار درخت جھوم جھوم کر زمین کو چوم رہے ہیں۔ اُٹھا پیٹ بھر کر میوے کھائے۔ ڈٹ ڈٹ کر پانی پیا! بیوی کے لئے مہندی توڑی بچوں کے لئے پھُول چنے! لہلہاتا ہوا سبزہ آنکھوں میں کھُب رہا تھا بے اختیار ہو کر لیٹ گیا! لیٹنا تھا کہ نیند آگئی! آنکھ کھُلی تو آفتاب نصف النہار پر تھا۔ رنگ کے پھُول مرجھا چکے تھے۔ چہکار کے بدلے شیروں کی دھاڑ اور ہاتھیوں کی چنگھاڑ کان میں آرہی تھی! نہر کو جھانک کر دیکھا تو صاف و شفاف پانی کے بجائے کیچڑ کے ڈھیر لگے ہوئے! بادِ سموم کی لپٹیں دوزخ کا مزا دکھا رہی تھیں! گھبرا کر اُٹھا

مگر گرا سنبھلا اور پھر اٹھا ! سہموں کے مارے جان نکلی جا رہی تھی ! یہ کہتا ہوا سب طرف لپکا ۔

زینہار از دورِ گیتی و انقلابِ روزگار

درخیالِ کس نگردد کانچناں گردد چنیں

مگر جدھر جاتا تھا سنگین دیواریں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں ۔ حرمان نصیب مسافر ایک مصیبت میں پھنسا ہوا تھا ! خدا خدا کر کے ایک دروازہ دکھائی دیا شکر کرتا ہوا دوڑا اور یہ پڑھتا ہوا باہر آیا !

مجو درستی عہد از جہانِ سست نہاد

کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد ست

بڑے بڑے تاجدار اور فارغ البال اس ہیزال کے ہاتھوں ایسے ذلیل و خوار ہوئے کہ زندہ تو زندہ مُردے کی بھی وہ مٹی پلید ہوئی کہ خدا دشمن کی نہ کرے ! جنکی زندگی میں سونے اور چاندی کی بیاڑیں تھیں مرنے کے وقت چراغ میں تیل بھی میسر نہ ہوا ! جن گھروں میں آدھی آدھی رات تک چہل پہل رہتی تھی دیکھتے ہی دیکھتے ڈھنڈار ہوگئے ۔ جہاں دن دن بھر اور رات رات بھر میلے سے لگے رہتے تھے آج سناٹا چھایا ہوا ہے ! علوم و فنون کے ماہر تحریر کے دھنی تقریر کے ساحر بدنصیب و شاد کام سنگدل وگل اندام موت نے ایک کو نہ چھوڑا ! کیسے کیسے کڑیل جوان آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ گئے محلوں کے رہنے والے آناً فاناً ہزاروں من مٹی کے نیچے جا پہنچے ! گھروں کی گھروالیاں سہروں کے وارث کلیجے کے ٹکڑے نور کے چہیتے باوا اور ماؤں کی بیران اور جائیاں ماں باپوں کی جان کہاں گئے ؟ جنگل بیابان معمولی گورستان ! ایک ہو کا میدان کیلی کا کھٹکا نہ پتے کا کھڑکا ! شام کا جھٹ پٹا وقت آدمی نہ آدم زاد ! سینوں پر سونے والے اندھیرے گھپ میں پڑے ہیں !

اے نشۂ موت کے متوالو! اچھے سوئے کہ کروٹ تک لینی قسم ہوگئی! آغوش نصیب تھے تو کہ حسرت و ارمان کے خزانے ساتھ لے گئے کنگال آئے اور مالا مال ہو گئے!

اے دُنیا کا دم بھرنیوالو! جنگل کے رہنیوالو! بولو بولو! بولو نہ بولو مگر آنکھ تو کھولو! دیکھو یہ دنیا دنیا دھوکہ کیسی نکلی اور اس نے کیا روپ بدلا! تم مٹ گئے اور یہ بڑھیا وہی چوتھی کی دُلہن ہے! اُٹھو عدم آباد کے مسافرو اُٹھو اس کا گھونگھٹ کھولو اسکو منہہ دکھائی دو! دیکھو یہ عروس اپنے ہاتھوں کے گجرے تمہاری قبروں پر چڑھا رہی ہے! اسکی بھینی بھینی خوشبو اس کے ناز و انداز اس کی وضع طرح اسکی چال ڈھال تم ڈھا رہی ہے۔ اسی رفتار کلیجہ مل رہی ہو اور اسکی نگاہیں بجلی کے پار ہوتی ہیں! سنو سنو اس کے چہچہے کیا غضب کر رہے ہیں! دیکھو دیکھو یہ وہی دُبلی پتلی سمٹائی سکڑی سکڑائی کیا پھڑ پھڑ بول رہی ہے۔ بڑے بڑے عابد و زاہد اس کا منہہ تک رہے ہیں اور اچھے اچھے محتاط اس کی ایک نظر کے مشتاق کھڑے ہیں اور یہ سب کے دل لبھا رہی ہے!!!

یارانِ طریقت تمہاری رحلت عبرت کی جگہ تھی۔ مگر اس کی دلربائیوں نے سب کچھ بھلا دیا!! تمہاری تنہائی پر جی کڑھتا ہے مگر یہ روشن چاند یہ چمکتے ہوئے تارے یہ نسیم صبح یہ کھلے ہوئے پھول یہ دن یہ رات یہ جاڑا یہ برسات ربیع و خریف ہر چیز تمہاری حریف نکلی! تمہاری جدائی سے کلیجہ بہت تلملایا مگر ترقی روزگار حصولِ دولت طلبِ منفعت سب نے مل ملا کر تمہارا فراق طاق میں رکھوا دیا!!!

اے آنکھ کے تارو! اے پیاروں سکے پیارو اب تو ہم کو تمہارے خاک کے ڈھیر پر آنے کی بھی فرصت نہیں۔ تمہاری محبت آنکھوں دیکھنے کی تھی۔

تمہارے منہ موڑنے کی دیر تھی۔ ہم بالکل ہی چھوڑ بیٹھے! دو چار روز شوقِ ملاقات و حسرتِ دیدار نے تڑپایا مگر اب تو ہم تمہارے خیال کے بھی روادار نہیں!

جنتِ دنیا کے بسنے والو دیکھو زندوں کی محبت نے مُردوں کی یاد دل سے بھلا دی! آنکھ بند ہونے کی دیر ہے۔ اسی طرح یہ زندہ کبھی بھول کر بھی تم کو یاد نہ کرینگے!!!

منہ دل برین گنبدِ زرنگار
زسعدی ہمیں یک سخن یاد دار

محمد عبد الراشد الخیری

کلامِ اکبر

ہنگامۂ شکر و شکوہ دنیا میں ہے گرم
لیکن مرے دل سے یہ صدا آتی ہے
کھلتا نہیں رازِ دہر شکوہ ہے تو یہ
اور شکر یہ ہے کہ موت آجاتی ہے

منکر ہیں رُوح کے جو یہ اہلِ غرور
اک امر ہے پوچھنا اس میں ان سے ضرور
ہے فہم و خرد کا تم کو دعویٰ یہ کہو
پیدا کیونکر ہوا مادّے میں شعور

فرمانِ اجل کا آگیا وقتِ صدور
ہونگے کوئی دم شاملِ اہلِ قبور
دیکھیں منکر نکیر کیا کہتے ہیں
یاں سب مجھے کہتے ہیں خداوند حضور

گذرے مری نگاہ سے یاروں کے جھگڑے
مطلب یہ تھا سر وہ بڑھے اور غم گھٹے
کثرت سے صرفِ زر بھی ہوا صرف لفظ بھی
لیکن ہوا یہی کہ بڑھے آپ ہم گھٹے

ایماں کی ہر تاک کافری ہے تو یہ ہے
مذہب ہے مطیعِ ساحری ہے تو یہ ہے
اکبر داغ جاں سے بنگیا ہے مداح
ماشاءاللہ شاعری ہے تو یہ ہے

آخری تاجدارِ لکھنؤ

اور

مٹیا برج کلکتہ

تخت نشینی ۲۷۔ صفر ۱۲۶۳ھ پیر کی شب تھی کہ ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ سلطان عالم واجد علی شاہ بہادر تختِ شاہی پر جلوہ فرما ہوئے۔ مبارک سلامت کی دھوم ہونے لگی۔ نوبتوں سے مسرت میں آوازیں بلند کیں۔ ہر ساز سے صدائے طرب نکلنے لگی۔ روپیہ پر یہ سکہ پڑا ؎

سکہ زد بر سیم و زر از فضل تائید الٰہ
ظلِ حق واجد علی سلطان عالم بادشاہ

درِ دولت پر افسرانِ فوجی کا ہجوم تھا۔ رسالوں کی کرچیں چمک رہی تھیں۔ وہ تیغوں کی لال لال وردیاں اور چاروں طرف پلٹنیں تھی ہوئیں۔ ہر طرف رفل۔ چقماق اور پتھر کلے ہی دکھائی دیتے تھے۔ زنانی سنانی کا کہیں نام تک نہ تھا۔ ماہی مراتب کی ایک الگ شان۔ شترنالیں وہ برق دم کہ دنبوں پر انکی ضیا پھیلی ہوئی تھی۔ ہر شخص ادب سے استادہ۔ چوبداروں کی آوازیں بلند کہ "سلطان عالم سلامت رہیں"۔ غرض تمام شہر والا میں چہل پہل تھی مگر سلطان عالم کو شادی کے بدلے غم و محن تھا۔ چہرہ سے اندوہ و حزن آشکار تھا۔ دورِ غم اور دیشِ الم سے اشکِ مسلسل رواں تھے۔ جب ذرا اشک افشانی کم ہوئی تو مجتہد صاحب اور امین الدولہ بہادر آغا میر کو طلب فرمایا۔ اپنے والد ماجد کی تجہیز و تکفین کی اجازت دی۔ دس لاکھ فوراً میر عمارت کو مقبرہ کے لیے عنایت ہوئے۔ اسوقت سلطان عالم کی عمر ۲۶ برس کی تھی۔ تختِ سلطنت پر جلوہ آرا ہونے کے ساتھ ہی

فوجی انتظامات کی طرف مائل ہوئے۔ حکم ہوا کہ کسی صوبہ میں ایک ماہ سے زیادہ فوج ساکن نہ ہو۔ امین الدولہ اور ان کے استاد اور والد کے وقت کے وزیر تھے چونکہ زخمی ہو گئے تھے تاسا ہاتھ بیکار ہو گیا تھا اور لکھنے کے قابل نہ تھے۔ انہیں حکم ہوا کہ خانہ نشین ہوں۔ منصب وزارت علی نقی خاں کے سپرد ہوئی۔

سعادت علی خاں بہادر نے جارج چہارم شاہنشاہ انگلستان کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو قرض دیا تھا۔ غازی الدین حیدر آباد کے عہد میں بھی سرکار انگریزی نے قرض لیا تھا۔ امجد علی شاہ بہادر یعنے ان کے دادا کے وقت میں جنگ لاہور چھڑی تھی۔ اُس میں بادشاہ نے اعانت کی تھی اور لاہور کے مال غنیمت میں انہیں ایک توپ ملی تھی۔ اب دادا کا مال پوتے کے حصہ میں آیا۔ سلطان عالم نے اُسے زر دولت دعر پر لگایا تھا اور اُس پر یہ شعر کندہ تھا۔ ؎

چو اژدرہا بہ جان دشمن بسے داغ کہن دارم
حذر کن اے رقیب از من کہ آتش در دہن دارم

حضرت کو فوج سے زیادہ دلبستگی تھی۔ جب ہوا خوری کو نکلتے تھے تو ایک فیل توپ خانہ ہمراہ رہتا تھا۔ برجی توپیں کثرت سے تھیں۔ گھوڑ چڑھی پلٹن اردل میں رہا کرتی تھی۔ بڑے بڑے ہوشیار توپچی ملازم تھے۔ سلطان عالم کو ان امور سے اس قدر شوق تھا کہ توپ کے اندر کے چھپانے خود ملاحظہ فرمایا کرتے تھے۔ فوجیں بھی کچھ کم نہ تھیں مگر اِدھر اُدھر منتشر تھیں۔ اب یہ وہ فصل تھی کہ پھول شگفتہ گلشن نہال تھے اور ہر طرف بادِ مراد چل رہی تھی۔ اب زمانہ نے پلٹا کھایا۔ سلطان عالم برابر علیل رہا کرتے تھے حرارتِ قلب و جگر بہت بڑھ گئی تھی۔ وحشت اور مراق کی شکایت تھی۔ حاشیہ بوسان سلطنت نے دفعِ خفقان کے لئے تعیش کی طرف مائل کیا۔ مگر پھر مائل ہوئے تو ہو سکے۔ اِدھر علی نقی خاں نے رذالت پسندی اختیار کی بقول بادشاہ

"نہ کچھ ملک داری کی تدبیر کی
یہاں تک کہ سب سلطنت مٹ گئی"

زوال سلطنت | سلطانعالم سلطنت سے غافل ہو گئے۔ عہد و پیمان سرکار انگریزی کا مطلق خیال نہ رہا۔ یہاں تک کہ کرنیل سلیمن صاحب نے دورہ کیا۔ رعایا کی ابتری دیکھی۔ مولوی امیر علی صاحب شہید اور ہنومان گڑھ کا قضیہ شروع ہو گیا۔ اس زمانہ میں بہت سے امور لاطائل بادشاہ کی جانب منسوب ہوتے رہے۔ جب سلطنت کو دس برس ہوئے تو طالع بیدار سونے لگے۔ وہ لارڈ ڈلہوزی کا زمانہ تھا۔ حکم سرکار کمپنی ہوا کہ آپ سے تمام رعایا ناراض ہے۔ ڈیڑھ لاکھ روپیہ مہینہ آپ کے مصارف کے لئے مقرر کیا گیا۔ آپ سلطنت سے دست بردار ہوں۔ ۲۷۔ جمادی الثانی ۱۲۷۲ھ کو جنرل اوٹرم نے گورنر جنرل بہادر کا وہ خط لا کر دیا۔ اُس وقت درِ دولت اور محلاتِ معلیٰ میں کُہرام پڑ گیا۔ فوجیں بھی دفعتًا دریا کی موج کی طرح کانپور پہنچ گئیں۔ یہاں بجز اس کے ع

"سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے"

کچھ چارہ نہ تھا چنانچہ ایک مقام پر ایک نظم میں خود فرماتے ہیں۔ ؎

"اگر جنگ کرتا تو دس سال تک ۔۔۔ مگر آخرش تھی شکست ان کی بیک
کجا سلطنت اور کجا پائے مور ۔۔۔ ہوں سید ہاں مسلماں کہاں مکر و زور"

دوسری وجہ یہ بھی تحریر فرمائی ہے کہ وزیر بد اقبال بھی ساتھ دینے پر تیار نہ تھا اور اس کم ہمت پست خیال کے باعث خزانے میں روپئے کی کمی تھی۔ فوجیں بھی خود پسند تھیں اور پاس زیادہ مصالح نہ تھا کہ مقابلہ کرتا۔ پھر سپاہ پیادہ کیا لڑتی اور تاب جنگ لا سکتی۔ اس زمانے میں بادشاہ علیل اور علی نقی خاں ہر حال میں مشیر تھے۔ سلطانعالم ایک مقام پر خود ذکر فرماتے ہیں کہ میں نے خیال کیا سلطنت گئی تو گئی۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب راضی نامہ پر مہر کر دو۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ کلکتہ جا کر فریاد کرنا چاہئے۔

بیٹھ گئے۔ ارکینِ دولت اور رعایا کو سمجھایا۔ عزیزوں سے کہا کہ خدا حافظ میں رخصت ہوتا ہوں۔ پانچویں رجب پنجشنبہ کے روز اپنی والدہ ماجدہ بھائی۔ ولیعہد بہادر۔ پانچ چھ محلات اور کاروانِ نالہ و غم کے ساتھ لکھنؤ سے روانہ ہوئے اور کانپور داخل ہوئے۔ یہاں برنڈن صاحب کے بنگلہ میں مقیم ہوئے۔ بنگلہ نہایت تنگ و تاریک تھا کچھ مزاج ناساز ہو چلا۔ غرض مسہل لئے اور طبیعت درست ہوئی۔ رجب بھر وہیں قیام فرمایا۔ شعبان میں فتحپور پہنچے۔ وہاں بھی اتفاق سے ایک بوسیدہ اور خراب بنگلہ ملا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ ؎

"پانچ بتی کا کہنہ سا چھپر سایہ کے ساتھ دھوپ آٹھ پہر
لو کے جھونکے ہوائے گرم و تیز جائے ماندن کہیں نہ پائے گریز"

صرف دن بھر اس بنگلے میں رہے۔ شب کو گاڑی پر سوار ہوئے۔ نہ کوئی چتر شاہی تھا نہ ڈنکا۔ اس کے بدلے ابرِ غم سایہ کناں تھا اور آہ و نالے زیرلب تھے۔ ناگہاں گاڑی کے پہیئے مٹی میں دھس گئے۔ اس گاڑی میں جعفری بیگم بھی ہمراہ تھیں عجب خرابی میں مبتلا ہوئے۔ بادشاہ اترے اور بنفسِ سرد کے ساتھ پہیے خود کھینچے۔ اس وقت جعفری بیگم کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ غرض جوں توں کر کے چالیس کوس کی مسافت طے کی اور صبح کو الہ آباد پہنچے۔ گرمی اُس زمانہ میں قیامت کی پڑ رہی تھی۔ وہاں ایک بھٹیارے کا کمرہ ملا اور بقولِ بادشاہ:

"دھوپ نے چھائی تھی وہاں چھاؤنی"

آٹھ دن نہایت کرب و اضطراب کے ساتھ گذارے۔ نویں روز صبح کے وقت گوپی گنج داخل ہوئے۔ وہاں صاحبِ مکان نے پانچ سو کرایہ کی جگہ ایک ہزار لیا۔ اب وہاں سے بھی رخصت ہوئے۔ اثنائے راہ میں گھوڑوں کی باگ ٹوٹ گئی اور ایک دن کے بعد بنارس تشریف لائے۔ مہاراجہ اودت نرائن سنگھ بہادر نے بڑی خاطریں کیں۔

نذر دی جواہرات کی کشتیاں پیش کیں۔ تصدق کے لئے پانچ ہزار روپے بھیجے۔ اور اپنی خاص کوٹھی بادشاہ کے قیام کے لئے آراستہ کی۔ خس کی ٹٹیاں کیوڑے گلاب سے چھڑکوائیں۔ بڑی سیرچشمی اور حوصلہ سے دعوت کی۔ دو لاکھ روپئے مہمانداری میں صرف کئے۔ بادشاہ کی تشریف بری کے وقت مہاراج نے پھر ملاقات کی اور نذر دکھائی۔ بادشاہ نے فرمایا کہ میں مجبور اور تہیدست ہوں۔ کیا خاطر کروں۔ اس کے بعد موتیوں کا ایک مالا جس میں اکیس بڑے بڑے موتی تھے اور یاقوت زمرد اور ہیرے کا ایک ایک نگہ مرحمت فرمایا۔ بنارس میں بادشاہ کا مزاج بہت شگفتہ ہوگیا تھا۔ ستائیس روز وہاں قیام فرمایا۔ اٹھائیسویں روز دخانی جہاز پر سوار ہوکر عظیم آباد تشریف لائے۔ دو شب اور تین دن تک گدام گھاٹ میں شاہی بجرہ لگا رہا۔ فقط دیانت الدولہ بہادر اور چند اصحاب صبح یا تیسرے پہر کو جہاز سے اُتر کر گھاٹ پر ٹہلتے تھے ورنہ سب کے سب جہاز ہی پر رہتے تھے۔ بادشاہ کو اختلاج اور گرمی کی شکایت تھی۔ تسکین قلب کے لئے کھیرے تراش تراش کر سونگھائے جاتے اور دریا میں پھینک دیئے جاتے تھے۔ گھاٹ کے کنارے تمام کھیرے ہی کھیرے نظر آتے تھے۔ غربا ٹوکریوں میں جمع کر کے اپنے گھر لیجاتے تھے اور بال بچوں کو کھلاتے تھے۔ روسائے عظیم آباد اور منظور علی خاں خواجہ سرا جو نواب وزیر علی خاں کے ایک حرم کے ساتھ عظیم آباد رہ گئے تھے۔ اُنھوں نے آرزوئے حضوری اور تمنائے آستانبوسی ظاہر کی مگر درخواست قبول نہ ہوئی صرف دیانت الدولہ بہادر سے ملاقات ہوکر رہگئی۔ تیسرے روز عظیم آباد سے روانہ ہوئے۔ راہ میں آندھیاں آئیں۔ بجلی چمکی۔ پانی برسا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ ؎

"برق کا شور رعد کا وہ زور ۔۔۔ برق کی روشنی سے چشم تھی کور"

موجوں کے تلاطم سے بادشاہ گھبرا گئے۔ دوران سر ہوگیا تھا۔ غم سے حالت تباہ تھی۔

بقول بادشاہ۔

" تار پسطر سی ہو گئی نفس رگیں پاؤں ممکن نہ تھا زمیں پہ جمیں"

اسی حالت میں ۱۹ دن کے بعد ۹۔ فروری ۱۸۵۶ء کو داخل کلکتہ ہوئے۔

ورود کلکتہ | یہاں رات دن پانی برستا تھا۔ مہاراجہ بردوان کی کوٹھی پانچ سو پر کرایہ لی۔ گورنر جنرل بہادر نے اس مضمون کا محبت نامہ بھیجا۔

"بہ استماع ایں معنی کہ بسبب عدم اعلان دہی ورود فرمودن آں اریکہ حشمت در نواح کلکتہ باعث افسردگی خاطر عاطر گردید و موجب تاسف شد معہذا حالی رائے شریف می سازد کہ اخلاص مند فرمان دادہ کہ بابت دیک شلک سلامی توپ جہت اعزاز آں رونق بخش سریر فرواروز چہارشنبہ بوقت نواختن ساعت چار بعد دو پاس از قلعہ سر خواہند شد"

علالت مزاج کی وجہ سے بادشاہ لندن تشریف نہ لیجا سکے۔ جب شوال آیا تو بیماری نے اور بھی ترقی کی۔ چودھویں تاریخ۔ بیٹے۔ بھائی اور اپنی والدہ کو تکالیف گراں بہا اور دو برس کا خرچ سفر دیکر حسرت و آہ رخصت کیا کہ وہ لندن جاکر استغاثہ پیش کریں۔ حسب مرگ روانہ ہوگئے۔ خاص محل بہبرہ گئی اور اُن سے کچھ شکر رنجی ہو گئی چنانچہ ایک نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"تھیں جو ہمراہ میرے خاص محل	حرکات زبوں یہ کرکے عمل
ما بیٹھیں میرے پچاس ہزار	سانس تک بھی نہ کی ذرا نہ ڈکار
الغرض اب عجب تباہی ہے	نہ حکومت ہے اور نہ شاہی ہے
کوئی سنتا نہیں مری فریاد	جز خدا کون دیگا میری داد"

پرچہ پیام بادشاہ | دوسرے روز ۱۵ رمضان ۱۲۷۳ھ کو بادشاہ نے کلکتہ سے گورنر جنرل بہادر کو اس مضمون کا پرچہ پیام بھیجا کہ اس سنہ تک گرما ہیں آپ کے ظل عاطفت

پہ بھروسہ کر کے مَیں نے سفرِ دُور و دراز اختیار کیا۔ اپنے عزم سے میجر اوڈرم صاحب کو مطلع کر چکا تھا کہ وُہ قبل سے آپ کو اطلاع دے رکھیں۔ اقتضائے زمانہ جواب کے بعد تمام اسباب ضروری اور متوسلین کو چھوڑ کر صرف چند انفاس اور عزیز قریب اپنے ہمراہ لیکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اِس سفر میں جو جو مصائب رُوحانی اور جسمانی مَیں نے اُٹھائے وُہ زبانِ قلم سے ادا نہیں ہو سکتے۔ میرے ساتھ نہ تو کوئی آسایش کا سامان تھا نہ راحت کا۔ ان شدائد محن اور مضطربانہ حالت میں قطع مسافت کرتا خشکی کی راہ سے بنارس تک پہنچا اور وہاں سے کشتی دخانی پہ سوار ہو کر اظہارِ حقیقت حال کے لئے یہاں تک آیا ہُوں مگر اس تقویت نے کہ میرے آپ کے عہد و پیمان دائی ہیں مجھ میں مادہ صبر و شکیب پیدا کر دیا اور منزلِ محبت میں مَیں نے مصائب یا خستگی ترکا کچھ بھی خیال نہ کیا اور جس طرح ہو سکا۔ وارد دارالسلطنت کلکتہ ہوا۔ لیکن بکمال افسردہ خاطر ہوں کہ باوجود مضامینِ شفقت آگین جو آپ کے مفاوضہ عالی سے مترشح ہیں اسوقت تک کوئی بھی پرسش حال کے لئے نہ آیا اور چونکہ طبیعت اخلاصمند جادۂ اعتدال سے منحرف ہی۔ اِس لئے مَیں خود سفرِ لندن اختیار نہ کر سکا۔ جناب عالیہ کے ہمراہ مرزا سکندر حشمت اور مرزا ولیعہد بہادر کو ولایت روانہ کر دیا ہے۔ اِس لئے بعید از اخلاص پرستی نہ ہوگا اگر آپ وزرائے سلطنت کو تحریر فرمائینگے کہ بارگاہِ خلائق پناہ میں احترام کے ساتھ اُنکی باریابی ہو۔"

اِس کے جواب میں وائیسرائے نے تحریر فرمایا کہ دوبارہ عہد و پیمان مباحثہ کرنا محض عبث ہی مگر جنابعالیہ اور اُن کے ہمراہیوں کی تقریب ملاقات بکمال عزت کیجائیگی اور نہایت احترام کے ساتھ دربار شاہی میں پیش کیئے جائینگے"۔ بادشاہ نے اس امر خاص کے شکریہ کے لئے مکرم الملک احمد علیخاں بہادر ذوالفقار جنگ کو حضور وائیسرائے کی خدمت میں روانہ فرمایا۔

کارندگانِ شاہی کے خطوط

اب بادشاہ کے کلکتہ تشریف لانے سے لکھنؤ میں شورِ محشر برپا تھا۔ قاعدہ ہے کہ جب سلطنت دوسرے فرمانروا کے ہاتھ میں منتقل ہوجاتی ہے تو دفترِ پارینہ بالکل پامال اور نئے نئے انتظامات اور تغیرات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ نہ وہ زمین رہتی ہے نہ وہ آسمان۔ بالکل کایا پلٹ جاتی ہے۔ چنانچہ لکھنؤ کا ستارہ ڈوب چکا تھا اور گردشِ دوران نے اس کی قسمت کا اچھی طرح فیصلہ کر دیا۔ گورنمنٹ انگریزی پوری مداخلت سے کام لینے لگی اور انتظاماتِ جدید کی داغ بیل پڑ گئی۔ مسیح الدولہ وکیل شاہی بادشاہ اور کارندگانِ شاہی نے خط پر خط لکھنے شروع کیے کہ حکامِ انگریزی نے تمام جگہ مزاحمت شروع کر دی۔ کوٹھوں پر پہرے بیٹھ گئے۔ اثاثہ کا اندازہ لیا جاتا ہے۔ بیش قیمت چیزیں تباہ اور برباد ہو رہی ہیں۔ محلاتِ محلّی پر ظلم و تشدد ہوتے ہیں۔ غرض روز روز کی خبریں بھیجتے رہتے تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر بادشاہ نے ۸۔ ذوالحجہ ۱۲۷۲ھ کو ایک پرچہ پیام اس مضمون کا والسرائے کی خدمت میں روانہ کیا "جس قسم کی تعدی اخلاص مند نے اٹھائی اور جس قدر اس کی نوبت ہوئی ابتدائے عملداری سرکار سے عشر عشیر کسی کی نہ ہوئی ہو۔ باوجود شرائطِ قدیم سو برس کی سلطنتِ موروثی مجھ سے لے لی گئی۔ کروڑوں کا اسباب ضبط اور معرضِ تلف میں آیا۔ وہ عمارتیں جو لاکھوں کے صرف میں بنی تھیں اور اسلاف کی نشانیاں تھیں منہدم کر دی گئیں۔ بارہ دری فرحت بخش جو تخت گاہ اور حکامِ انگریزی کی دعوت کے لئے مخصوص تھی اس میں عساکر و اسپ باندھے گئے۔ تمام دفاتر اور منشی خانوں پر پہرے مامور ہوئے کوٹھے جات جو مقفل تھے اُن کے قفل توڑ کے اسباب تلف اور ضائع کئے گئے۔ دواب جس میں بیش قیمت گھوڑے اور ہاتھی[1] وغیرہ تھے وہ بہ قیمتِ ارزل نیلام ہوئے۔

[1] سب ملا کر سترہ سو ہاتھی تھے جن میں بیس جنگی تھے۔ بادشاہ کی سواری کے چند ہاتھی تھے۔ بہیر، دلسندر، خوش منظر، اختر پسند، حضور پسند۔ جہانت سیہ ہوتے تھے اور یہ خدمت سیدوں ہی سے متعلق ہوتی ہے ۱۲

کیا عرض کروں۔ ہر روز ایک امر تازہ ہوتا ہے جو اخلاص ہند کی ذلت اور خواری کا سبب ہو۔ اہلکارانِ لکھنؤ کی تحریریں پڑھ کر جو دل کا حال ہوتا ہے اس کا بیان غیر ممکن ہے۔ آپ کی دوست نوازی اور معدلت پروری سے مترصد ہوں کہ آپ بذریعہ تار برقی حکام ریست سلطنتِ لکھنؤ کو تحریر فرمائیں کہ تخلیہ مکان اور ہتک ناموس سے باز آئیں اور جو جواب آئے اُسے خاطر شوریدہ کی طمانیت کے لئے آپ مرحمت فرمائیں"۔

اب لکھنؤ کے خطوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میاں عتیق۔ میاں یعقوب علیخاں وغیرہ خواجہ سراؤں نے اِس قسم کی عرضداشت بھیجی کہ صاحبان انگریز چھتر منزل کے خالی کرنے پر اصرار فرما رہے ہیں۔ ہم لوگوں نے عرض کی کہ ابتدائے جلوسِ سلطان عالم سے یہ مکان خاص جائے سکونتِ محلات معلّی ہے مگر ان حضرات نے ہماری معروضات پر کچھ توجہ نہ کی اور کہا کہ آپ لوگ جا کر چیف کمشنر سے کہیں۔

۱۲۔ اگست سنہ ۱۸۵۶ء کو اہلکاران شاہی کا ایک دوسرا خط آیا کہ آج اجنٹ صاحب نے صحت الدولہ بہادر کو تہدید و تاکید سے کہا کہ کل تمام مکانات خصوصاً چھتر منزل دیکھنے چلونگا۔ تمہیں بھی ساتھ چلنا اور وہاں پردہ کا بندوبست کرنا ہوگا۔ صحت الدولہ بہادر نے کہا کہ تخلیہ مکان میرے اختیار میں نہیں۔ محلات معلّی سے عرض کروں جو کچھ ارشاد ہوگا وہ گذارش کرونگا۔ صحت الدولہ بہادر نے اسکی اطلاع حسام الدولہ بہادر اور محلات معلّی سے کی۔ حسام الدولہ بہادر نے سکوت اختیار کیا مگر ایک تحریر تخلیہ مکان کے عذر میں صحت الدولہ بہادر کے پاس بھیجی اور وہ تحریر محلات معلّی اور جملہ داروغاؤں کے اتفاق سے قائم مقام چیف کمشنر صاحب بہادر کے پاس لچھمن داس جمعدار کے ہاتھ روانہ کی گئی۔ صاحب ممدوح نے برہم ہو کر فرمایا کہ کل مکانات کے معائنہ کے لئے ضرور جاؤنگا۔ نہ تحریر پڑھی نہ کسی داروغہ کو طلب کیا۔ آج کی حقیقت یہ ہے"۔

۲۲۔ اگست کو ایک اور خط اس مضمون کا بادشاہ کی خدمت میں پہنچا "صبح کو اجنٹ صاحب

بہادر نے صمصام الدولہ بہادر سے پوچھا کہ چھتر منزل وغیرہ خالی ہو گیا۔ اُنہوں نے عرض کی کہ محلاتِ معلّٰی کیطرف سے تمام داروغہ عذر خواہی کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ اس پر صاحب موصوف غیظ و غضب کی حالت میں گھوڑے پر سوار ہو کر جلو خانہ کی طرف چلے جو منہدم ہو رہا ہے۔ اور نہر فرحت بخش نشیب چھتر منزل میں پہنچکر صمصام الدولہ بہادر سے پوچھا کہ یہی چھتر منزل ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا حضور ہاں۔ پوچھا ابھی تک خالی نہ ہوا۔ اُنہوں نے کہا "نہیں"۔ پھر چین بہ جبیں ہو کر نگار محل کے پائیں باغ میں آئے۔ وہاں تخلیہ مکان کی نسبت پھر استفسار کیا۔ اُنہوں نے پھر وہی جواب دیا۔ اس کے بعد شہزادہ واجد کے قریب پہنچے۔ اس اثنا میں میرزا محمد علی داروغہ ڈیوڑھی سلطان محل صاحبہ نے ایک تحریر مرسلہ محلاتِ معلّٰی پیش کی۔ صاحب بہادر نے فرمایا کہ اب تحریر نہیں دیکھتا۔ تخلیہ مکان ہوا کہ نہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ محلاتِ معلّٰی عذر کرتے ہیں۔ اس پر صاحب موصوف نے کہا کہ تم ہماری عدول حکمی کرتے ہو اور صمصام الدولہ بہادر کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم بڑے بے ادب ہو۔ کارینگی صاحب بہادر نے نبیرۂ ذوالفقار الدولہ نواب سید محمد حسین خان صاحب بہادر[1] خلف برادر سلطان نواب ذوالفقار الدولہ اور برادر زادہ نشاط محل صاحبہ سے پوچھا کہ آپ محل کے اندر جاتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا کہ ایک دن کے عرصہ میں چھتر منزل خالی ہو جائے اور محلات مع صاحب منزل مقبرۂ نواب سعادت علی خان بہادر میں جا کر قیام کریں۔ غرض محلاتِ معلّٰی میں تلاطم ہے۔ کوئی عذر سنا نہیں جاتا۔ (باقی آیندہ)

---

[1] آپ ابھی تک کلکتہ میں بقیدِ حیات ہیں اور پولیٹکل پنشن پاتے ہیں۔ نہایت ہی خوش خلق۔ مہذب علم دوست اور پرانی تاریخوں سے خوب واقفیت رکھتے ہیں ۱۲

چین کی مراسم شادی

ہندوستان کی طرح چین میں بھی مناکحت یا شادی ایک مذہبی رسم خیال کیجاتی ہے۔ اور بیس برس کی عمر سے پہلے اکثر لڑکوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ چینیوں کا عقیدہ ہے کہ اگر باپ کی وفات کے بعد کوئی بیٹا کریا کرم کے واسطے موجود نہ ہو تو اُس کی نجات نہیں لہذا اولاد کی غرض سے چینی جلد شادی کر لیتے ہیں۔ اکثر کے ایک بیوی ہوتی ہے۔ مگر بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا بھی یہاں رواج ہے اور اس کے واسطے کوئی سزا مقرر نہیں ہے۔ ایک ذی مرتبہ شخص متعدد بیویاں کر سکتا ہے لیکن سب سے پہلی عورت زوجہ جائز قرار پاتی ہے۔ عقد بیوگان کی چین میں اجازت نہیں ہے۔

بچوں کی بہت کم عمری میں نسبت ہو جاتی ہے اور یہ سخت مصیبت ہے کہ جس لڑکی کا منسوبہ شوہر مر جائے وُہ پھر شادی نہیں کر سکتی کیونکہ وُہ بھی بیوہ شمار کر لی جاتی ہے۔ شادی دوسرے آدمیوں کے ذریعہ سے قرار پاتی ہے جس میں لڑکے اور لڑکی کی مرضی کو ذرا بھی دخل نہیں دیا جاتا۔ کسی چینی کی شادی کے وقت یہ سوال نہیں ہوتا کہ دلہن نیک یا باسلیقہ یا ہوشیار یا تعلیم یافتہ بھی ہے۔ بلکہ اس کے پاؤں کا طول دریافت کیا جاتا ہے اور سب سے زیادہ حُسن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پاؤں تین انچہ سے زیادہ طویل نہ ہوں۔ دولہا اپنی دلہن کی شکل شادی کی رات سے پیشتر کبھی نہیں دیکھنے پاتا۔ جب لڑکی کا باپ شادی کرنے پر رضا مند ہوتا ہے تو دولہا کی طرف سے کچھ تحائف بھیجے جاتے ہیں۔ اور دونوں کے جنم پتر ملائے جاتے ہیں۔ اگر مطابق ہوں جس کو بدھ ملجانا کہتے ہیں تو شادی کی تاریخ مقرر ہو جاتی ہے۔ لیکن بضرورت یہ تاریخ بدل بھی جاتی ہے مثلاً تقرر تاریخ شادی سے

تین دن کے اندر اگر کوئی قیمتی چیز ٹوٹ جاوے یا چوری جاتی رہے تو دوسری تاریخ معین کی جاتی ہے۔ شادی کی تاریخ مقرر ہونے کے دن تک لڑکی سخت پردے میں رہتی ہے اور باپ کے دوست یا رشتہ دار ملنے آتے ہیں تو وہ مکان کے کسی اندرونی حصے میں جا کر چھپ جاتی ہے۔ دولہن کا باپ دولہا کے باپ سے کچھ نذر نقد اس کی حیثیت کے موافق لیتا ہے اور نجومی جو تاریخ مقرر کر دیتے ہیں اُس روز شادی کا آخری جلسہ ہوتا ہے

چین میں بھی شادی کے موقعوں پر طرفین بہت فضول خرچی کرتے ہیں۔ مہمان پہلے دولہا کے گھر جمع ہوتے ہیں اور پھر دولہن کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ دولہا کے گھر لاتے ہیں۔ دلہن کا لباس بہت زرق برق ہوتا ہے۔ اُس کے لمبے لمبے سیاہ بالوں میں جواہرات اور مصنوعی پھول افراط سے لگائے جاتے ہیں۔ اس کے چہرے کو رنگتے ہیں لبوں کو سُرخ، ابرو کو سیاہ اور لباس کو معطر کرتے ہیں چینی عورتوں کا رنگ دلفریب، نگاہ شیریں، ہاتھ خوش قطع، دانت چھوٹے و خوبصورت اور بال سیاہ ہوتے ہیں۔ آنکھوں کی تیزی و چمک انہیں زیادہ دلربا و دلکش بنا دیتی ہے۔ ظاہری نقص اُن میں یہ ہے کہ رنگ کا استعمال زیادہ کرتی ہیں۔ خیر جب دلہن کو لاتے ہیں تو جلوس کے آگے آگے سور کا گوشت لیکر چلتے ہیں تاکہ شیطان اس طرف سے شاد رہیں اُسے کھاویں اور ہر طرح خوش ہو کر دولہا دولہن کو کچھ نقصان نہ پہنچاویں۔ جب دولہن دولہا کے دروازے پر پہنچتی ہے تو اُسے اُس زرین ڈھکی ہوئی کرسی سے باہر نکال لیتے ہیں جس میں وہ وہاں آئی ہے اور دروازے کی چوکھٹ پر ایک انگیٹھی رکھدیتے ہیں جسے پھاند کر دولہن اندر جاتی ہے۔ دہکتے ہوئے کوئلوں کی یہ انگیٹھی ایسی خوش نصیب عورتیں لاکر رکھتی ہیں جن کے بچے اور شوہر زندہ و سلامت ہوں۔ ایک کمرہ جو استقبالی کمرہ کہلاتا ہے دولہا کے واسطے مخصوص کر دیا جاتا ہے جس میں وہ کسی قدر اونچے فرش پر بیٹھا

رہتا ہے۔ دولہن اس کمرے میں جاتی ہے اور جب لبِ فرش پہنچ جاتی ہے تو سربسجود ہوکر دولہا کی قدمبوسی کرتی ہے۔ دولہا آگے بڑھ کر اُسے اُٹھاتا ہے اور اس کا سہرہ ہٹا کر پہلی دفعہ اس کا منہہ دیکھتا ہے۔ بغیر کچھ بولے دونوں زانو سے زانو ملا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہر ایک یہ کوشش کرتا ہے کہ وُہ دوسرے کے کپڑے دبا کر بیٹھ سکے کیونکہ چین میں یہ خیال ہے کہ اس وقت جو دوسرے کے کپڑوں پر بیٹھ جائیگا آیندہ خانگی معاملات میں وُہی غالب رہیگا۔ اس کے بعد دونوں بڑے کمرے میں جاتے ہیں۔ اور خاندانی عبادتگاہ میں زمین آسمان اور مورتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ پھر وُہ کھانے کے کمرے میں جاتے ہیں اور اس کمرے کے کھلے ہوئے دروازوں سے مہمان جھانک جھانک کر دیکھتے ہیں اور دولہن کی صورت وچال چلن پر رائےزنی کرتے ہیں۔ پھر نوکر ہر ایک کو شراب کا پیالہ دیتا ہے اور دولہا دُلہن دونوں آپس میں معاہدہ کرتے ہیں۔ اسی طرح نکاح ہوجاتا ہے۔

مرد اپنی بیوی کو مفصلۂ ذیل قصوروں میں سے کسی قصور کے سرزد ہونے پر طلاق دے سکتا ہے:۔ (۱) خسر یا خوشدامن کی نافرمانی (۲) بانجھ ہونا (۳) زنا (۴) جذام (۵) رشک (۶) زبان درازی (۷) چوری۔ بخلاف اس کے مرد کچھ ہی قصور کیوں نہ کرے عورت طلاق حاصل نہیں کرسکتی اور کسی حالت میں عورت اپنے شوہر کی بدچلنی کی شکایت اس سے زیادہ نہیں کرسکتی کہ مؤدبانہ عرض معروض کرے اور یہ خیال رکھے کہ شوہر رنجیدہ نہ ہوجائے۔ چینی عورتیں اپنے خاوندوں کی بہت ہی اطاعت و فرماں برداری کرتی ہیں تاہم اُنکی حالت بہت ذلیل ہے اور اُن کا درجہ بہت کمتر خیال کیا جاتا ہے۔ منکوحہ عورات کی تکالیف اس قدر بڑھی ہوئی ہیں کہ بعض عورتیں شادی کرنے کے مقابلے میں جوگن بنجانا اچھا خیال کرتی ہیں اور بعض خودکشی کرلیتی ہیں۔ عوام اس فعل کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور ایسی

عورت کی یادگار قائم کی جاتی ہے تاکہ ہمیشہ اس کا نام عزت کے ساتھ لیا جاوے۔

ہندوستان کی طرح چین میں بھی یہی رواج ہے کہ شادی ہو جانے کے بعد بھی لڑکے اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہیں اور اس طرح دولہن کو بھی اپنے خاوند کے والدین کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ اس رواج سے بہت سی تکالیف پہنچتی ہیں اور بہت سے خانگی جھگڑوں کی وجہ یہی رواج ہے۔ لیکن یہ رسم ایک غیر محدود زمانہ سے چلی آتی ہے اور ہر ایک آنے والی نسل کو اسی کی تعلیم ملتی ہے۔ جب ساس اور بہو کا مزاج موافق ہوتا ہے تو وُہ خوشی کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ دونوں اپنے اپنے فرائض سے واقف ہوں اور دونوں کے مزاج میں تحمل ہو۔ چینی کہتے ہیں کہ اس معاملہ میں لڑکے (خاوند) پر بڑا حصر ہے۔ اگر وہ اپنے والدین کا مطیع ہو تو خانگی جھگڑوں کو بڑی حد تک روک سکتا ہے اور اگر وہ بیوی سے شکایتیں نہ سُنے تو صلح رہیگی لیکن نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو ماں ناراض ہو جاتی ہے یا بیوی۔ دونوں کو خوش رکھنا نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اگر ساس کا ایک بہو کے ساتھ اچھا برتاؤ ہو تو یہ ضروری نہیں ہے کہ اور بہوؤں کے ساتھ بھی اچھا ہو یا بہوئیں آپس میں صلح سے رہیں۔ ہندوستان میں بھی یہی خاندان مشترکہ کا رواج ہے مگر آہستہ آہستہ اس کا شیرازہ پریشان ہوتا جاتا ہے۔

شادی کے بعد اولاد کی بڑی تمنا ہوتی ہے۔ ایک طریقہ حصولِ اولاد کا یہ ہے کہ اولاد کے دیوتا کا ایک جوتا لاتے ہیں اور گھر میں رکھکر اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اگر خواہش پُوری ہو جائے تو ایک جوڑہ اُسی قسم کے جوتے کا بنوا کر مندر میں رکھ آتے ہیں۔ اس بات کا اطمینان کرنے کی غرض سے کہ عورت کے لڑکا ہوگا وُہ کسی دن بہت سویرے اُٹھتی ہے اور اپنے شوہر کا لباس پہنکر سب سے قریب کے کنوئیں کے گرد بائیں طرف کو تین چکر کاٹتی ہے۔ پھر گھر کو چلی آتی ہے۔ اس آمد و

رفت ہیں اگر کوئی شخص اس کو نہ ملے تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ لڑکا ہوگا۔

ان تمام مراسم سے ظاہر ہوتا ہے کہ چینی نہایت ہی ضعیف الاعتقاد ہیں اور تہذیب و شائستگی سے بہت دور ہیں۔ ان کے یہاں عورتوں کی جو ذلیل حالت ہے اس سے خود مردوں کی ذلّت و پستی ظاہر ہوتی ہے۔ شادی کے موقعہ پر چین میں دولہا دلہن کے گھر نہیں جاتا اور دولہن خود دُلہا کے گھر آجاتی ہے اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ چینی عورتوں کی عزّت گوارا نہیں کرتے۔ یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ جس قوم میں عورتوں کی عزت کرنے کا مادہ مفقود ہے وُہ ایک نہ ایک دن صفحہ ہستی سے ضرور نیست کر دیگی۔ انگریزوں کو دیکھو کہ وُہ اپنی عورتوں کی کیسی عزت کرتے ہیں تو دنیا میں انکو کیسی عزّت و شہرت حاصل ہے۔ عورت جس کی بابت ایک انگریز شاعر کہتا ہے "اے عورت تو نے انسان کے لیے اس دنیا کو جنت بنا دیا" کیا محبت و عزّت کی مستحق نہیں ہے اور کیا وجہ ہے کہ کسی حقدار کو اس کا حق نہ دیا جاوے۔ اگر کسی کو اس کے حق سے ہم محروم رکھیں تو یہ ہمارا ظلم ہے +

نیاز احمد ازمیرٹھ

کلامِ شاعر

ازل سے ہوں محوِ تماشا کسی کا — نگاہوں میں پھرتا ہے جلوا کسی کا

جگر تھام کر آپ بیٹھیں تو پہلے — ہنسی کھیل ہے کچھ تڑپنا کسی کا

تمہیں تو تسلی تشفی کروگے — تمہیں سے تو ہوگا مداوا کسی کا

سدا ہاریں کھلا آپ کیا دیکھتے ہیں — جب نہ دیکھی کا تماشہ کسی کا

عدو اور تم سے ملے بیغرض وہ — نہ کھلوا، بس ہم سے پردا کسی کا

سنبھالا نہ تم نے اجل نے جلایا — کہیں کام رکتا ہے داتا کسی کا

مجھے یاد ہے میں نہ بھولونگا شاعر — وہ ہنس ہنس کے منہ پھیر لینا کسی کا

علم کی خوشیاں

تلاشِ حقیقت جزوِ شرافت ہے ۔ اور اس کا حصول داخلِ خوبی و زیبائی ۔ انسان کے دل کا یہ پرانا خیال ہے کہ علم دولت سے بہتر ہے اور یہ خیال بڑا گہرا متبرک اور صحیح ہے ۔ جذباتِ انسانی کی اس موجِ عظیم کو دیکھنا جو مدتِ مدید سے بہ رہی ہے ۔ قوموں کی ترقی و تنزل کے اسباب پر غور و فکر کرنا ۔ گرمی روشنی اور ہوا پر بحث کرنا ۔ آسمان اور زمین کے متعلق جو کچھ انسان نے دریافت کیا ہے اسے جاننا ۔ عالم علم کیمیا سے یہ سننا کہ خالق نے زمین میں کتنی تعجب انگیز خاصیتیں ودیعت کی ہیں ۔ طبیعی دان سے یہ معلوم کرنا کہ اس زمین سے پرے کئی اور زمینیں اتنی دور ہیں کہ روشنی جیسی تیز رفتار شئے بھی آجتک وہاں سے یہاں تک نہیں آئی ۔ الغرض ان سب چیزوں کا علم اور اسی تربیت کا حاصل کرنا جو ان کے علم کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ ایک ایسی شئے ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنی جوانی کے دنوں میں بدل وجان کوشش کرنی چاہئے ۔

شعر کی دنیا کی سیر کرنا اور اس فصاحت سے گرمجوش ہونا جو یونان اور روم کی سلطنتوں پر حاکم تھی ۔ بڑی بڑی فلاسفروں کے ساتھ تمام چیزوں کی علت غائی تک جانا اور اس امر کا معلوم کرنا کہ باوجود دنیا کی بے ترتیبی ۔ ظلم اور تعدی کے ۔ ایک شئے ہے جو کبھی نہ بدلیگی کبھی فنا نہ ہوگی اور ازل تا ابد رہیگی ۔ یقیناً ان باتوں کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم بے نیند راتیں گذاریں ۔ دنکو سخت محنت کریں موجودہ خوشیوں کو نظر انداز کریں ۔ ہمیشہ ستانے والی غریبی کو برداشت کریں ۔ ظلمت ۔ غم اور نفرت سے نہ گھبرائیں ۔ میں ان شخصوں سے سوال کرتا ہوں جنہوں

نے اپنے دماغ کو اچھی طرح سے تربیت دی ہے کہ آیا اسی تربیت میں انہیں ایک قسم کی تسلی حاصل نہیں ہوتی جو انہیں یہ کہتی ہے کہ بیشک تم اپنی زندگی کے مدعا کے حصول میں بڑی کوشش کرتے رہے ہو۔ قدرت کا منشا تم نے پالیا ہے۔ تمہارے قوائے عقلی و ذہنی نے اس کام کو انجام دے لیا ہے۔ جس کی خاطر وہ تمہیں عطا کئے گئے تھے۔ تم نے انکو ہیچ اور نفسانی لذتوں پر خرچ نہیں کیا بلکہ ایسی محنت پر لگایا ہے جو انکی فطرت اور اصل کے عین مطابق ہے۔

علم کی زندگی عموماً تکلیف اور گناہ کی زندگی نہیں ہوتی۔ علم کا عاشق کسی شخص پر ظلم نہیں کرتا۔ کسی کی خوشی میں خلل نہیں دیتا۔ اس کی آرزو کسی کو برباد نہیں کرتی اس کا فریب کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ وہ اپنی دھن میں کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا اور اپنی کامیابی سے ہر شخص کو فائدہ پہنچایا ہے۔

جو شخص اپنی زندگی علم کی پری کے حوالے کر دیتا ہے وہ ایک ایسی خوشی حاصل کرتا ہے جس کے ساتھ کوئی ملامت وابستہ نہیں۔ اُسے ایسی خوشیوں سے بلاشبہ نفرت ہوتی ہے۔ جن کا حصول خلافِ ہدائتِ ضمیر عمل کرنے پر مجبور کرے۔ اسکی خوشیاں سب سستی معزز اور بے لوث ہوتی ہیں اور جہانتک انسان اس تغیر و تبدل کے دور میں ہمیشگی کی امید کر سکتا ہے۔ وہ اس قسم کی ہوتی ہیں کہ قسمت بھی انہیں زائل نہیں کر سکتی۔ وہ اُس کے ساتھ زندگی بھر لگی رہتی ہیں۔ اُن کی نیکیوں کو بڑھاتی ہیں اور بُرائیوں کو کم کرتی ہیں۔

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر مجھے علم کا شوق نہ ہوتا تو میں ضرور ایک مفلس ترین مزدور کی زندگی کو بڑے بڑے امیر کی زندگی پر ترجیح دیتا کیونکہ انسان کے دل میں آتش پرستوں کی آگ سی ایک آگ ہے جو دن رات جلتی رہتی ہے۔ ضرور اس کے لئے کچھ ایندھن چاہئے۔ کبھی یہ یا تو علم کا خالص عطر ہوگا یا گندے جذباتِ طبعی اس لئے جب میں یہ کہتا ہوں کہ علم کو تا دمِ مرگ عزیز رکھو۔ میری مراد یہ ہے کہ

عزیز رکھو معصومیت کو۔ عزیز رکھو نیکی کو۔ عزیز رکھو چال چلن کی درستی کو۔ عزیز رکھو اس شے کو جو دولتمند ہونے کی صورت میں تمہاری دولت کو لوگوں کی نظر میں عزیز۔ غریب ہونے کی صورت میں تمہاری غریبی کو معزز بنا دیگی اور ان لوگوں کو تم پر ہنسنے سے روکیگی۔ جن کے سینے نخوت و تکبر سے معمور ہیں۔ عزیز رکھو اس شئے کو جو تمہیں تسلی دیگی۔ تمہیں زینت بخشیگی۔ جو تکالیف اور مشکلات میں سپر ہو گی۔ جو تمہارے لئے تخیل کی دنیا کا دروازہ کھولدیگی۔ جس میں بڑے بڑے طبیعی دانوں۔ بڑے بڑے مورخوں بڑے بڑے مصنفوں۔ بڑے بڑے فلاسفروں سے تم ہمکلام ہو سکوگے۔ اور اس دنیا کی تکلیفوں کلفتوں۔ بے انصافیوں اور ظلم و تعدی کو بھول سکوگے۔

پس اگر کسی نوجوان نے اپنی زندگی کی کشتی علم کے بحر ذخار میں چھوڑ دی ہے تو اسے افسوس کرنا یا ڈرنا نہیں چاہئیے۔ اسے چاہئیے کہ اُن تکالیف سے جو علم کے ساتھ لگی ہوئی ہیں نہ گھبرائے ظلمت سے نہ ڈرے مشکلات سے بیدل نہ ہو۔ تنگ و تاریک جھونپڑیوں میں گذارہ کرے۔ غم و افلاس کی کوئی پرواہ نہ کرے اور علم کا پیچھا اس طرح کرے گویا علم ہدائیت کا فرشتہ ہے۔

نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ علم اُسے رات کے اندھیرے سے نکال کر دن کے اُجالے میں لے آئیگا اور دنیا پر ظاہر کر دیگا۔ کہ وہ کتنی وسیع معلومات رکھتا ہے۔ کتنا تجربہ کار ہے۔ کتنا مدلل اور دور اندیش ہے۔ اس کی قوت متخیلہ کتنی طاقتور ہے اُس کے قوائے کیسے عمدہ ہیں اور اس کا سلوک اپنے ابنائے جنس کے ساتھ کیسا اچھا ہے +

(ترجمہ از سٹائی سمتھ)

برکت علی ایم اے

فریادِ زمانہ

مندرجہ ذیل اشعار بھی اُس غزل کی طرح جو تھوڑے دن ہوئے شائع ہو چکی ہے جناب اکبر کے خاص رنگ میں ہیں۔ نظم کا ترنم قابلِ ملاحظہ ہے۔ نظم کیا ہے گویا ایک دردمند دل کی آہ ہے۔ جو موجودہ حالات کو دیکھ کر بے اختیار لب پر آگئی ہے۔ صاحبِ مصنف کا جو خط ان اشعار کے ساتھ ملا ہے۔ اُس کا یہ فقرہ نہایت دردناک ہے: "قضائے مبرم پر فریاد بے سود ہے۔ لیکن آہ دلیل کی تابع نہیں":-

بنائے ملّت بگڑ رہی ہے لبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا اُبھر رہے ہیں

اِدھر ہے قومِ ضعیف و مسکیں اُدھر ہیں کچھ مرشدانِ خود بیں
اِدھر نشان اس کا مٹ رہا ہے وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں

کٹی رگِ اتحادِ ملّت رواں ہوئیں خونِ دل کی موجیں
ہم اس کو سمجھے ہیں آبِ صافی نہا رہے ہیں نکھر رہے ہیں

صدائے الحاد اُٹھ رہی ہے خدا کی اب یاد اُٹھ رہی ہے
دلوں سے فریاد اُٹھ رہی ہے کہ دین سے ہم گذر رہے ہیں

قفس ہے کم ہمتی کا سب میں پڑے ہیں کچھ دانہ ہائے شیریں
اُسی پہ مائل ہے طبعِ شاہیں نہ بال ہیں اب نہ پر رہے ہیں

اگرچہ یورپ بھی مبتلا ہے وہاں بھی پھیلی یہی بلا ہے
خیال مسٹر[1] کا بڑھ چلا ہے۔ خدا کا اِنکار کر رہے ہیں

مگر وہاں کی بنا ہے نیشن رکھا ہے مجھ کا آپریشن[2]

سلہ یادداشت، سنہ ۱۹۵۲ء

نہیں ہے گم لفظ سالویشن خدا سے اب بھی وہ ڈر رہے ہیں
یہاں بجائے نماز گپ ہے وہاں وُہی عزتِ بشپ ہے
یہاں مساجد اُجڑ رہی ہیں وہاں کلیسا سنور رہے ہیں
جنابِ اکبر سے کوئی کہدے کہ لوگ بیٹھے ہیں ہر طرح کے
اس انجمن میں۔ اور ایسی باتیں۔ یہ آپ کیا قہر کر رہے ہیں

ہوائے الحاد رنگِ ملت کو ہر روش پر بدل رہی ہے
جو بات بگڑی بنے وُہ کیونکر جو چل گئی ہے وہ چل رہی ہے
ہمیں نے در اس ہوا پہ کھولا کیا اُسے چُپ جو کوئی بولا
ہمیں ہے اب خود تردد اس کا طبیعت اب ہاتھ مل رہی ہے
نہ عاقبت کا کسی کو ڈر ہے نہ عزتِ قوم پر نظر ہے
سروں میں سودا سما رہا ہے دلوں سے غیرت نکل رہی ہے
جو پیشوا خود ہوں رند مشرب تو کیا جمے رنگِ وعظ مذہب
قلوبِ شیطاں کے متبع ہیں زبان قرآں پہ چل رہی ہے
کریں ہیں باخبر ہیں ہر جا نہیں ہے چرچوں میں اس کا چرچا
ہمیں نے سمجھا ہے عہد اس کو اسی میں اب نسل پل رہی ہے
جو قوم ہمسایہ ہے ہماری نہیں ہے اُس پر بلا یہ طاری
ہم اپنی مستی میں گر رہے ہیں وہ ہوش میں ہو سنبھل رہی ہے
ہم اپنی صورت بگاڑتے ہیں بنا رہی ہے وُہ اپنے گھر کو
ہم اپنا نقشہ مٹا رہے ہیں وہ اپنے سانچے میں ڈھل رہی ہے
خدا کی ساعت ہیں یاں کی صدیاں چھپی نہیں ہیں ہماری بدیاں

بلائیں آئیں اور آرہی ہیں کوئی گھڑی ہے کہ ٹل رہی ہے

زبانِ اکبر میں کب یہ قدرت کہ کہہ سکے رازِ سوزِ حسرت!
وہ شمع اس کو بیاں کریگی جو گورِ سیّد پہ جل رہی ہے

سیّد اکبر حسین

سوزِ بیوگی

عجب رُت بھری ہی چارہ گر! ہے داستاں میری — جگر میں چٹکیاں لیتی ہے دردِ کرفغاں میری
پسند آئی نہ آرائش تجھے او آسماں میری — اُتاریں بدّھیاں بیدرد! توڑیں چوڑیاں میری
مبدل غم سے شادی ہوگئی او جانِ جاں میری — کہ نکلی بن کے خونِ آخر شرابِ ارغواں میری
فلک نے چھین لیں مجھ سے سُہانی چندیاں میری — پہنتی سُرخ جوڑا ایسی قسمت تھی کہاں میری
کہاں کا شوقِ زینت اجل رہی ہیں ہڈیاں میری — گراتی مجھ پہ اب برقِ ستم ہیں بجلیاں میری
ہوا کیا اے جوانی! وہ لڑکپن کا مرے پرتو — کدھر ہے طوقِ منت کا! کہاں ہیں ہنسلیاں میری
لگائی آگ آرائش کو آخر سوزِ نالہ نے — اُڑی ہونٹوں کی مسّی بن کے آہوں کا دُھواں میری
بہا جاتا ہے دل آنکھوں سے خونِ آرزو ہوکر — یہ رونا ہے۔ یہ بیکسی یارب کہاں میری
بنایا ہے یہ کس کے سوگ نے ماتم نشیں مجھ کو — تمنا ناکش میری ہے۔ حسرت نوحہ خواں میری

وہ نقشِ نامرادی ہوں۔ سراپا درد ہوں۔ غم ہوں
مرقع میں جہاں کے آہ! میں تصویرِ ماتم ہوں

وہ دُکھیا ہوں۔ نہیں دردِ نہاں کا رازداں کوئی — وہ بیکس ہوں نہیں سنتا ہے میری داستاں کوئی

کرے رو رو کے کب تک شکوۂ دردِ نہاں کوئی　بہائے آہ! کب تک سیلِ اشکِ خوں چکاں کوئی
بنایا ہے سراپا داغِ حسرت سوز و حرماں نے　پہنائے آہ! پھولوں کی نہ مجھ کو بدھیاں کوئی
جگر سے آہ! تھم تھم کر دھواں اٹھتا ہے آہوں کا　جلاتا ہے کسی کو یوں بھی اے سوزِ نہاں کوئی
تقاضا لذتِ ذوقِ خلش کا ہے شبِ غم میں　جگائیں آہ! رکھ دے چیر کر نوکِ سناں کوئی
کلیجہ قوم ہی نے کر لیا ہو اپنا جب پتھر　تو ہو پھر خاک یا رب شکوہ سنجِ آسماں کوئی
زمانہ ہو رہا ہو آہ! جب تاریک آنکھوں میں　سنوارے بام پر کیا گیسوئے عنبر فشاں کوئی
سنبھال اے ضبط! اُٹھ کر نہ اضطرابِ اشک ریزی ہو　کہ نازک ہے زمانہ۔ ہو نہ مجھ سے بدگماں کوئی
ہوئے کیا کیا نہ آنسو خاک میں پامال گر گر کر　نہ نکلا قوم میں ان موتیوں کا قدرداں کوئی

جلایا چپکے چپکے آتشِ خاموشِ غم تو نے
بجھائی آہ! کب دل کی لگی ابرِ کرم تو نے

گھٹائیں چھا رہی ہیں آہ! دل پر یاسِ حرماں کی　امنگیں خوں رلاتی ہیں شبِ فتنہ ساماں کی
خلش ہے آہ! پھر نالوں میں میرے نوکِ پیکاں کی　الٰہی خیر ہو دل کی۔ جگر کی۔ شہ رگِ جاں کی
نہ دے بادِ صبا! تکلیف گلگشتِ گلستاں کی　کہ صورت ہے ہر اک گل میں ہائے زخمِ خنداں کی
ہیں وہ تصویرِ حسرت ہوں شکستِ رنگِ ارماں کی　کہ مہندی ہے نہ ہاتھوں میں نہ سرخی لب پہ ہے پاں کی
گئے وہ دن۔ کمندِ شوق تھی جب دوش پر گیسو　درازی آہ! اب لفظوں میں ہے شبہائے ہجراں کی
یہ ہے کیسی سموم بادِ صبا! یہ کس کے پھولوں سے　لپٹ کر رو رہی ہیں خون کلیاں میرے داماں کی
نہ رکھا پیرہن میں تار باقی دشتِ وحشت نے　الٰہی شرم تیرے ہاتھ ہے اس جسمِ عریاں کی
دماغِ عرضِ شرمِ آرزو ہے چارہ گر کس کو　بگڑتا کیوں ہے منت کش نہیں میں تجھ سے درماں کی
پرائے جی کی وہ جانے کہ بیتا ہو پڑی جس پر　کسی کو کیا خبر ہو آہ! میرے دردِ پنہاں کی

مرے دردِ نہاں کو آہ! تو بیدرد کیا جانے
گزرتی ہے جو مجھ دکھیا پہ وہ تیری بلا جانے

نشاط افروز شادی تو ہی منعم بزمِ عشرت میں
بسر ہوتی ہے تیری شاہد و مطرب کی صحبت میں
حمائل ہاتھ تیرے گردنِ مینا میں ہیں شب کو
کہ مستِ بیخودی ہے ذوق صہبائے مسرت میں
کسی گل پیرہن سے شب کو پہلو گرم ہے تیرا
بہارِ صبح جنت کا ہے جلوہ شامِ خلوت میں
گذرتے ہیں ترے دن لُطف سے یاروں کے جلسے میں
بسر ہوتی ہیں راتیں تیری خوابِ استراحت میں
سمجھتا ہے مآلِ زندگی تو عیشِ دنیا کو
کبھی ہے فکر ساماں میں کبھی ہے حرصِ دولت میں
خبر کیا تجھ کو اے دالدادہ ذوقِ تنِ آسانی
کہ کٹتے ہیں کسی دکھیا کے دن کیونکر مصیبت میں
اثر ہو تجھ کو کیا بیدردِ مجھ بیکس کے نالوں کا
نہ دلسوزی ہے فطرت میں نہ غمخواری طبیعت میں
توقع چارہ دردِ نہاں کی کیا کرے کوئی
کہ ہمدردی نہیں جائز ہے ظالم! تیری ملت میں
کسی بیکس کا نوا و بوالہوس! ڈھانکے گا کیا پردہ
کہ ہیں تیری نگاہیں رخنہ گردامانِ عصمت میں

کہاں کی پردہ داری - پاسِ ناموسِ وفا کیسا
توقع قوم ہی سے اٹھ گئی - یارب گلا کیسا

سرور جہان آبادی

تاجِ آگرہ

"روضۂ تاج گنج" کہنے کو تو ایک عمارت ہے - لیکن اگر کوئی پوچھے کہ "کیسی عمارت ہے"؟ تو ہم صرف اتنا بتا سکتے ہیں - کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ ایک انسانی "عالم آئینہ" ہے - یا ایشیائی فوق العادت فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ - منکرینِ کمالِ اہلِ ایشیا کے مشاہدے کے لئے - معجزے کی صورت میں ظاہر کر دکھایا ہے -

اس کا چپہ چپہ جگر گیر واقع ہوا ہے۔ اور ذرّے ذرّے میں دل نوازی کی شان پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس کی جس چیز کو دیکھو اوّل وہی جوش۔ خوشی اور حیرت پیدا ہوتی ہے۔ بالآخر وہی طبعیت کو پست کر دیتی ہے۔ اور بے اختیار دل سے "آہ" نکلتی ہے۔ غرض جذبات کا ہجوم ہوتا ہے۔ جو طبعیت کو تہ و بالا کئے ڈالتا ہے۔ جن حضرات کو کبھی "تاج گنج" دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ انکی خدمت میں عرض ہے۔ کہ "لطفِ ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی" اور جو احباب کہ اس کی سیر فرما چکے ہیں "تاج" کے شایانِ شان اس نظم میں کوئی خوبی نہ تلاش فرمائیں۔ یہ صرف ایک متشاعر کے خیالات ہیں۔ جنہیں وہ اپنے پیارے "مخزن" کی زبان سے سنانا چاہتا ہے۔ اور وہ یکم جنوری ۱۹۱۰ء کی یادِ تازہ کرنے کا متمنی ہے:۔

(علمدار)

تاج گنج آگرہ! اے انتخابِ روزگار! دیدہ و دل تجھ پہ قرباں چشم و جاں تجھ پر نثار

تیری صورت۔ تیری صنعت تیری ندرت دیکھکر گلشنِ اسلام کی یاد آگئی مجھ کو بہار

خوبیاں سنتے تھے مدت سے تری اے تاج گنج اب تجھے دیکھا تو پائیں وہ ہزار اندر ہزار

واقعی پایا تجھے دنیا میں آپ اپنی مثال تو ہے یکتائے زماں اے تاج بی بی کے مزار

گویا گلدستہ دھرا ہے میز پر بلور کی تخت پر یا رکھ گیا ہے تاج کوئی شہریار

محو راحت پہلوئے بیگم میں ہیں شاہِ جہاں اور یہ گنبد ہے گویا شہ کا تاجِ نور بار

یا خوشی سے کھل گیا ہے دل کا جمنا کے کنول دیکھ کر پہلو میں اپنے شاہ و بیگم کا مزار!

اے دلِ دنیائے عالم! جنتِ ہندوستاں حسنِ فطرت کا مرقع ہیں ترے نقش و نگار!

سنگ موسیٰ سنگِ مرمر میں ہے زیبِ فرش یوں گویا آنکھیں ہیں کھچے ابلقِ لیل و نہار

حور کے رخسار پر بکھری ہے زلفِ عنبریں آیتیں محراب کی تیری بخطِ مشکبار

گر جہاں آرا نہیں ہندوستاں آرا ہے تو تیری صنعت کی قسم اے قبۂ گردوں وقار

ہے دلِ بے تاب سینے میں تماشائی تیرا!
دیکھنے آیا ہے تجھ کو آج شیدائی تیرا!

پست آئی ہے نظر یہاں عقلِ افلاطوں مجھے　　کر دیا ہے تیرے نظارے نے اک افسوں مجھے
گاہ روضے پر نظر ہے گاہ اپنے آپ پر　　آ رہے ہیں اب تصور ہائے گوناگوں مجھے
کھینچ لایا ہے دلِ بے تاب شوقِ دید میں　　کر کے مشتاقِ تماشا ہائے بوقلموں مجھے!
ہاں نگاہِ شوق بسم اللہ تیری عید ہے!　　تاج دہلی کا ملا ہے اک درِ مکنوں مجھے!
بعد مدت کے ہوا ہے لطفِ نظارہ نصیب　　کاش رہنے دے یہاں چندے یونہی گردوں مجھے!
سیاحتِ ہندوستاں میں آ تو پہنچا ہوں مگر　　چھپتا پھرتا ہوں کہ کوئی دے نہ دیکھوں مجھے!
آنچہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب"　　آہ! سمجھا دے کوئی للہ یہ مضموں مجھے!
بیشک اس منظر میں کیفیت ہے سوز و ساز کی　　ہائے یہ فرحت بھی دیتی ہے کچھ محزوں مجھے!
مائلِ گریہ ہوا دل درد کی شدت بڑھی　　یاد آیا لوحِ تربت دیکھ کر مدفوں مجھے!
ہوں سراپا ماتم و افسوس اندوہ و الم　　غم نظر آتا ہے اس دم اپنے پیراموں مجھے!
نکتہ آموزِ دلِ درد آشنا ہے تاج گنج　　ہے رلاتا دیدۂ حسرت سے اشکِ خوں مجھے

آہ! اے اسلام کے اقبال تیرا وہ کمال!
خوب آیا تجھ پہ صادق "ہر کمالے را زوال"!!

روضۂ ممتاز بیگم! لائقِ مدحت ہے تو!　　سرزمینِ آگرہ کا باعثِ زینت ہے تو!
فرد و بے ہمتا و نادر۔ لاجواب و بے نظیر　　گویا اک محسوس مرئی معنیِ ندرت ہے تو!
عشق و اخلاص و وفا و صدق و آب و گل ترے　　اک دلِ از دست رفتہ کی مگر قیمت ہے تو!
مایۂ نازش ہے اہلِ ایشیا کے واسطے!　　اہلِ یورپ دیکھ کر حیراں ہیں وہ صنعت ہے تو!
محوِ نظارہ نہ ہو کیوں خوبیِ تعمیر پر　　ہر دلِ حسن آشنا کو موہنی مورت ہے تو!
ہے مری یہ حالت کہ گویا حاضرِ دربار ہوں　　تیری یہ صورت کہ سچ مچ سطوت و شوکت ہے تو!

فخرِ حاصل صنعِ انساں کو تری تعمیر کا — اے سراپا حُسن از سرتا بہ پا حکمت ہے تو

آہ! یہ سچ اے مخاطب مجھ سے گر پوچھے کوئی — دیدۂ اصحابِ نظر میں منظرِ عبرت ہے تو!

تجھ کو کیا دیکھا کہ دنیا ہیچ محض آئی نظر — عالمِ فانی سے گویا موجبِ نفرت ہے تو

گنجِ تنہائی میں محوِ خواب ہے اک جانِ حُسن — کوئی بھی جس میں مُخل ہووے نہ وہ خلوت ہے تو

صاحبِ طبل و علم۔ تاج و نگیں کا مقبرہ — تاجدارِ ملکِ دل کی غم نشاں تربت ہے تو!

اک جہانِ حُسن تجھ میں محوِ صد آرام ہے

آہ اے عشق! آغاز تیرا درد۔ درد انجام ہے!

آتے ہیں وقتِ خزاں ہم رنگِ بُستاں دیکھ کر — بلبلوں کو فصلِ گل کا مرثیہ خواں دیکھ کر!

زخمِ دل میں خارِ حسرت سے خلش پیدا ہوئی — باغباں بے حال اور ویراں گلستاں دیکھ کر!

یاس و حرماں رنج و غم۔ افسوس اندوہ و الم — سینکڑوں اک دل پہ آ ٹوٹے مُسلماں دیکھ کر!

دیدۂ عبرت نظر سے اشکِ خوں جاری ہوئے — حال دربانوں کا مانندِ گدایاں دیکھ کر!

دل تڑپ اُٹھتا تھا پہلو میں وفورِ درد سے — اہلِ دل کو صحنِ گلشن میں پریشاں دیکھ کر

شوکتِ اسلام کا آنکھوں میں نقشہ کھنچ گیا — تُربت و محراب پر آیاتِ قرآں دیکھ کر!

گویا کرتا تھا بیاں حالِ انقلابِ دہر کا — مقبرہ اہلِ نظر سے فاتحہ خواں دیکھ کر

عشقِ صادق اور کمالِ حُسن کی دو صورتیں — آہ! ہم آئے ہیں زیرِ خاک پنہاں دیکھ کر!

عاشق و معشوق محوِ خوابِ نوشیں ہیں پڑے — اے تماشائی! قدم رکھنا ذرا یاں دیکھ کر

اُس کے نظارے کی پھر ہو دیدۂ دل کو ہوس — تاج گنج آتے ہیں یا بزمِ حسیناں دیکھ کر

ہے یہ ارماں اٹھ ہوں نیرنگِ اکرام و رضا — آئیں پھر ہم یہ نشانِ بے نشاناں دیکھ کر!

اشتیاقِ سیرِ تاج آگرہ پھر دل میں ہے

آتشِ حسرت کی سوزش اپنے آب و گِل میں ہے

سید علمدار حسین (بنوڑی)

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے — دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے — اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری — چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری — چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ بینش اس وادیِ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو — سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو — سینچا لہو سے اپنے راناؤں نے اس چمن کو

سب سوربیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا انکی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک اُن کا اثر عیاں ہے — اپنی رگوں میں اب تک اُن کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے — فردوسِ گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے

کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں — کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں — پستی سی آ گئی ہے پر دل کے ولولوں میں

گلِ شمعِ انجمن ہے گو انجمن وہی ہے

حُبِّ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا　　دُنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا

کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا　　اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

اس کے بھرے خزانے برباد ہو رہے ہیں

ذلّت نصیب وارث غفلت میں سو رہے ہیں

اے صُورِ حُبِّ قومی اس خواب سے جگا دے　　بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے

مُردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے　　اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حُبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر

سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک　　رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک

بلبل کو گل مُبارک گل کو چمن مُبارک　　ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دِل کے اس باغ میں کھلینگے

اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملینگے

ہے جُوئے شیر ہم کو نُورِ سحر وطن کا　　آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا

ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا　　تُلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو

مر کر بھی چاہتے ہیں۔ خاکِ وطن کفن کو

برج نرائن لکھنوی

جوانی

پوچھوں نہ تجھ کو کیونکر اے دلربا جوانی
تو لطفِ زندگی ہے اور وجہِ شادمانی

ہستی میں تیری الفت لائی ہمیں عدم سے
تو مادتک رہائی پائی نہ قیدِ غم سے

لیکن جب آنکھ کھولی تیرا پتا نہ پایا
رو رو کے ہم نے سر پر سارا مکاں اٹھایا

دن اشکباریوں میں شب بیقراریوں میں
بچپن کی عمر کاٹی یوں آہ وزاریوں میں

برگشتگی نے آخر ہم کو وہ دن دکھایا
تجھ سیمتن کو ہم نے پہلو میں اپنے پایا

آنکھوں نے نور پایا دل نے سرور پایا
پہلو میں جبکہ تجھ کو اے رشکِ حور پایا

اے مہ جبیں ہی تیرا نامِ خدا وہ جوبن
تیری نثار جس پہ قربان جس پہ بچپن

حسنِ ازل کی پیدا ہے آن بان تجھ میں
حوروں کا ناز تجھ میں غلماں کی شان تجھ میں

حجلہ کی آرزو کی سیج پہ تو دلہن ہے
آباد تیرے دم سے اس دل کی انجمن ہے

شبہائے تار کی تو اس طولِ زندگی کی
میری نظر میں گویا شفاف چاندنی ہے

تو شانِ زندگی ہے ارمانِ زندگی ہے
کیونکر نہ تجھ کو چاہوں تو جانِ زندگی ہے

دیوانہ اپنا تو نے مجھ کو بنا لیا ہے
پروانہ اپنا تو نے مجھ کو بنا لیا ہے

ہر لحظہ اور ہر دم تیری ہی آرزو ہے
گر مجھ کو جستجو ہے تیری ہی جستجو ہے

ہر دل پہ تیرا سکہ ہر جا پہ تیرا جلوہ
اڑتا ہے اللہ اللہ ہر سو تیرا پھریرا

نرگس کی دیدبازی سوسن کا ترنم
بلبل کی اشکباری غنچوں کا وہ تبسم ق

بادِ صبا کا باہم اٹکھیلیوں سے چلنا
کلیوں کا شاخِ گل کی آغوش سے نکلنا

شبنم کا موتیوں کو گل پہ نثار کرنا
پتوں کا جھک کے ہر دم کلیوں کو پیار کرنا

ہر ایک شے کی خوبی ہے تیرے دم قدم سے
تیری کرشمہ سازی پوچھے تو کوئی ہم سے

[illegible] کیا جوہر اپنا ہے اور گزار کیا ہے؟ — نشو و نما نہ ہو گر فصلِ بہار کیا ہے

بوٹے اُبھار پر ہے تو اُس میں جلوہ گر ہے — گو نام مختلف ہیں پر ایک ہی اثر ہے

تو شمعِ بزمِ حسرت آرامِ قلب و جاں ہے — میری طرح سے تجھ پر پروانہ یک جہاں ہے

یہ آرزو ہے میری یوں زندگی بسر ہو — باہیں رہیں گلے میں زانو پہ تیرے سر ہو

جب تم نہ ساتھ تو ہو جنت میں میں نہ جاؤں — حورِ جناں کے بدلے پہلو میں تجھ کو پاؤں

محشر میں مجھ کو یوں دے لطفِ انتخاب میرا
تو بھی پکار اُٹھے "آیا شباب میرا"

محمد سیف الدین شباب

حیاتِ انسانی

انسانِ بے بنیان کی - ہے زندگی اِک آن کی — آئی قضا انسان کی - تو الوداع ہے جان کی

یہ برق ہے یا ہے شرر یا سایۂ دیوار و در — شبنم ہے یا شکلِ گہر یا غنچۂ گلزارِ تر

مثلِ نمودِ شام ہے - یا صبح کا ہنگام ہے — اِک شعبدے کا دام ہے - جو زندگانی نام ہے

بجلی چمک کے رہ گئی - اُڑ کر شرر غائب ہوا — سایہ ہٹا شبنم اُڑی - غنچہ کھلا مرجھا گیا

شب نے مٹایا شام کو - دِن نے سحر کی جان لی — ناگاہ ٹوٹا شعبدہ - موت آ گئی انسان کی

ہستی ندی کی دھار ہے - جو مائلِ رفتار ہے — ہے یہ زمانہ عیش کا جو دو گھڑی کا یار ہے

یا ہے چھلاوہ حسن کا - یا عشوۂ عیّار ہے — یہ انتقال انسان کا - رنگِ رُخِ دلدار ہے

یا ہے ہلالِ آسماں - یا طوطیِ شکر فشاں — یا جلوۂ خوابِ گراں - یا ہے شفق یا کہکشاں

وصال آئی اور جاتی رہی - گذرا زمانہ عیش کا
عشوہ - چھلاوہ مٹ گیا - رنگِ رُخِ دلبر اُڑا
ڈوبا ہلالِ آسماں پھولی شفق پھر تھی کہاں
شب کا ہوا لشکر عیاں تو کہکشاں ہے بے نشاں
آنکھیں کھلیں جاگا بشر - پھر خواب کا قصہ کدھر
پنجر اکھلا - طوطی اُڑا - انسانِ فانی چل بسا!

(... ... وصل)

(طالب بنارسی از بمبئی)

غزلِ شاعر

چونکہ مندرجہ ذیل غزل ہر کہ و مہ کی زبان پر ہے اور قسمت سے اُس میں شدت سے غلطیاں بھی واقع ہوئی ہیں اس لئے میں مخزن جیسے مشہور رسالے میں اسکو پوری صحت کے ساتھ نقل کرتا ہوں - اس پر بھی اگر کوئی غلط ڈھنگ سے پڑھے اُسے ... سمجھو - (شیخ)

یہ کیسے بال کھولے آئے کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

پسِ پردہ بھی تو مہلت نہیں ملتی کوئی دم کی
نگاہِ یار کی بجلی اُدھر تڑپی اِدھر چمکی

شکایت کس سے کیجئے ہائے کیا اُلٹا زمانہ ہے
بڑھایا پیار جب ہم نے محبت یار نے کم کی

کہیں بھولے سے میں نے چھو لیا تھا اُنکی شیشت
سی پر بل پڑا ہے کیوں ہماری زُلفِ برہم کی

مزا اس میں ہی ملتا ہے نمک چھڑکو نمک چھڑکو
قسم لے لو نہیں عادت مرے زخموں کو مرہم کی

نہیں ملتے نہ ملئے خیر کوئی مر نہ جائے گا
خدا کا شکر ہے پہلے محبت آپ نے کم کی

کہاں جاتا ہے تھم تھم کر چلو ایسی بھی کیا جلدی
تمہی تم ہو خدا رکھے نظر پڑتی ہے عالم کی

کوئی ایسا ہو آئینہ کہ جس میں تو نظر آئے
زمانے بھر کا جھوٹا کیا حقیقت ساغرِ جم کی

گھٹا میں دیکھ کر بیتاب ہے بے چین ہے شاعر
ترے قربان او مطرب سنا دے کوئی موسم کی

(... ... ...)

د

اگر فیق نے آپ کو کسی مصرف کا نہیں رکھا تو ایک لائق تجربہ کار کا بنایا ہوا مرکب یعنی ڈاکٹر ہیجز س ہاڈرو تیل الکینز اس مرض کو جڑ سے کھو دیتا ہے۔ کچھ پروا کی بات نہیں خواہ مرض کیسا ہی شدید ہو جونہی اس اعجاز نما دوا کو ایک بار لگایا اور اس نے فوراً اکسیر جیسا اثر دکھلایا وزان گھٹنا شروع ہوا۔ قیمت فی تولہ (عہ) ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصولڈاک

کمزور مضبوط ہو سکتے ہیں

یہ فقرہ خاصکر ان لوگوں کو مخاطب کر کے لکھا جاتا ہے جو کمزوری کا ہر طرح سے علاج کر چکے ہیں۔ یا جنہوں نے کوشش کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ اگر ناظرین میں سے کسی نے اپنے تئیں مایوس العلاج تصور کر لیا ہے تو سخت غلطی کی ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ غلطی ہوگی کہ باوجود گذشتہ کوششوں کے ناکامیاب ہونے پر اب بھی انہی ادویات کی طرف متوجہ ہوں۔ ان کا نتیجہ دیکھ چکے آزما چکے ... آزمودہ جہاں است ڈاکٹر ہیجز کے ویٹلین کے استعمال سے زائل شدہ طاقت بحال ہوتی ہے اس میں ادویہ سب طرح سے شامل کی گئی ہیں۔ ہمارا تجربہ ہے کسی قسم کی کمزوری ہو اس سے دور ہو جاتی ہے۔ رسالہ تحفۂ ہیجز کو پڑھو۔ تم خود قائل ہو جاؤ گے۔ قیمت فی تولہ (سے علاوہ محصولڈاک

تمام دنیا میں ... صفائی خون کی بدولت فرحت ہو رہے ہیں ان سب سے ڈاکٹر ہیجز صاحب کا سارساپریلا کی بکری بہت زیادہ ہے اس سارساپریلا میں ایک نئی ترکیب سے بجلی کی حرارت آمیز کی گئی ہے تمام قسم کے کھاؤ زخم امراض سفلی جن سے جلد بدنما ہو جاتی ہے جسم پر بدنما داغ کنٹھمالا پھوڑے پھنسیاں ... کے استعمال سے جاتے رہتی ہیں قیمت عا فی بوتل

یہ ادویہ کارخانہ مسرس ڈبلیو ہیجز اینڈ کو کلکتہ میں تیار ہوتی ہیں۔ تھوک اور خردہ فروش ایجنٹ آے برکت اینڈ کو دہلی سے طلب کرو۔

آؤ ہم بتائیں کہ پچاس ہزار مریض کس طرح صحت یاب ہوئے ہیں!
طاقت بخش جان افزا
روح منا مرکب
یہ مرکب گویا روح رواں اعضائے رئیسہ ہے
اسکے وجود سے حیات روح ہوتی ہے
قیمت فی شیشی چار روپے (للعہ)

مخزن

شکسپیئر کا وطن

سٹریٹ فورڈ کنار ایون

انگلستان کی سرزمین کا چپہ چپہ ویسے تو تاریخی یادگاروں سے مالا مال ہے۔ مگر علم دوست سیاحوں کے لئے شاید کوئی قطعۂ زمین انگلستان بھر میں وہ دلچسپی نہیں رکھتا جو اس پرانے قصبہ میں موجود ہے جسے شکسپیئر۔ لازوال شکسپیئر کے مولد اور مدفن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ انگلستان کی چھوٹی چھوٹی ندیوں میں یہ ننھی سی مگر پیاری ندی ہمیشہ اس امتیاز پر ناز کرے گی۔ کہ ایک ایسے جادو نگار شاعر نے اس کے کنارے جنم لیا۔ جس کی خوبیٔ تحریر نے ایک عالم کو گرویدہ کر لیا۔ خود مشہور ہوا تو اپنے قصبے کے حقوق کو نہ بھولا۔ اُسے مشہور کر گیا۔ اور جس ندی کے پانی سے وہ شاداب ہے اس کے احسان کا بھی حق ادا کر گیا۔ اب دنیا اُسے ناظم ایون کے نام سے یاد کرتی ہے۔

دریا اسی دھیمی رفتار سے بہہ رہا ہے۔ جس سے ۲۶۔ اپریل ۱۵۶۴ء کو بہہ رہا تھا۔ جب جان شکسپیئر کے ہاں ولیم شکسپیئر کے پیدا ہونے کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ اس کی چال میں آج بھی وہی معشوقانہ انداز نکلتا ہے جو اُس دن تھا۔ شہر کے رہنے والے آج بھی دریا پر جا کر اسی شوق سے اپنی کشتیاں آپ کھیتے ہیں۔ جیسے ولیم کے بچپن میں

کھیتے تھے۔ کئی پرانی وضع کے گھر اب تک کھڑے زائر کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اُس کے گرد و پیش کی دنیا سولھویں صدی کی دنیا ہے۔ مگر حقیقت اُسے یاد دلاتی ہے کہ تین سے زیادہ صدیاں گذر چکی ہیں۔ زمانہ سینکڑوں کروٹیں بدل چکا ہے۔ ولیم شیکسپیر طفل سے جوان۔ جوان سے پیر ہوکر مر چکا ہے۔ مرنے سے پہلے اپنے ہم عصروں میں عزت و امتیاز پیدا کر کے مرنے کے بعد کچھ دنوں کنج گمنامی میں رہ چکا ہے۔ مگر جن کے لئے روز ازل سے شہرت اور قبولیت ودیعت ہو چکی ہو۔ انہیں گمنامی میں کون ڈال سکتا ہے۔ آخر وہ شہرت بقائے دوام اسے نصیب ہوئی۔ جس کا نظیر ملنا مشکل ہے۔

جب تک ملک اپنے سرمایۂ ناز سے غافل رہا۔ اس وقت کو جانے دو۔ لیکن جب سے ملک بیدار ہوا۔ اور اس کی شہرت کے نصیب جاگے۔ اُس دن سے اُس کے مولد کی بھی قسمت یاور ہوئی۔ ویسے کوئی اس چھوٹے سے قصبے کو دیکھنے کیوں جاتا۔ اب آئے دن وہاں ہجوم زائرین رہتا ہے۔ امریکہ سے ہزاروں لوگ ہر سال انگلستان آتے ہیں اور انگریزوں سے زیادہ شوق کے ساتھ سٹریٹ فورڈ جاتے ہیں۔ وہاں خاص اُن کے قیام کے لئے اب ایک بڑا مکان تعمیر ہونے کو ہے۔ شیکسپیر کی یادگار میں ایک خوشنما تھیٹر کتب خانہ اور تصویر خانہ تیار کرنے کے فنڈ میں انہوں نے دل کھول کر شرکت کی ہے۔ بازاروں میں بیسیوں دکانیں صرف مقامی تصاویر اور تحت نیاں بیچنے پر چل رہی ہیں۔ گڑھی پر اس کے گھر کی تصویریں چینی پر اس کے گھر کی تصویریں۔ پتھر پر اس کے گھر کی تصویریں۔ اس قسم کا مال یہاں بہت بکتا ہے۔ ہوٹلوں والے گھروں والے کاروبار والے سب شیکسپیر کے زائروں کی کثرت سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور اس عجیب و غریب شخص کا نام مرنے کے بعد اپنے اہل وطن کو بے حساب نفع پہنچا رہا ہے۔ جب یہ چھوٹا سا لڑکا سٹریٹ فورڈ کی گلی کوچوں میں کھیلتا پھرتا ہوگا۔ کسے خبر ہوگی۔ کہ اس قصبے کے لئے یہ لڑکا لازوال خزانہ ثابت ہوگا۔ جس کی بدولت ہزاروں آدمی

پُشت ہا ئے پُشت تک رہا کرینگے۔ اور دُور دُور سے لوگ آکر سٹراٹ فورڈ کی گلیوں میں قدم قدم پراُس کانقش پا ڈھونڈ ھتے پھرینگے اور جہاں کوئی ایسی جگہ نظر آئیگی جس کی نسبت قابل اعتبار روایت ہو کہ شیکسپیئر وہاں اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ اُسے گھنٹوں کھڑے دیکھا کریں گے۔

سب یادگاروں سے زیادہ دلچسپ وہ پُرانا گھر ہے۔ جس میں یہ خوش قسمت شاعر پیدا ہوا۔ غنیمت ہے کہ یہ مکان دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہگیا۔ انگلستان پر جو شان و شوکت آج کل برس رہی ہے اور جو محل ہر طرف سربفلک دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی نوازندہ آنکھ کو جا ہے یہ مکان۔ کتنا ہی حقیر معلوم ہو۔ مگر علاوہ شیکسپیئر سے متعلق ہونے کے اس میں یہ بڑی خوبی ہے۔ کہ اس کے تنگ و تاریک کمروں سے سولھویں صدی عیسوی کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ مکان کی تعمیر بیشتر لکڑی سے ہوئی ہے۔ یہ طرز تعمیر دیکھکر کشمیر یاد آگیا۔ لکڑی کا ایک لمبا شہتیر لیکر اس کے اُوپر چند چھوٹی کڑیاں پاٹ دیں اور بیچ کے حصّے کو اینٹ اور چونے سے چُن ڈالا پھر کچھ اوپر چل کر ایک اور شہتیر متوازی لگایا اور اُس میں کڑیاں ٹھونک کر عمارت اُٹھالی۔ اور اس طرح دیواریں تیار کرلیں۔ اندر بالکل لکڑی کا کام ہے۔ چھتیں بہت نیچی اور دروازے بہت ہی چھوٹے جن میں جُھک کر داخل ہونا پڑے۔ زینے لاہور کے بعض پُرانے مکانوں کی چھوٹی اور تنگ سیڑھیاں یاد دلاتے تھے۔ جس کمرے میں شیکسپیئر پیدا ہوا۔ اُس کی ایک کھڑکی بازار کی طرف کو کھلتی ہے۔ دوسرے کمرے میں روشنی کے لئے صرف چھت میں روشندان ہے۔

اُس گھر کی تاریخ یوں بیان کی جاتی ہے:۔ شیکسپیئر کے بعد یہ مکان اسکی وصیت سے اسکی بیٹی کو ملا یہ ہن گئی تو شیکسپیئر کی بڑی بیٹی سوسن اُس پر قابض ہوئی۔ اِس لڑکی کی شادی ایک معزز طبیب ڈاکٹر ہال سے ہوئی تھی ۱۶۴۹ء میں سوسن کا انتقال ہوگیا تو اُسکی

لڑکی لیڈی برنارڈ وارث بنی۔ مگر سنہ ۱۶۷۰ء میں اسے بھی پیام اجل آ گیا۔ اس کے بعد شیکسپیر کے بہنوئی کی اولاد میں سے ایک شخص ٹامس نامی قابض ہوا۔ کیونکہ لیڈی برنارڈ بے اولاد تھی۔ ٹامس سنہ ۱۶۹۶ء میں چل بسا اور بے اولاد مرا۔ اس لئے اس کا بھائی جارج جو درزی کا کام کرتا تھا گھر کا مالک بنا اور اس نے سنہ ۱۷۲۷ء میں یہ مکان اسی پونڈ (بارہ سو روپیہ) کو گرو کر دیا۔ جارج مرا تو مکان اپنی بیوی کے قبضے میں چھوڑ گیا۔ وہ سنہ ۱۷۵۳ء تک اپنی عدم موتی تو مکان اپنے شوہر کے بھتیجے کو جو شوہر کا ہمنام تھا۔ سونپ گئی۔ اس شخص کا انتقال ہوا تو سنہ ۱۷۸۷ء میں اس کا بیٹا جان وارث بنا۔ اور جان کے بیٹے ٹامس نے کچھ عرصہ بعد قصاب کی دکان مکان کے نصف حصے میں کھولی۔ وہ مر گیا تو اس کا بھائی دکان چلاتا رہا اور جب اس کے چلنے کی نوبت سنہ ۱۸۰۱ء میں آئی۔ تو اس کی بیوہ اور تین بچے نہایت ناداری کی حالت میں رہ گئے۔ اور یہ غریب بیوہ سنہ ۱۸۰۶ء میں مکان بیچ کر اور زر رہن ادا کر کے اس قصبے کو چھوڑ کر کہیں اور جا رہی۔ یہ لوگ جنہیں شیکسپیر سے رشتہ داری کا تعلق تھا۔ قدرتی طور پر دل سے اس تعلق کی قدر کرتے تھے اور اسی لئے جب کبھی کوئی شخص شیکسپیر کی ولادت کی جگہ دیکھنے کو آجاتا تھا اُسے دکھا دیتے تھے۔ مگر جس شخص نے آخری وارث سے مکان خریدا وہ اس فرض کے ادا کرنے سے گھبراتا تھا۔ لوگوں کو تکلیف ہونے لگی اور اس اثنا میں شیکسپیر کی قدردانی از سر نو عام ہو چلی تھی اور زائرین کی تعداد روز افزوں تھی۔ اس حالت کو دیکھ کر تحریک شروع ہوئی کہ اسے رفاہ عام کے لئے خرید لیا جائے اور سنہ ۱۸۴۷ء میں تین ہزار پونڈ (۴۵ ہزار روپیہ) کو خرید لیا گیا۔ سنہ ۱۸۵۸ء میں یہ کوشش کیگئی کہ جہانتک ممکن ہو اسکی اصل صورت بحال کیجائے اور اس کوشش میں بہت کچھ کامیابی ہوئی۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں یہ مکان قوم کی ملک ہو گیا۔

شیکسپیر کے مولد کو دیکھنے کے بعد اس کے مدفن کی طرف آئے۔ خوش مذاق شاعر نے اپنی قبر کے لئے کیسا اچھا ٹھکانا ڈھونڈا ہے۔ عین دریا کے کنارے ایک

بڑا گرجا ہے جس کی مشرقی حد آب دریا ہے۔ گرجے کی دیوار سے لگا ہوا ایک چبوترہ ہے جس پر بیٹھ کر آدمی گھنٹوں دریا کا لطف اٹھاتے۔ اور اُن دنوں کے فسانے پوچھا کرے جب شیکسپیئر اُس کے کنارے کھیلتا تھا امریکہ کے مشہور سخنور لونگ فیلو کو غالباً یہیں بیٹھے بیٹھے وہ دلکش الفاظ سوجھے ہوں گے۔ جن سے شیکسپیئر کی شان میں اس کا قصیدہ شروع ہوتا ہے۔ اس گرجے کے ایک گوشہ میں قربانگاہ کے قریب شیکسپیئر سو رہا ہے۔ پاس کی دیوار میں اس کا بُت رکھا ہے۔ جو گویا اس بیش بہا مٹی کی پاسبانی کر رہا ہے۔ اس بُت میں خط و خال شیکسپیئر کے دکھائے گئے ہیں۔ اُن سے اس کی ذہانت اور طبّاعی کے متعلق دل پر کچھ بہت اچھا نقش نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ ظاہری صورت میں یہ اصل سے بہت کچھ مطابق ہو لیکن چونکہ فن تصویر کے اُس جوہر اعلیٰ سے جس کے ذریعہ سے تصویر کا چہرہ صاحب تصویر کے دل کا آئینہ بنتا ہے۔ یہ بُت معرا ہے۔ اس لئے ہمیں اس سے صحیح اندازہ لگانے میں بہت کم مدد مل سکتی ہے۔

گرجے کے ایک دوسرے حصے میں ایک شیشے کے صندوقچے میں ایک پرانا رجسٹر رکھا ہے۔ جس میں شیکسپیئر کے بپتسما دیے جانے کی تاریخ اور اس کی تاریخ وفات کے پرانے اندراجات احتیاط سے محفوظ ہیں۔ ۲۶- اپریل ۱۵۶۴ء تاریخ بپتسما اور ۲۵- اپریل ۱۶۱۶ء تاریخ وفات درج ہے۔

پرانا گلڈ ہال[1]۔ اس کے بالاخانے پر مبتدیوں کا مدرسہ اور اس کے ملحق گرجا گھر بھی سٹریٹ فورڈ میں قابل دید ہیں۔ کیونکہ روایت ہے کہ سب سے پہلا تھیٹر کی قسم کا تماشا جو شیکسپیئر نے دیکھا وہ اسی گلڈ ہال میں تھا۔ اُس وقت اس قصبے میں کوئی تماشا گاہ نہ تھی۔ اور نہ کوئی مستقل تماشے کی کمپنی۔ تماشا کرنے والے شہر بہ شہر دورہ کرتے رہتے تھے۔ جیسا ان دنوں ہندوستان کے اکثر شہروں میں دستور ہے۔ دنیا کا بڑا ڈراما نگار ابھی بچہ ہی تھا۔ کہ ایک کمپنی تماشا کرنے

[1] یعنی: کمرہ جس میں شہر کی پنچایت بیٹھتی تھی۔ ۱۲

نوبت نکلی۔ انہوں نے وہاں پر تماشا کرنے کی اجازت لی اور ایک عارضی چبوترہ بنا کر اس پر کھیل
دکھایا۔ شیکسپیئر دیکھنے گیا۔ خدا جانے اس ہونہار بچے کے دل میں اس وقت کن خیالات کا ہجوم
ہوئی اور کیسی عجیب امنگ اس دن سے اس ننھے سے دل میں آرزو پیدا ہوگئی ہو۔ کہ جو لطف
اٹھایا ہے ایسے تماشا کرنے والوں کو دیکھ کر خود بھی ان میں شریک ہو۔

ہال کے اوپر کا مدرسہ اس لئے قابل زیارت ہے۔ کہ شیکسپیئر نے وہاں کچھ دنوں جور
استاد کا مزہ چکھا ہے۔ وہاں ایک میل کی تختی اس مقام کا نشان بتاتی ہے۔ جہاں شیکسپیئر
اپنی جماعت میں بیٹھا کرتا تھا۔ گرجا جو اس ہال سے متعلق ہے۔ نہ صرف اس قدیم زمانے کی
نشانی ہونے کے اعتبار سے دیکھنے کی چیز ہے۔ بلکہ کہتے ہیں کہ مدرسے کے لڑکے یہاں
عبادت کے لئے بھیجے جاتے تھے اور یہ رسم اب تک جاری ہے۔ اب بھی اس مدرسے
میں لڑکے پڑھتے ہیں اور اس گرجے میں عبادت کے لیے آتے ہیں۔ پس اس کے
اندر داخل ہونے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہیں شیکسپیئر نے اپنے بچپن میں کئی دفعہ اپنے
معبود کی [illegible] سر نیاز جھکایا ہوگا۔

سٹریٹ فورڈ کا مختصر سے مختصر بیان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس میں اس غریبانہ
جھونپڑے کا ذکر نہ ہو۔ جہاں شیکسپیئر نے پہلے اپنی ہاتھاوے سے ملاقات کی اور جہاں
ان دونوں کی نسبت کی قرارداد ہوئی۔ خاوند کی بدولت اس غریب وگمنام عورت کا
شکستہ سا گھر جو شہر کے کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ناموران دنیا کو اپنی طرف کھینچتا
ہے۔ اور حقیقت میں نہایت ہی دلچسپ چیز ہے۔ اس کی سادگی اور اس کا بے ساختہ پن ایسی
صفات ہیں۔ جو اسے بڑی بڑی عالیشان یادگاروں سے ایسا ہی ممتاز کرتی ہیں جیسے
اس کی مکین اپنی باوجود اپنی غربت کے شیکسپیئر کی نظروں میں بڑی بڑی جاہ عورتوں
سے کہیں بڑھ کر تھی۔

گو سٹریٹ فورڈ کی اصلی دلچسپی ان پرانی چیزوں کے ساتھ وابستہ ہے تاہم ایک

ی یادگار جو تھوڑا عرصہ ہوا شیکسپیر کے نام پر قائم کی گئی ہے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ ایک خوبصورت تعمیر ہے جو دریا کے کنارے بنائی گئی ہے۔ اس میں ایک عالیشان تھیٹر ہے۔ جہاں شیکسپیر کے کھیل دکھائے جاتے ہیں۔ اور جہاں بعض اوقات انگلستان کے بہترین ایکٹر جاکر وہاں کے کارکنوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ایک گیلری ہے جہاں شیکسپیر کے متعلق عمدہ عمدہ تصاویر کی نمائش ہے اور نیچے کے درجے میں ایک کتب خانہ ہے جس میں شیکسپیر کے نسخے جو آج تک طبع ہوئے ہیں بیشتر موجود ہیں اور جو شرحیں اور حواشی شیکسپیر کی تصانیف پر لکھے گئے ہیں وہ بھی جمع کئے گئے ہیں۔ یہ یادگار نہایت مناسب اور موزوں ہے۔ اور ثابت کرتی ہے کہ اس ملک کے لوگ اپنے محسنوں کے احسانات کی کس قدر جوش اور سرگرمی سے قدر کرتے ہیں ۔

عبد القادر (از لندن)

میں کس قدر افسوس کرتی ہوں اُن لوگوں پر جنکو مطالعۂ کتب سے محبت نہیں۔ میں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ تمام قسم کی تفریحات اور بڑی بڑی شاندار مجالس اور دلچسپ مشاغل اور صحبتوں میں گذارا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ جو مسرت حقیقی مجھے مطالعۂ کتب میں حاصل ہوئی ہے اور کسی جگہ نصیب نہیں ہوئی۔ ان عارضی تفریحات کے بعد ضرور ایسے دن بھی آتے ہیں جن میں انسان بہت اداس اور مغموم رہتا ہے۔ لیکن مطالعۂ کتب کے بعد جو دن آتے ہیں وہ پہلے سے بھی زیادہ لطیف اور مفرح ہوتے ہیں۔ ہر روز ایک نہ ایک نئی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ اور ہم جب اپنے پہلے زمانہ کو یاد کرتے ہیں تو پشیمان نہیں ہوتے بلکہ ایک خاص قسم کا اطمینانِ قلب محسوس کرتے ہیں ۔

(جمینا)

مکتوبات آزاد

(۳)

جناب من!

تسلیم - خان لنگران آج روانہ کیا ہے - کل انشاء اللہ باریاب خدمت ہوگا - اتوار بہر نگل چھٹی ہے - خیال آیا کر ۳ دن جمکر بیٹھونگا تو ماثرالامرا کا کام ختم ہوجائیگا - جاؤنگا تو ایک دِن صرف ہوگا - اور حاصل فقط باتیں - اِس لئے کتاب بھیجدینی چاہیے - کوئی امر ضروری ہوگا تو امرت سر سے کتنی دور - ایک دم میں جاؤنگا اور پھر آؤنگا - ہائے قائم نے کیا خوب کہا ہے - ؎

مجلس وعظ تو تا دیر رہیگی قائم   یہ ہے میخانہ - ابھی پی کے چلے آتے ہیں

وقت تنگ ہے - انشاء اللہ اب پھر -

آٹھ دِن ہوئے ایک عریضہ لکھا تھا خدا جانے پہنچا ہے یا نہیں؟

آزاد

۲۳ - فروری سنہ ۰۴ء

جناب من!

تسلیم - پنجشنبہ گذشتہ کو . . طالب علم کے ہاتھ خان لنگران کو ارسالِ خدمت کیا تھا - اور نیاز نامہ بذریعہ ڈاک روانہ کیا تھا - چونکہ اب تک جواب نہیں عنایت ہوا - اِس لئے تردد ہے -

تقصیر حضوری کے لئے معافی مانگ چکا ہوں - اور اب دوبارہ طلبگار عفو ہوں -

مکب مخزن کی پالیسی کا یہ بھی ہے کہ فقط انگریزی پڑھاؤ۔ سائنس وغیرہ کچھ ضرور نہیں۔ لیکن آپ خیال کیجئے۔ علوم مذکورہ زبان کے لئے بمنزلہ اعضائے رئیسہ کے ہیں اگر وہ بالکل نہ ہوئے تو پھر آدمی۔ آدمی کیا ہوا؟ وہ تو حیوان ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ طرز خاص ورنہ تمام تک ہوں۔

پالیسی عجب لفظ ہے۔ کہیں اس کے معنے تجویز کے ہوتے ہیں کہیں مصلحت کہیں مصلحت وقت کہیں حکمت عملی۔

بس حضرت اب یہ آزاد

لاہور تکیہ ایوب شاہ

جناب من،

تسلیم۔ آپ تو راحت کہلاتے ہیں اور دیکھتا ہوں کہ ہر بات میں گھبراتے ہیں۔ زبان کا حساب ابھی تک لکھا ہے ہیں نے اور مطابع میں یہ دریافت کیا۔ جس وقت مہر ... میں اضافہ فرمائیے۔ انشاء اللہ اسی دن خدمت میں روانہ کیا کرونگا۔ کیا کروں کیونکر آپ کے دل میں اعتبار پیدا کروں!

... کے باب میں دیکھتا ہوں کہ وہی نا امیدی کے کلمے ہیں۔ یہ بے ہمت پستی پر آپ نئے کیوں ڈالتے ہیں۔ یہ ہے کیا تعجب! آپ کی مدد سرکار سے حضرت ... علامہ آزاد کے دوست ... ہوگی۔ انشاء اللہ آپ دیکھیں گے اس سے بہتر صورت ہوگی اور بدرجہا بہتر ہوگی۔

... دوست با کمال آزاد کو ۵۰ روپے پنشن بھی ہو جائے تو ہزار ہزار شکر خدا کا بجا لائیگا اور بغلیں بجا بجا کر رقص کریگا۔

حریص نسخ نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں
آنچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

آملا پھر انشاءاللہ کیا خاطر جمع اور شگفتگی طبع کے ساتھ تصنیفات کو درست کروں ۔

محمد حسین آزاد

لاہور۔ بنگلہ ایوب شاہ ۲۰۔ اپریل سنہ ۸۴ء

جناب من !

تسلیم۔ کل کیم مئی کو ایک نظم متفرق رسال خدمت کیا ہے۔ خدا کرے پہنچ جائے چاہتا ہوں کہ جستہ جستہ کی گرد ار سمجھوں مگر یہ سمجھ کر نہیں بھیجتا کہ دمڑی کی بڑھیا ٹکا سر منڈائی۔ آپ کیا کہینگے۔

الحمدللہ بندہ زادہ رڑکی پہنچ گیا۔ خدا و مولیٰ حافظ و ناصر رہیں۔

جمال الدین خاں کونی افغان مضافات کابل کا ہے اور پیرو ہے جوہری سوڈانی کا۔ اُس نے پیرس میں آکر ایک اخبار عربی زبان میں جاری کیا ہے۔ مختلف مقامات ہندوستان میں بھی اس کے پرچے آئے ہیں۔ ۴ نمبر میری نظر سے بھی گذرے۔ ارادہ ہے کہ خود لیکر حاضر خدمت ہوں۔ آپ نے وہاں کچھ چرچا اس کا سنا ہے یا نہیں۔ بھائی صاحب سے بھی لکھ کر حال دریافت فرمائیگا۔

وزیر لنکران کے قصہ میں جو الفاظ ہیں۔ انکی واکیبلیری میں سب موجود ہیں میرا مطلب یہ ہے کہ جو الفاظ اس میں ایسے ہیں کہ ہماری کتابوں میں یعنی برہان قاطع وغیرہ فارسی کی فرہنگوں میں نہیں ہیں وہ آپ الگ لکھتے جائیے۔ آپ فرمائینگے کہ ہمیں کیا خبر ہے کہ کیا کیا الفاظ برہان میں نہیں۔ خیر میں خود چند صفحے صرف کرونگا۔

۲۔ مئی سنہ ۸۴ء آزاد

جناب من !

تسلیم۔ نامہ نامی ایسی حالت میں پہنچا۔ کہ انتظار حد مایوسی کو پہنچ چکا تھا۔ پھر بھی

غنیمت ہے کہ پہنچا تو سہی - میں نے تو آپ سے کہدیا تھا کہ اگست سے چھٹیاں شروع ہونگی
اور ۵ - اکتوبر کو ختم ہونگی - مگر آپ کو کب یاد رہتا ہے - دل بہت چاہتا ہے کہ وہیں آکر
رہوں مگر فرصت کہاں؟ اور موقع کجا؟

پیر سال یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کے حکم بموجب لکھ بھیجا ہے کہ یکم اکتوبر
سے میری تنخواہ یونیورسٹی سے ملا کرے - گویا اس تاریخ سے میں ان کے تحت سمجھا جاؤنگا -
قسمت با نصیب

فرصت کا حال یہ ہے کہ ۲۱ - جولائی کو یہاں امتحان لازمی تھا - ۵۰۲ آدمی امتحان
میں بیٹھے تھے مجھے وجہ انکار کے باہی کا ممتحن کیا - ۳ پرچے جن کے ۱۶۰۲ کاغذ
دیکھنے پڑے ہیں - ایک پلنگ بھرا ہوا ہے - دیکھتا ہوں اور لہو خشک ہوتا ہے کہ الٰہی
یہ بوجھ کیونکر اٹھیگا - ۱۵ - اگست کو رزلٹ دینا ہے - فرمائیے کہ اس چھٹی کا نام کیا ہوا -
خدا گواہ ہے کہ بار بار انکار کیا - نہ قبول ہوا - نہ چار - طفل بمکتب میرود - والے بر نیش -
انصاف کیجئے کہ اب تصنیف کے لئے طبیعت میں ذوق شوق پیدا ہو تو کہاں سے
ہو - برابر خطوط چلے آتے ہیں کہ فرمائیے دربار اکبری کا کیا حال - قند پارسی (گفتگوے
فارسی) کا کیا حال ہے - لیکچروں کا کیا حال ہے - یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ آزاد کا کیا
حال ہے -

• تحفۃ العوام کا عکس جو مطلوب ہے انشاءاللہ عنقریب دریافت کرکے عرض کرونگا -
شفق کے پرچے الگ الماری میں رکھتا جاتا ہوں - تیار - آپ کے حکم کے منتظر ہیں
• اس خط کا جواب آئے تو روانہ خدمت کروں -

میں جیسا تھا ویسا ہی ہوں - نہ ساون ہرا - نہ بھادوں سوکھا -
ایک دن ایک صاحبزادے - جن کا قیافہ شرافت اصلی کی گواہی دیتا تھا تشریف لائے
کہ بلگرام کا رہنے والا ہوں - سید ہوں - یہاں پڑھنے آیا ہوں - سید مصطفیٰ نام

ہے۔ سبحان اللہ۔

تاثیر ہے کیا خاک میں اس سجد کی کہ ہے　تو مجھ سے تو بہ ہے

ہر ہر سے جو نکلے ہے یاں ناقہ لیلے　اے جذب محبت

بہرحال مجھے خیال ہوا کہ لڑکے ہیں۔ ناتجربہ کار ہیں۔ مبادا کہ گھر سے کسی بات پر ناراض ہو کر نکل کھڑے ہوئے ہوں۔ انہیں روک لیا۔ اور اسی دن آپ کے بھائی صاحب کو لکھا۔ وہاں سے جواب چہ معنی دارد۔ خیر۔ وہ حقیقت میں جیسے شریف ہیں ویسے ہی سعید ہیں۔ چنانچہ تیسرے دن جماعت اول گورنمنٹ سکول میں داخل کروا دیا۔

دکن جانے کو دل بہت چاہتا ہے مگر دور کا سفر ہے۔ دوسرے دو سو روپے کا خرچ ہے اور فائدہ کچھ بھی نہیں۔ فقط سیر ما تما۔ اس لئے غور طلب امورات کی مد میں رکھا ہوا ہے۔

شفق ابھی آیا۔ اکثر پرچے آپ کے دیکھنے کے قابل ہیں۔

بس حضرت اب کچھ - 　دعا و التماس دعا

آزاد

۲۷ - جولائی ۱۹۶۲ء

جناب من!

تسلیم۔ مجھے بھی کئی دن سے خیال تھا۔ الحمدللہ کہ خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ بدلی سے یہ تو خوشی ہوئی کہ ایک دن لاہور کی منزل میں ملاقات ہوگی اور بہت سی باتیں جو تحریر میں نہیں سماتیں۔ زبانی ادا ہونگی۔ مگر یہ خیال ہے کہ اب ہندوستان کی طرف بڑھتے چلے جائینگے۔ خیر میں نے کونسا پنجاب سے نکاح کیا ہوا ہے۔

سبحان اللہ۔ سکوں کا شوق آپ کو کب ہوا جبکہ سکوں کی کان سے آپ جدا ہوئے ہیں۔ جہلم سے لیکر پشاور تک سکوں کا گورستان ہے۔ مجھے آپ سے زیادہ شوق تھا۔

لکھنؤ کا آخری تاجدار

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

پھر ایک دوسری عرضداشت پہنچی کہ کاننگی صاحب برقندازوں کے ساتھ آئے اور چھتر منزل[1] خالی کرا دیا۔ متعلقات علی نالاں اور کریاں محل سے رخصت ہوئے جن کے اسباب متفرق ہیں۔ چند تھیلی توڑیں جو کہ تھے کے دروازہ پر تھیں نہیں باہر کئے گئے ہیں کوٹھے پر پہرہ ہو گیا ہے۔ درخواست کرام چیف کمشنر بہادر سے معلوم ہوتا ہے کہ کوٹھوں کا اسباب نیلام کر کے حملہ کی تنخواہ تقسیم کریں گے۔ ۲۰ - ذوالحجہ روز جمعہ ۱۲۷۳ھ کی صبح کو چیف کمشنر بہادر صاحب بہادر سیکرٹری صاحب بہادر و کاننگی صاحب بہادر مدار المہام وزرا کوتوال نے آ کر حسام الدولہ بہادر سے ... کی کنجی طلب کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں نہیں لایا ہوں۔ حکام مذکور نے محمود خاں کو حکم دیا کہ آہنگر کو بلوا کر قفل توڑ دو۔ داروغہ چابی بھی حاضر کی گئی۔ جب تک کہ حکام صاحبان مذکور اول کوٹھہ فرش خانہ میں دیوان میں تشریف لے گئے اور پھر گھبرا کر واپس آ گئے۔ محمود خاں کو اسباب کھولنے اور قلم بند کرنے کا حکم دیا اور پہرے مقرر کئے۔ چنانچہ ایک صندوق میں طلائی مرصع المارین اور ایک ... مروارید جھلے اور انگوٹھیاں۔ ایک مینا کا چھپڑ۔ مروارید یاقوت کے نگینے اور دس چاندی کے صندوق چھپے برآمد ہوئے۔ خلافِ حکم حکام عالیشان حسام الدولہ بہادر اور مفتاح الدولہ بہادر کچھ نہیں کر سکتے۔

---

[1] چھتر منزل کے اندر ... نواب سلطان محل صاحبہ ... نواب خورد محل صاحبہ حضرت بیگم اور چند بیگمات مثل نواب فرخندہ بیگم وغیرہ رہا کرتی تھیں۔ چھتر منزل کے اندر ایک ... کا حوض بھی تھا جس میں چاروں طرف مقابل میں قد آدم آئینے تھے اور قیصر باغ المعروف بہ ... حضور محل۔ نواب نگار محل۔ نواب آسمان محل اور نواب سلطان محل صاحبہ رہا کرتی تھیں۔

پھر اس مضمون کا خط موصول ہوا۔ کوٹھی حسین بخش میں کتب خانہ سلطانی تھا۔ صاحب الحکم چیف کمشنر بہادر صاحبان عالیشان نے مارٹن کی کوٹھی میں اٹھائے گئے ہیں۔ ہم سمعوں نے عذر کیا کہ مارٹن کی کوٹھی ملاک سرکاری نہیں۔ مگر جواب مسموع نہ ہوا۔ ۱۹۔ اگست ۱۸۵۶ء کو چیف کمشنر بہادر نے حسام الدولہ بہادر کو حکم دیا ہے کہ مکانات متصل فرح بخش پانچ دن میں خالی کر دیے جائیں اور چونکہ ان سے کلمات بے ادبانہ سرزد ہوئے اس لئے سوائے صحت الدولہ بہادر کمشنر صاحب ممدوح اور کسی کو متوسط اور وکیل شاہی نہ تصور فرمائینگے"۔

اب برابر لکھنؤ سے خطوط آ رہے ہیں تانتا نہیں ٹوٹنے پاتا۔ کوئی واقعہ وہاں گذرا اور یہاں بادشاہ کو اس کی خبر پہنچ گئی۔ اسی اثنا میں دبیر الدولہ بہادر نے یہ عرضداشت لکھی کہ پندرہ دن سے جملہ مصارف سرکار ابد قرار مسدود ہے۔ اس وجہ سے ہر کارخانہ میں اضطراب لاحق ہے۔ سابق میں خانہ زاد اطلاعاً عرض کر چکا ہے کہ کانگی صاحب بہادر نے صحت الدولہ بہادر۔ مفتاح الدولہ بہادر اور اقبال الدولہ بہادر سے تلف و صرف مال کی نسبت اقرار نامے لئے ہیں۔ چونکہ بقالوں کو غرہ ذوالحجہ ۱۲۷۲ھ سے خرچ نہیں ملا ہے اس لئے اشیاء رکھنے میں پہلو تہی کرینگے اور جبہ فرو غیرہ ضائع ہونگے۔

اس کے بعد مفتاح الدولہ بہادر نے ۱۸۔ محرم ۱۲۷۳ھ کو یہ عریضہ لکھا۔ "مارٹن صاحب بہادر کوٹھی کے منہدم مقرر ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ عملہ سلطانی کے سامنے کوٹھہ کھولا جاوے اور عملہ انگریزی ان کے مقابلہ میں اسباب کی فہرست مرتب کرے۔ صاحب بہادر غرہ محرم سے کوٹھہ جات تحویلخانہ، فراشخانہ اور عمارت خانہ و فرحت بخش کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اس کے بعد کوٹھہ جات فرحت بخش کا جائزہ شروع ہوگا۔ اور بعد انفراغ سنا جاتا ہے کہ اسباب نیلام ہونگے۔ اس قسم کے عرائض صرف اہلکاران شاہی تک محدود نہ تھے بلکہ خدمات

غلیمی بھی ان زار نالیوں میں ہم آہنگ تھیں۔ چنانچہ نواب خورد محل صاحبہ اور دیگر محلات نے بھی اس عنوان کا خط لکھا کہ مفتاح الدولہ بہادر وغیرہ سے مچلکہ لیا گیا ہے۔ وہ حکام عالی مقام کے حکم کے خلاف ایک پیسہ میں بھی ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ سب محلات اور ملازمین خرچ روزمرہ کے لئے حیران و پریشان ہیں۔ دواب پر برابر فاقہ ہو رہا ہے اور جو ہتھیار کہ تحفہ ہیں اور جن کا ملنا مشکل ہے انکا نیلام اس طرح پر ہو رہا ہے کہ وہ تلوار یا بندوق ولایتی مثل رفل وغیرہ جسکی قیمت ہزار ہزار روپیہ تھی وہ ستر ستر اور اسی اسی پر نیلام ہو رہی ہے اور صاحبان انگریز انکو خریدتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پہ داروغاؤں کو برقندازوں کے ذریعہ سے کھنچوا منگواتے ہیں"۔

جب دیار غربت اور انبوہ رنج و آلام میں ایک ایسے فلاکت زدہ کے پاس جس کے اختر بخت نے سریر سلطنت کو فقیری سے بدل دیا ہو۔ اس قسم کے خط آئیں تو فرمائیے۔ اس کے قلب کی کیا کیفیت ہوگی۔ سوا اس کے کہ وہ صبر کی سل چھاتی پہ رکھ لے اور مردانہ وار تحمل اور غیر معمولی شکیبے سے کام لے۔ بادشاہ نے ۲۔ محرم ۱۲۷۳ھ کو اس مضمون کا ایک پرچہ بنام گورنر جنرل بہادر کو تحریر فرمایا "اس عرصہ میں اخلاصمند نے جو کچھ سنا ہے وہ یہ ہے کہ کاریگی صاحب نے محلات کو نہایت رسوائی کے ساتھ چھتر منزل سے علیحدہ کر دیا۔ ان کی داد بیداد تک نہ سنی حالانکہ روانگی کے وقت اتحاد قدیم اور احتیاط کے لحاظ سے اخلاص کیش اپنے حرم اور تمامی اسباب کو حکام کی حفاظت میں دے آیا تھا۔ مگر نیازمند کے اہل و عیال کی بڑی بے حرمتی ہوئی اور عتاب و خطاب جو کچھ حسام الدولہ میرے عزیز کے ساتھ ہوئے وہ ملاحظہ نقول کاغذات سے آپ پر واضح ہونگے۔ مخلص ناکردہ گناہ نے کونسا جرم عظیم کیا کہ ایسے عقوبت ہائے شدید کا مستوجب ہوا۔ اور بعد ان ذلتوں کے کوٹھہ مچھی بھون جن میں فرش فروش اور دیگر اسباب تھے بموجب حکم حکام اس کے قفل توڑے گئے۔ پہرے بٹھائے گئے اور کوتوال کو حکم ہوا کہ اسباب قلمبند کرے۔ اس تحریر سے بھی جب دل کی بھڑاس نہ نکلی تو پھر دسویں محرم کو وائسرائے

سے یوں شکوہ سنج ہوتے ہیں " زیادہ ملال کا باعث یہ ہے کہ کارندگانِ لکھنؤ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ اہلکارانِ مخلص کو طلب کر کے دس دس ہزار کی ضمانتیں لی گئی ہیں۔ کہ کوئی شہر سے نقل و حرکت نہ کرے اور حکم ہوا ہے کہ کوٹھہ جات اور اسباب وغیرہ یا بادشاہ نے جس جس کو جواہرات عطا کئے ہیں ان کی تفصیل جلد داخل کریں۔ پھر یہ بھی پوچھا گیا کہ اہل و عیالِ بادشاہ کا خرچ روزمرہ کہاں سے چلتا ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ بادشاہ روانگی کے وقت کئی ہزار روپے اور اشرفیاں چھوڑ گئے تھے۔ اس پر انہیں حکم ہوا کہ آج سے ایک حبہ بغیر حکم کسی کو نہ دیا جائے ورنہ بہتر نہ ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اہل و عیال اخلاصمند شاید زندہ نہ بچینگے۔ لہٰذا بنام حکام حکم صادر ہو کہ کوٹھہ جات سے پہرے اُٹھالیں اور محلات کو چھتر منزل میں رہنے کی اجازت دیں" چہ ایک مقع پروانسر لمئے سے درخواست فرماتے ہیں۔ کہ ایک تار برقی حکام لکھنؤ کو بھیجا جائے کہ اہل و عیال مخلص اور دواب کے مصارف روزمرہ سے تعرض نہ کریں اور اس کے صرف کو بدستور اہلکارانِ مخلص سے متعلق رکھیں۔

وہ جس جس طرح سے لکھنؤ سے مراسلات آتے ہیں۔ اس اُس طرح سلطان عالم والیسرائے سے داد فریاد کرتے ہیں۔ ایک پرچہ پیام اس عنوان سے ارقام فرماتے ہیں۔ ؎

" ہر دم از این باغ برے میرسد تازہ تراز تازہ ترے میرسد "

" سردست پھر کا رینگی صاحب اپنے متعمدیوں سے کوٹھوں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ کوٹھہ ہوا فرح خانہ۔ واقع فرح بخش کے جائزے کے بعد اسباب اُٹھا کر لینگے۔ کوٹھی لال بارہ دری میں لا کر انبار کر دیا اور اکثر اسباب کو اِدھر سے اُدھر کر رہے ہیں۔ علاوہ اس کے اموال و اسبابِ بالیت عظیم کو قبل بھی تلف و نیلام کیا اور اب بھی اُن کی غارتگری کے درپے ہیں۔ اور مکانات ملوکہ شاہی کو منہدم کر رہے ہیں۔ لہٰذا قدامتِ اتحاد اور یکرنگیِ اسلاف کے لحاظ سے حکامِ لکھنؤ کو لکھا جائے کہ جس قدر اسباب ہیں وہ بغیر اجازت مخلص ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ کئے جائیں اور حسام الدولہ۔ دبیر الدولہ۔ مفتاح الدولہ اور منشی محمد حسین کارندگانِ نیازکیش کے مواجہہ میں حکام

لکھنؤ کوٹھہ جات کے تمام اسباب و جواہرات ۔ آلات ۔ اجناس ۔ نقرہ اور قماش وغیرہ کی ایک فہرست مرتب کرکے کارندگان مذکور کے حوالہ کریں اور کوٹھوں میں قفل پڑ جائیں اور اُن پر تینوں کی مُہریں ہو جائیں اور فہرست پر وہاں کے حکام دستخط کرکے اُسے آپ کی خدمت میں ارسال کریں اور آپ کے ذریعہ سے وہ مخلص تک پہنچ جائے ۔ علاوہ اس کے قبل میں بہت سے جواہرات اور اسباب مخلص چوری گئے تھے اور منشی مذکور کے اہتمام سے کچھ چیزیں برآمد ہوئی تھیں اور کچھ باقی رہگئی تھیں کہ اس اثنا میں دخل سرکار انگریزی ہوگیا ۔ اور اس انقلاب عظیم میں اکثر اسباب تلف اور ضائع ہوگئے ۔ براہ شفقت حکام متعینہ بیت السلطنت لکھنؤ کو تحریر کیا جائے کہ اسباب مسروقہ اور تلف شدہ کی جستجو کریں اور بہم پہنچائیں"۔

۲۳ ۔ مارچ ۱۸۵۸ء کو صحت الدولہ بہادر نے لکھنؤ سے اطلاع دی کہ آم والا کوٹھہ جو محمد حسین کی حفاظت میں تھا کھولا گیا اور ۸۹ عدد پیے اینان جن میں ولائتی چقماق کے علاوہ اور چیزیں بھی تھیں ۔ جان محمد تھانہ دار پختہ پل اور وزیر بیگ محرر کچہری کارخاص کے مقابلہ میں قلمبند ہوئیں ۔ شام کے وقت تمام پیے اینان یہاں سے اُٹھ کر داخل کوٹھہ آہن ہوئیں ۔ صبح لارنس صاحب بہادر چیف کمشنر یہاں اور کوٹھہ گدام میں تشریف لائے ۔ اسباب معائنہ فرمایا اور اس کے بعد چھتر منزل کی طرف روانہ ہوئے ۔ سابق الحکام ۔ اسلحہ ۔ بندوق پتھر کلوں کے جائزہ میں مصروف تھے ۔ فہرستیں مرتب کرتے تھے ۔ اب کوٹھہ اسلحہ خانہ زیر کوٹھی لال بارہ دری کے جائزہ میں مشغول ہیں ۔ جن میں ہر قسم کی شمشیر ولایتی اور ہندوستانی مع نیام زر دوزی جن کے نقرئی و طلا مرصع ۔ بعض کے سادے ۔ بعض کے سنگ یشب اور مرجان کے قبضے ۔ جن کی کارچوبی دشکیں ۔ علاوہ ان کے چھریاں ۔ قرولیاں ۔ کٹار ۔ تمے ۔ جنکے نیام نقرئی ۔ طلائی ۔ عاج کے یا سادے اور بعض بے نیام مع دستہ سنگ یشب شیر ماہی و نقرئی جن کے زر دوزی بادلے اور مروارید کے جھبتے ۔ نہایت بیش قیمت نایاب سات سو تیئیس عدد ۔ علاوہ ان کے تیر آہنی ۔ گرز آہنی ۔ بچھوے ۔ زنبورک ۔

چڑایل۔ناغ نول۔تیر نح ترکش مخملی وغیرہ۔ دونالی اور ایک نالی بندوقیں۔شیر بچے۔فرا بینیں ۱
جیبہ لیے یہ سب برآمد ہوئیں۔

اخبار طلسم لکھنؤ | اسی زمانہ میں اخبار طلسم لکھنؤ میں ۵۔ستمبر ۱۸۵۶ء کو یہ مضمون شائع ہوا۔"اب تازہ سُننے صاحب موصوف نے چودھویں تک اس امر کی میعاد ٹھہرائی ہے۔ مگر محلات نے جو حضرت کی طرف سے جواب کے منتظر تھے مکانات خالی کر دینے میں جلدی نہ فرمائی۔

جب میعاد سے کئی دن زیادہ گذرے تو صاحب چیف کمشنر بہادر نے بہ تاکید کی حسب سررشتہ صاحب منتظم شہر کے نام چٹھی لکھی۔منتظم نے اس پر بھی محلات کو حکومت نہ جتائی۔سوا افہام تفہیم کے کچھ زبردستی نہ دکھائی۔یہاں تک کہ تاکید شدید سے مامور ہوئے شدت کرنے میں ناچار ہوئے مجبور ہوئے۔آخر عذر محرم وغیرہ محلات شاہی کا مسموع نہ کیا۔شبا شب مع اسباب سب کو اٹھا دیا۔رات کے سبب سے جو کھاٹ کباڑ باقی رہا۔دن کو جیبنی بازار کے نقصان دار کی تاکید سے اٹھا۔غرض بیٹھے بٹھائے کیا پریشانی اٹھائی۔زمانہ کی گردش نے عجب ویرانی دکھائی۔تمام خلق کو رقت تھی۔یہ حیرانی دیکھ کر حیرت تھی۔دیکھنے والوں کا دل کڑھتا تھا۔مگر کیا ہو سکتا تھا۔ایک دوسرے کا منہ تکتا تھا۔روتا تھا۔بلکتا تھا۔

پھر اُس اخبار میں ۳۔اکتوبر کو دوسرا مضمون شائع ہوا۔ہنگل سین والی کوٹھی میں پرسوں تک نیلام ہوتا رہا۔ہر روز صبح سے دس بجے وہی سودا رہا۔۲۶۔ستمبر کے نیلام میں ایک سیف گجراتی نکلی جس کا لوہا ایسا اچھا تھا کہ اس پر سرکار ابوالمنصور خان بہادر صفدر جنگ آب زر سے لکھا تھا۔تیسویں تاریخ چھ روپے کو ایک توڑے دار بندوق کا نیلام دیکھا۔ابوالمنصور خان بہادر اور محمد یونس کاریگر کا نام منقوش تھا۔ایک بندوق پر

۱؎ بندوقیں جو ہاتھی پر چھوڑی جاتی تھیں۔اور ناغ نول وہ جو اونٹوں پر فیر ہوتی تھیں۔یہ سب شاہی زمانہ کی اصطلاحیں تھیں ۱۲

نواب شجاع الدولہ بہادر تحریر تھا۔ دُوسرے پر وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر رقم پذیر تھا۔ پانچ پانچ سو پر دونوں چھوٹیں۔ دیکھنے والوں کی کمریں ٹوٹیں۔ ایک بندوق ساڑھے آٹھ روپے کو بکی تھی۔ جس پر سونے سے یہ عبارت لکھی تھی۔

"حسب فرمائش واکم خاں بہادر واکم الدولہ تیار شد"

دس بارہ روپیہ کو بہت سی اصفہانی تلواروں کا نیلام ہوا کہ اُن پر ابوالمنصور خاں سونے کے پانی سے لکھا تھا۔ یکم اکتوبر کے نیلام میں اور دنوں سے بھی سستا سودا کیا۔ سو روپیہ کا مال ایک روپیہ کو بکا۔"

۹۔ فروری ۱۸۵۶ء کو بادشاہ نے جنرل اوٹرم کو ایک پرچہ پیام لکھا جس کا جواب اُنھوں نے یہ دیا کہ اس حالت پرآشوب میں تعین پہرہ صرف احتیاط و خیرسگالی اور حفظِ اسباب سرکار عالی کی نظر سے تھا اور جیسا کہ خدانخواستہ مافی الضمیر حضور ہے۔ وہ بات ہرگز نہیں۔ چنانچہ اس خصوص میں ایک مجلس شورے منعقد ہوگی جس میں حکام انگریزی اور معتمدان سرکار والا دونوں جمع ہونگے اور ان کی صلاح کے موافق جس قدر اسباب خانگی اور ذاتی حضور کے ہیں اُن سے کوئی تعرض نہ کیا جائیگا اور جو کچھ کہ لوازم سلطنت و ریاست ہیں ویسا عمل میں آئیگا۔

پرچہ پیام بادشاہ | چونکہ اہلکارانِ شاہی کے شکایت آمیز خطوط برابر آرہے تھے اور اُن میں لکھنؤ کے انقلاب و انتظاماتِ جدید کا اظہار تھا۔ بادشاہ نے ایک تفصیلی خط اس مضمون کا وائسرائے کو لکھا۔ افسوس ہے کہ قطعہ کوٹھی واقع دولتخانہ جس کا بڑا دروازہ تالاب حسین آباد کی جانب تھا اور اس اسباب مثل پالکی اور نالکی کے تھا اس کے اوپر کا درجہ بالکل منہدم کردیا گیا۔ اور اس پر ایک پھوس کا بنگلہ ڈالا گیا ہے۔ ایک کوٹھی دولتخانہ کہ اس کے عین راستہ میں ایک شہید مرد کی قبر تھی اُسے بھی منہدم کرڈالا ہے اور ایک بنگلہ بنایا ہے پتھری والے تالاب پر تلنگوں کی سکونت کے لئے چند بارکیں بنائی ہیں اور سب کو کھود کر

میدان کردیا ہے۔ بڑی کوٹھی جانب شمال باقی ہے اور اس کے متعلق اور مکانات منہدم کر دیئے گئے۔ تیسری کوٹھی کی دیواریں تھوڑی تھوڑی باقی ہیں۔ اشرف علی خاں کی بارہ دری جو سینچہ والے اصطبل کے برابر اور نو لکھے دروازہ کی جانب اور بہت عالیشان مکان تھا اُسے بھی جابجا کھود ڈالا ہے۔ سابقاً سڑک پر ایک مکان بنتا تھا وہ ناتمام تھا اور اس میں غسلخانہ وغیرہ تھا اُسے بھی کھود کے ویران کر دیا۔ شیر دروازہ کا اُدٹ اور بارگاہ اندرونی بالکل کھود ڈالی۔ دروازہ کے مقابل جلوخانہ خاص اور قریب چینی بازار تھا۔ مع دیوار رمنہ خاص تا کوٹھی تارے والی سب کھود ڈالا ہے۔ جو ٹپو والا اصطبل بھی بالکل پست و نابود کر دیا ہے۔ انبار خانہ کھود ڈالا۔ مسجد جو سینچہ والے اصطبل کے قریب تھی اُسے مسمار کر دیا۔ اور دو مسجدیں جو اصطبل چوپڑ کے متصل تھیں اُنکو اپنے قبض و تصرف میں لائے ہیں۔ اہلکاران سرکار انگریزی تمام شاہی عمارتوں میں مزاحم اور خلل انداز ہیں۔ مکان فرح بخش میں سگ و اسپ باندھے جاتے ہیں۔ بی بی پور کوٹھی چکر والہ اور دل آرام علاوہ ان کے اور کوٹھوں کے قفل بجبر توڑے گئے اور وہاں کے اسباب تصرف میں لائے گئے۔ چیف کمشنر نے ہمارے اہل و عیال کی درخواست پر توجہ تک نہ کی۔ تمامی دفاتر۔ منشی خانے اور دیوان خانے کو اپنے قبضہ میں لائے اور کاغذات جواہر خانہ بھی قرق و ضبط کر لیا"۔

محنت بابتہ دارہ بہرائے بہادر	اس کا جواب جو گورنمنٹ نے دیا وہ یہ تھا کہ یہ مزاحمتیں بادشاہ

سے خلاف واقع بیان کی گئیں۔ کوئی اسباب شاہی ضبط یا تلف نہ ہوا۔ بلکہ برعکس اکثر اسباب حفاظت سے رکھے گئے اور کوئی مکان بزرگان بادشاہ سے منہدم نہ کیا گیا۔ جلوخانہ اور دیوار کوٹھی فرح بخش کہ حائل راہ تھی۔ وسعت کے خیال سے توڑ دی گئی۔ کوٹھی فرح بخش میں ہرگز سگ و اسپ نہ باندھے گئے۔ اس کے صحن میں چند مکانات بیرنی جہاں سابقاً شاگرد پیشہ رہتے تھے اور گھوڑے بھی باندھے جاتے تھے اسی طرح سے

اب بھی استعمال میں ہیں - دفاتر سرکاری و ملکی پر پہرے مامور ہیں اور جس دفتر میں کاغذات شاہی نہ تھے وہ قبض و دخل میں آئے - کوئی قفل کسی کوٹھے کا توڑا نہ گیا - مفتاح الدولہ مختار شاہی سے کہا گیا کہ کوٹھے کے چند دروازے کھول دیں اور اگر نہ کھولینگے تو بزور کھولے جائینگے - اور اسباب شاہی کا تلف ہونا کیسا بلکہ وہ اور محفوظ رکھے گئے چیف کمشنر نے شاہ اودھ کے محلات کی کسی درخواست کو نا منظور کیا - دواب کے بارہ میں گذارش ہے کہ مختار شاہی سے یہ کہا گیا تھا کہ جس قدر جی چاہے لے لیں - مگر اُنہوں نے انکار کیا - پھر مختاران شاہی نے دواب چیدہ اور منتخب لے لئے اور جس قدر ناپسند ہوئے اور چھوڑ دیئے وہ نیلام کر ڈالے گئے - جوڈیشل کمشنر نے کاغذات اسباب ریاست کے ساتھ اسباب گراں بہا کی چند فہرستیں پائیں مصلحت سمجھی گئی کہ محافظین متعینہ پر اسباب مذکورہ کی تفصیل لکھنے کی تاکید کی جائے اور اُن سے اس امر کا اقرار نامہ لیا جائے کہ تا تحقیقات اسباب سرکنے نہ پائیں - یہ محض غلط ہے کہ جنرل اوٹرم اسلحہ اپنے قبض و دخل میں لائے - جب قائم مقام چیف کمشنر میگزین اُٹھا لے گئے اور صحت الدولہ وکیل شاہی نے یہ کہا کہ اسلحہ مرصع خاص شاہی ہیں اور وہ واپس دیئے جائیں تو اُس وقت وکیل سے کہا گیا کہ جس قدر بادشاہ کے لئے اسلحہ درکار ہوں الگ کرلو اور قبل نیلام بھی وکیل سے پوچھ لیا گیا تھا کہ تم نے چیزیں لے لیں - وکیل مذکور نے اقرار کیا اس کے بعد جس قدر اسلحہ ناکارہ تھے وہ معرض نیلام میں آئے -

اس کے بعد بادشاہ نے جواب الجواب بھی لکھا مگر گتھی کسی طرح نہ سلجھی - اور یوں ہی رہ گئی -

باقی آئندہ

کہ ایسا ہوا ہوگا۔ موخرالذکر میں فن تحریر بھی آجاتا ہے۔ اکثر موقعوں پر ہم کو تحریر کی بنا اور اُس کی ترقی معلوم کرنے کے لئے معلول سے علل کی طرف جانا پڑتا ہے۔ کبھی مشاہدہ سے کام نکلتا ہے تو کبھی قیاس سے۔ ان وجوہات سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابتدا سے لیکر موجودہ زمانہ تک کی منازل کو جوکہ فن تحریر نے طے کی ہیں معرض بحث میں لانے کے لئے جو مصالحہ چاہئے وہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے اور نہ ہم میں اس قدر قابلیت ہے کہ تھوڑے سے مصالحہ میں ایک عمدہ چیز تیار کریں۔ اس لئے اس پر اکتفا کرتا ہوں کہ انسانی خیالات اور جذبات کو عالم اظہار میں لانے کا سب سے پہلا طریقہ کیا تھا۔ وہ کس نے ایجاد کیا۔ اور اس سے ہمارا طریقہ تحریر یعنی عربی۔ ایرانی۔ ہندوستانی۔ فرنگی وغیرہ وغیرہ طریقے کیسے نکلے۔ مگر صرف اس قدر بحث میں بھی اختصار کو زیر نظر رکھا جاویگا۔

مختلف تواریخ الحروف اور علم الحروف کے عالموں کی تصانیف سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ موجودہ یورپین اور ایشیائی زبانوں کے حروف قدیم مصری حروف الصور سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ چینی حروف اگرچہ مصری حروف سے ملتے جلتے ہیں لیکن ان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے بلکہ خود ملک چین میں ایجاد ہوئے اور اتفاق سے قریب قریب ایک ہی طرز کے بنائے گئے۔ ہم اس طویل بحث کو چھوڑکر زیادہ کارآمد بات کی طرف جاتے ہیں۔ قدیم مصری حروف کو اہل مصر نے ایجاد کیا۔ چونکہ ان لوگوں میں اب سے زیادہ قابل توجہ اور تکریم چیز حیوان مطلق تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے اسی لئے سب سے پہلے انہیں کی طرف خیال راغب ہوا۔ اور انکی تصاویر خیالات انسانی کے اظہار کا ذریعہ مقرر کی گئیں۔ اس کے بعد اُن میں بہت سی ایسی چیزوں کی تصویریں اور شکلیں بھی شامل کی گئیں جو اس دنیا میں ہم کو دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً ستارہ۔ درخت۔ مکان۔ پانی وغیرہ وغیرہ حتیٰ کہ ایک پوری الف۔ بے۔ نے

ہنگمی جس کو مقدس حروف کے نام سے موسوم کیا گیا اور اسی وجہ سے ان کو زبانِ یونانی میں "ہیرا گلفک" کہتے ہیں۔ ہیراگلفک حروف کا جلد جلد لکھنا یا تھوڑی جگہ میں لکھنا زیادہ وقت طلب تھا۔ اس لئے اُن کا اختصار کر کے دو قسمیں اور نکالی گئیں جن کو ہیراٹک اور ڈیماٹک کہتے ہیں۔ اوّل الذکر مذہبی کاموں کے لئے اور موخر الذکر روزمرہ کی دُنیاوی کارروائی کے لئے جیسے کہ قدیم اہلِ ہنود میں تجارت پیشہ اور معمولی درجہ کے لوگوں کے لئے اور زبان تھی اور دربار اور برہمنوں کے لئے دوسری۔

یہ حروف بلحاظ معنی دو طرح کے ہوتے تھے (۱) آئیڈیوگرافک Ideographic یا کاشف الخیالات (۲) فونٹک (Phonetic) یا کاشف الصوت۔

نمبر (۱) دو حصوں پر منقسم ہے (ا) اس قسم کی تصویریں جن سے بعینہ وہ اشیا معلوم ہوں جن کی وہ تصویریں ہیں مثلاً ✳ سے ستارہ (ب) اس قسم کے نشانات جنمیں اور اُن چیزوں میں جن کا اظہار مقصود ہے زیادہ سے زیادہ مشابہت ہو۔ جیسے ⏜✳ سے رات معلوم ہو کیونکہ اوپر کے حصہ سے آسمان اور نیچے کے حصہ سے ستارہ معلوم ہوتا ہے۔ ستارہ آسمان پر عموماً رات کو نمودار ہوتا ہے۔

نمبر (۲) بھی دو حصوں پر منقسم ہے (ا) جس سے صرف ایسی آواز معلوم ہو جس کے حصے نہ ہو سکیں مثلاً آ۔ ای۔ او وغیرہ وغیرہ (ب) جس سے ایک مرکب آواز کے مختلف حصے معلوم ہوں۔ مثلاً ہاے "من" "ما" کے لئے اور حرف ہوگا اور "اسے" کے لئے اور حرف کاشف الصوت حرف کے اس قسم کو Syllabic یا اجزائی کہتے ہیں۔

چامپولین کا خیال ہے کہ حروف کی ایجاد مصریوں نے اس طرح سے کی۔ قدیم مصری لوگ منہہ کو "رو" کہتے تھے اور منہہ کی شکل یہ "⬭" ہوتی ہے بس اسی شکل

کو حرف "ر" مقرر کر لیا ممکن ہے کہ ایسا ہوا ہو مگر اس بات کے ثابت کرنے کے
لئے اس قدر دلائل موجود نہیں ہیں جس قدر کہ اس کے خلاف اور نیز یہ کہ جب
ہم تمام حروف کو اس طرح جانتے ہیں تو جامبولین کا کلیہ قاعدہ غلط ثابت ہوتا ہے۔
قدیم مصریوں کے یہاں کل پندرہ حروف تھے مگر چونکہ کل آوازیں اکیس تھیں اس لئے
اُن پندرہ اشکال سے ۲۱ حروف بنائے گئے اور بعض زائد ... بعض آوازیں مخفی
[illegible]

اصلی	
زائد	ا ر آ آئی یو ایف بی پی ک ک ازم یا ج وگر
اصلی	
زائد	ٹ ت {ز - ج} م ن ر س
اصلی	
زائد	س خ خ ح ہ

مذکورہ بالا نقشہ سے معلوم ہو گیا کہ قدیم مصریوں میں سب سے پہلے کس قسم کی الف
بے [illegible] رائج تھی۔ جوں جوں شائستگی بڑھتی گئی اور ملک ترقی کرتا گیا اُسی قدر ان
حروف کو کام میں لانے میں دقت محسوس ہوتی گئی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ

ان حروف کی اصلی صورت شکل تو ضائع اور ایک نئی قطع نکل آئی جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ فراعنہ مصر کے عہد میں ان حروف میں دس حروف اور بڑھائے گئے۔ الغرض یہ حروف رفتہ رفتہ دنیا میں پھیلنے شروع ہوئے اور آج یورپ اور ایشیا اور امریکہ کے بڑے حصہ میں جتنی مختلف الف بے تے رائج ہیں وہ سب انہیں ہیراگلفک شکلوں کی اولاد ہیں جو غالباً اس قدر [illegible] معلوم ہوتی [illegible]
[illegible]
فنیشیا والوں کی اولاد میں سے ہیں اور جن کو ایک گروہ مؤرخین کا کنعانیوں کے نام سے موسوم کرتا ہے جو اس زمانہ میں بحر احمر کے کنارہ پر ملک مصر کے ساحلوں اور ایشیائے کوچک کے بڑے حصہ میں آباد تھے۔ یہ قوم اہل مصر سے تجارت رکھتی تھی۔ اس لئے وہ اور مصری اکثر ایک دوسرے کی تہذیب سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ جب اہل فنیشیا نے دیکھا کہ ان حیوان پرست مصریوں کے پاس ایک ایسا گرانبہا گوہر ہے جسکو تمام آیندہ نسلیں جان سے زیادہ عزیز رکھینگی تو فوراً اس کو لے لیا اور ایسی جلا دی کہ آج وہی گوہر نہ ہو تو سب مہذب قوموں کی تہذیب پھیکی ہو جاوے ان لوگوں نے ہیراٹک (مختصر خط جس کو مذہبی لوگ کام میں لاتے تھے) طرز کے حروف سے اپنی الف ۔ بے ۔ تے لی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بات غلط ہے بلکہ اہل فنیشیا نے خود ہی اپنے حروف ایجاد کیے۔ اور انکو اس معاملہ میں اہل مصر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس گروہ کے لوگوں کا اعتراض ہے کہ کاتب کی طرز تحریر اور خط کا اثر حروف پر بہت پڑتا ہے اس لئے ممکن ہے کہ جن لوگوں نے فنیشیا اور قدیم اہل مصر کے حروف میں مشابہت ثابت کی ہے وہ انکی عمداً کی ہوئی کارروائی کا نتیجہ ہو اور اس وجہ سے غلط ہو۔ مگر جس شخص میں کچھ بھی غور کا مادہ ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ کس قدر کمزور اعتراض ہے۔ ایک دوسرا سب سے بڑا اعتراض

یہ کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی مصری حرف لیا جاوے تو معلوم ہو جاویگا کہ اسکی شکل ایسی چیز کی تصویر سے لی گئی ہے جس کے نام کا پہلا حرف وہی ہوگا مثلاً ہیراگلفک میں " ر " اس طرح سے " ⬭ " لکھی جاتی ہے اور یہ شکل منہہ کی ہے جس کو قدیم مصری زبان میں " رو " کہتے ہیں اور جس کا پہلا حرف " ر " ہے۔ اور یہی بات اکثر فونیشین حروف میں نکلتی ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر فونیشین حروف مصری ہیراگلفک سے اخذ کئے گئے ہیں تو یقیناً دونوں قوموں کے حروف کے ناموں سے یکساں چیزوں کا پتہ چلیگا۔ مگر اس اعتراض کا جواب بھی نہایت آسانی سے دیا جا سکتا ہے۔ فونیشین زبان کا پہلا حرف جسکو عبرانی یا یہودی لوگ " الف " کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اہل فونیشیا کے نزدیک ایک بیل کے سر سے مشابہ تھا اور یہی نام انہوں نے اس حرف کا رکھدیا لیکن فی الحقیقت مصریوں کے یہاں یہی حرف عقاب کی شکل مانا جاتا تھا اور ان کے یہاں بھی یہی نام تھا۔ یہی حالت بے کی ہے۔ اہل فونیشیا کے نزدیک اس حرف کی صورت ایک مکان سے ملتی ہے اور اہل مصر کے نزدیک ایک سارس سے جس اختلاف کی وجہ سے دونوں قوموں میں اگرچہ حرف (ب) کی صورت ایک تھی مگر نام مختلف تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اہل فونیشیا نے حرف کو اور اس کی آواز کو مصریوں سے لیا۔ مگر نام اپنا رکھا۔ اور پھر نام رکھنے میں بھی انکو اس طرح سے آسانی ہوئی کہ چیز کے نام میں جو پہلا حرف تھا اس حرف کو اسی چیز کے نام سے موسوم کیا۔

علاوہ اس کے مرقومہ بالا اعتراضوں کا جواب اور طرح سے بھی دیا جا سکتا ہے۔ اگر اہل فونیشیا نے اپنی الف بے تے خود ایجاد کی تو شروع زمانہ کے حرف کا ضرور کہیں پتہ لگتا لیکن ابتک ایسا نہیں ہوا اور جس قدر فونیشین حروف قدیم زمانہ کے معلوم ہوئے ہیں وہ سب مصری ہیراٹک حروف سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً

حال میں جو نئے کتبے ہیٹ (Hittite) قوم کے جو کہ سام کی اولاد میں سے تھی اور فونیشیا میں رہتی تھی برآمد ہوئے ہیں اور جو یقیناً فونیشین حروف میں ہیں وہ سب ہر ایک قسم کے ہیراگلفک سے ملتے جلتے ہیں۔

قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ ضرور اس معاملہ میں اہل فونیشیا نے اہل مصر سے فائدہ اٹھایا کیونکہ اول الذکر ایک تیز طرار قوم تھی۔ تجارت کی وجہ سے مصر ان لوگوں کے لیے گھر آنگن تھا۔ اس لئے تعجب کی بات کونسی ہے۔ ممکن ہے مصر سے چل کر یہ ہیراگلف الف بے تے بعد کچھ ترمیم اور تبدیلیوں کے فونیشیا پہنچی۔ اہل فونیشیا کو ان حروف میں طرح طرح کی دقتیں محسوس ہوئیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس قدر کثیر التعداد اور غیر معمولی شکلوں کے حروف کا یاد رکھنا بہت مشکل ہے اور چونکہ بعض حروف کے مابین بہت ہی باریک فرق تھا اس لئے تھوڑی سی غلطی میں صورت کچھ سے کچھ ہو جاتی تھی اور اسی وجہ سے ان کی اصلیت زائل ہو جاتی تھی اور پڑھنے میں وہی دقت ہوتی تھی جو آج ناگری میں ہوتی ہے۔ دوسری مصیبت یہ کہ الفاظ اور جملوں کے باہمی نحوی تعلقات کے اظہار میں اور ماضیوں کے جتانے میں بڑی مشکل پیش آتی تھی اگرچہ فاعل و مفعول کو اس طرح سے بتا سکتے ہیں کہ فاعل کو پہلے اور مفعول کو بعد۔ یا بالکل اس کے برعکس لکھیں اسی طرح جمع اور واحد کا بھی اظہار ہو سکتا ہے کہ اگر جمع کا صیغہ منظور ہو تو ایک ہی لفظ کو دو بار لکھ دیں اور اگرچہ اس زمانہ کی نحو ہی کیا تھی۔ لیکن تاہم نحوی وسعت کا خیال کر کے ہیراگلفک میں یہ بہت بڑی کمی تھی۔ ان تمام نقایص کو رفع کرنے میں اہل فونیشیا نے بہت بڑی کوشش کی اور اگرچہ وہ ایک حد تک کامیاب ہوئے۔ لیکن تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک قوم خواہ کتنا ہی چاہے مگر ان کا نظام صوت بدلنے کے لئے ایک مدت چاہیئے کہ جب تک کہ اس قوم کی تہذیب

مربع عبرانی	[illegible]	قدیم عبرانی		قدیم فونیشین	عربی [illegible]	عبرانی نام حروف	نمبر
ח						Cheth ح	۸
ט						Teth ط	۹
י						Yodh ی	۱۰
ך כ						Kaph ک	۱۱
ל						Lamad ل	۱۲
ם מ						Mem م	۱۳
ן נ						Nun ن	۱۴
ס						Samekh س	۱۵
ע						Ayin ع	۱۶
ף פ						Pe پ ف	۱۷
צ						Tsadhe ص	۱۸
ק						Koph ق	۱۹
ר						Resh ر	۲۰
ש						Shin ش	۲۱
ת						Tau ت	۲۲

اس نقشہ کو بغور دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان مرقومہ بالا حروف
تہجا اور عربی فارسی - یونانی اور انگریزی حروف میں کس قدر مشابہت ہے -
فنقیہ یہودیوں سے چل کر اس الف بے تے کی دو بڑی شاخیں ہوئیں -
ایک پھیل تو مشرق کو چلی اور دوسری مغرب کو - اور پھر ایسی صورت بدلی کہ

معلوم ہوتا ہے کہ ایک کو دوسری سے کوئی سروکار نہیں۔ خدا کی قدرت ہے! مشرقی قلم سے مشرقی بہن کی سرگذشت پہلے لکھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اب مصر سے ہم عرب میں آئے۔ اہل عرب نے اس نظام میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔ چونکہ آوازوں کی ساخت پر آب و ہوا کی گرمی اور سردی رطوبت اور خشکی کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے جب عربوں نے بنی اسرائیل سے حروف لئے مگر ان کے یہاں چند حروف ایسے نہ ملے جو چند عربی آوازوں کے مطابق ہوتے اس لئے ایسے حروف عربوں نے جو انہیں پرانے حروف میں سے نکالے اور اپنی ضرورت کو پورا کیا۔ مثلاً اوپر کے نقشہ میں خ۔ غ۔ ض کے لئے کوئی حروف نہیں ہیں اور ت۔ ط کے لئے۔ ص۔ س کے لئے پ۔ ف کے لئے ز۔ ظ۔ ذ کے لئے ایک ایک حرف ہے جس کی وجہ سے عربوں کو بعض اوقات دقت ہوتی تھی اور وُہ اپنی آوازوں کو ٹھیک ٹھیک ادا نہیں کر سکتے تھے۔ خ کو ح پر نُقطہ دیکر اور غ کو ع پر نقطہ دیکر بنایا اور چونکہ ص اور ض ط اور ظ د اور ذ ت اور ث کی آوازوں کے مخارج میں بہت کم فرق ہے اس لئے صرف نقطہ سے کام لیکر اپنا مقصد پُورا کیا۔ پ اور ف دراصل ایک ہیں صرف آب و ہوا کے اثر سے اختلاف ہوجاتا ہے مثلاً بنگالی لوگ ف س نکال سکتے۔ اسی طرح ح اور ہ میں بہت کم فرق ہے۔ آ اور ا کا بھی یہی حال ہے۔ ناظرین کو معلوم ہوگیا کہ عربوں نے اپنے حروف کس طرح سے نکال لئے۔ اِن سے چل کر اب ہم ایران میں آتے ہیں۔ دیکھیں ان لوگوں کی کیا حالت ہے۔ قدیم ایرانیوں میں سب سے پہلا طرز تحریر پہلوی تھا ابتک اس بات کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلا کہ کہاں اور کب اس قسم کے حروف ایجاد ہوئے۔ مگر یہ امر یقینی ہے کہ پہلوی حروف اہل ارم کے حروف سے لئے گئے جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ اس کے ثبوت کے لئے چند دلائل ہیں۔ جن میں سب سے قوی دلیل

یہ ہے کہ مخامنی (achaemenes) شاہِ فارس کے زمانہ میں اسی طرزِ تحریر نہ صرف اہلِ ارم میں رائج تھا بلکہ بعض دیگر اقوام میں بھی پھیلا ہوا تھا جو کہ قرب و جوار کے ملکوں میں رہتے تھے اور اُن اقوام میں سے اہلِ میڈیا بھی تھے جو کہ قدیم ایران کے سب سے پہلے حکمراں ہیں۔ اور جن کا ملک دجلہ اور فرات کے جنوبی ساحلوں سے ملا ہُوا تھا جس کی وجہ سے اُن کے اور اہلِ ارم کے گہرے تعلقات تھے ۔ الغرض اس قسم کی الف بے تے جو کہ قدیم فونیشین سے بہت ملتی جُلتی ہے تمام ایران میں رائج ہو گئی اور مسلمانوں کے آنے سے پہلے تک کم و بیش تبدیلیوں کے ساتھ موجود رہی۔ جب اہلِ اسلام کا تسلط ہوا تو ملک میں عربی حروف نے قدم رکھے اور ایسے جڑ پکڑی کہ آجتک موجود ہیں۔ قصہ کوتاہ ایران سے چل کر یہ حروف جو اصل میں مصری النسل تھے۔ مگر مرُورِ ایام۔ اور مختلف قوموں کی گودوں میں نشو و نما پانے کی وجہ سے کچھ سے کچھ ہو گئے۔ ایران سے چل کر افغانستان ہوتے ہُوئے ہندوستان میں تشریف لائے سب سے اول تو یہاں آکر سنسکرت کا نام پایا اور پھر اس میں بھی مختلف رنگ بدلے۔ جب مسلمان یہاں آئے تو زبان مخلوط ہو گئی مگر حروف وہی رہے جو اب تک چلے جا رہے ہیں اور خدا کرے کہ تا قیامِ قیامت دن دُگنے رات چوگنی ترقی کرتے چلے جاویں۔

حضرات! یہاں تک تو ہم نے مشرقی بہن کی رام کہانی سُنائی لیکن اب ہم صرف تھوڑی سی سمع خراشی کے بعد رخصت ہوتے ہیں اور اس ناموزون اختصار کی معافی چاہتے ہیں۔

مغربی بہن یعنی فونیشین حروف کی دوسری شاخ ایشیائے کوچک کے شمالی سواحل پر ہوتی ہوئی۔ خطۂ یونان میں پہنچی اور وہاں بالکل ہی نرالا ڈھنگ اختیار کیا۔

جس کی نمود ابتک یورپین حروف میں ہے۔ یونان سے چل کر یہ حروف تیز طرار اور زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنے والی قوم یعنی لاطینی لوگوں میں پہنچے۔ یہ لوگ کہاں خاموش بیٹھنے والے تھے تھوڑے سے زمانہ میں اُن کی تصویروں کو دُنیا بھر کے سامنے پیش کر دیا اور ایسا پیش کیا کہ انسان نے ان حروف کو سر آنکھوں پر رکھ کر اپنا حرزِ جان بنایا۔ آج یہی اُنہی سیہ می تصویریں ہیں کہ جس گھر میں نہ ہوں وُہ تاریک ہے۔ اور جو شخص ان کو نہ بنا جانتا ہو وُہ اشرف المخلوقات کے پایہ سے گرا ہوا ہے۔ ہم نے اس شاخ کی بابت بہت کچھ کہا سُنا مگر اس کی تصویر نہ دکھائی۔ لیجئے ملاحظہ کے لئے حاضر ہے:-

قدیم یُونانی حرُوف

α. β. γ. δ. ε, (ε), η).
a b c d e e e

F. ζ. η (h). θ. ι. Κ.
f g h i j k

λ. μ. ν. ο, (ο, ω)
l m n o o

π. q. ς. σ. τ. υ. ξ
p q r s t u x

φ χ ψ
w

قدیم لاطینی حروف

A, B, C, D, E, F, H, I, K, L, M, N, O, P, Q, R, S, T, V, X, Z

a b c d
e f h
j k l m
n o p
q r s
t u v z

عباس حسن شروانی

ایک بدنصیب باوفا

شاید کارٹن کو کبھی خوشی نصیب ہوتی ہو مگر یقیناً وہ مس لیوسی کے مکان پر کبھی شادمان نہیں دیکھا گیا۔ سال بھر میں اس کا گذر لیوسی کے ہاں اکثر ہوتا مگر وُہ ہمیشہ پژمردہ اور پریشان ہی معلوم ہوتا تھا۔ جب کبھی وُہ کچھ بولتا تو اس کی گفتگو بامعنی اور معقول ہوتی تھی۔ لیکن لاپروائی اس کی طبیعت میں کچھ اس طرح سرایت کر گئی تھی۔ اور اس کو اس تاریکی میں لپیٹ لیا تھا کہ اندرونی روشنی کی شعاعیں بھی اس کے لئے بے اثر تھیں۔

اگرچہ وہ لاپروا ہو گیا تھا۔ مگر لیوسی کے محلہ کی گلیوں سے وہ بہت مانوس تھا۔ اور اُن کے بیجان پتھروں کی بھی اس کے دل میں ایک خاص عظمت تھی۔ جب شراب بھی اُس کی افسردگی کو عارضی طور پر دُور کرنے میں کامیاب نہ ہوتی تھی۔ تو وُہ اکثر رات بھر اُن گلیوں میں سرگردان و حیران پھرتا رہتا تھا۔ بارہا علی الصباح اُس کو اکیلا تنِ تنہا ان گلیوں میں چکّر لگاتے دیکھا گیا۔ صدہا مرتبہ آفتاب کی شعاعوں نے اُس کو اس کے پریشان خواب سے جگایا۔ اور اس کے مایوس دل میں اُن اعلیٰ چیزوں کی طرف سے ایک حرکت پیدا کی جن کو وُہ بھلا بیٹھا تھا۔ یا جن کو وُہ اب اپنی دسترسی سے باہر سمجھتا تھا۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے وُہ اپنے گھر سے زیادہ غیر حاضر رہنے لگا اور جب کبھی دو چار منٹ کے واسطے اپنے پلنگ پر وہ لیٹتا بھی تھا تو اُسے چین نہ آتا تھا اور وہ فوراً پھر نکل کھڑا ہوتا تھا۔ نہ اس کے ارادے میں استقلال تھا۔ اور نہ اس کی طبیعت کو قرار۔ اس کی زندگی تلخ تھی۔ اور نہ اسکا کوئی مقصد تھا۔ اب کچھ دنوں سے اس کے دل میں ایک خیال پک رہا تھا۔ اور وُہ

ایک دن ارادہ کر کے لیوسی کے مکان پر پہنچا۔

لیوسی اس وقت تنہا اپنے کام میں مصروف تھی۔ پہلے بھی جب کبھی کارٹن آتا تھا تو اسکی موجودگی میں وہ گھبرائی گھبرائی رہتی تھی۔ چنانچہ اب بھی جب وہ اس کی میز کے پاس آکر بیٹھا تو وہ کچھ پریشان سی ہوئی۔ دو تین معمولی باتوں کے بعد جب اُس نے اس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا تو اُسے کارٹن میں ایک تغیر سا معلوم ہوا اور کہنے لگی۔

"مسٹر کارٹن! مجھے اندیشہ ہے کہ تم اچھے نہیں ہو"۔

"نہیں۔ لیوسی جو زندگی میں بسر کرتا ہوں وہ صحت کے لئے مفید نہیں ہے۔ بھلا مجھ جیسے آوارہ کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے"؟

"مسٹر کارٹن۔ مجھے معاف کرنا۔ کیا ایسی زندگی بسر کرنا افسوسناک نہیں ہے؟

"خدا جانتا ہے کہ یہ زندگی باعث شرم ہے"۔

"تو پھر کیوں اس کی اصلاح نہیں کرتے"!

یہ کہتے ہی لیوسی نے اُس کی طرف دیکھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آخر کچھ ٹھہر کر ایک غمناک لہجہ میں کہنے لگا۔

"لیوسی۔ اب وقت نکل گیا۔ اب میں اِس سے بہتر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ میری حالت اب اور زیادہ خراب ہوگی۔ اور میں ابھی اور زیادہ تباہ ہونگا"!

اُس نے اپنی کہنی میز پر رکھدی۔ اور منہہ ڈھانک لیا۔ خاموشی تھی اور میز ہل رہی تھی۔

لیوسی نے پہلے اس کو اس حالت میں کبھی نہ دیکھا تھا اور اِس لئے بہت متاثر ہوئی کارٹن بھی اس کی حالت سے بے خبر نہ تھا۔ اور بغیر اُس کی طرف منہہ کئے بولا۔

"خدا کے لئے لیوسی! مجھے معاف کرنا۔ میں تم سے کچھ کہنے آیا ہوں۔ کیا تم اُسے سُننا پسند کرو گی"؟

"کیوں نہیں۔ دل و جان سے۔ اگر تمہیں اس سے نفع ہو اور تمہاری آزردگی دُور ہو سکے"۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے اپنا منھ کھولا اور اطمینان سے کہنے لگا۔

"جو کچھ میں تمہیں سُنانا چاہتا ہوں اُسے ذرا دھیان سے سُننا۔ اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ اس قابل نہیں ہے کہ تم اُسے ایک معمولی بات سمجھ کر بھلا دو...... سمجھ لو۔ کہ اِس نوجوان مرگیا میری زندگی کے کامیاب اور اقبالمند ہونے کا وقت گذر گیا"۔

"نہیں کارٹن مجھے یقین ہے کہ تمہاری زندگی کا بہترین حصّہ ابھی باقی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ تم اپنی زندگی کو بہتر اور اعلیٰ زندگی بنا سکتے ہو"۔

"لیوسی۔ یہ تم اپنی نسبت کہو۔ مَیں اپنے آپ کو خوب جانتا ہُوں اور مجھ پر اپنے کمبخت دل کے راز بخوبی روشن ہیں۔ مَیں نہیں بھول سکتا کہ میری حالت کیا ہے"۔

لیوسی کا رنگ زرد ہو گیا۔ اور اس کا بدن کانپنے لگا۔ کارٹن کی طرف سے وہ مایوس ہو گئی اور دلی تاثرات نے اس کے لبوں پر مُہرِ سکوت لگا دی۔

"لیوسی۔ اگر یہ ممکن ہوتا۔ کہ تمہیں بھی اس شخص سے محبت ہوتی جو اس وقت تمہارے سامنے موجود ہے وُہ شخص جو برباد ہو گیا۔ جس کی زندگی تباہ ہو گئی۔ شراب نے جس کا دماغ مختل کر دیا۔ جس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان پر صدہا ستم ڈھائے۔ تو وُہ شخص وجود اُس خوشی کے جو اُسے تمہارے اقرارِ محبت سے ہوتی۔ یہ بھی خوب جانتا ہے کہ وُہ تم پر بھی مصیبت ڈالتا۔ تمہیں بھی رنج و تعب میں مبتلا کرتا۔ تمہاری بھی زندگی خراب کرتا اور تمہیں بھی اپنے ساتھ قعرِ ذلّت میں لیکر ڈوبتا۔ مَیں اچھی طرح جانتا ہُوں کہ تمہیں میرے ساتھ کوئی محبّت نہیں ہو سکتی۔ نہ میں اس کی آرزو رکھتا ہُوں۔ اور شُکر کرتا ہُوں کہ اس کے امکان کا شُبہہ تک بھی میرے دل میں نہیں"۔

"کیا کارٹن۔ اِس کے سوا مَیں تمہیں کسی اَور طرح نہیں بچا سکتی؟ کیا مَیں تمہارے

ساتھ کوئی بھلائی نہیں کر سکتی؟ .... مجھے اُمید ہے کہ تم اس راز کو اپنی ہی ذات تک محدود رکھو گے"۔

"لیوسی میں بھلا کس سے کہونگا۔ میرا درد دل سُننے والا کون ہے؟ ......

لیوسی جو کچھ تم میرے لئے کر سکتی ہو اور جو کچھ میں تم سے چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ تم میری دو چار باتیں سُن لو۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میری آخری آرزو تم ہی ہو۔ اس بُری حالت میں مجھے تمہارا خیال ہمیشہ وُہ پُرانی باتیں یاد دلاتا رہا ہے جنہیں میں بھول گیا تھا جب سے کہ میں تم سے آشنا ہوا ہوں مجھ پر پشیمانی کا عذاب بہت سخت رہا ہے۔ میرے کانوں میں وُہ آوازیں پڑتی رہی ہیں جو میری زندگی کو بہتر بنانے کی تنبیہ کرتی تھیں۔ مجھے اپنی اصلاح کرنے کا خیال کہ آوارگی اور سستی سے کیونکر پیچھا چھڑاؤں اور انسانیت میں کس طرح آؤں دوبارہ کوشش کرنے پر آمادہ کرتا رہا ہے۔ مگر آہ۔ یہ خیال ایک خواب تھا۔ محض ایک خواب تھا جس کا حقیقی وجود کچھ نہیں ہوتا صبح ہو جاتی ہے۔ سونیوالا وہیں پڑا رہتا ہے جہاں ہوتا ہے۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہاری محبت نے میرے دل میں اپنی اصلاح کا خیال پیدا کیا"۔

"تو کیا اب یہ خیال جاتا رہا۔ نہیں کارٹن پھر سوچو اور پھر کوشش کرو"۔

"نہیں لیوسی۔ میں اپنے آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں اپنی کمزوری کو خود محسوس کرتا ہوں۔ اور تمہیں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ تم نے کس قوت سے مجھ راکھ کے ڈھیر میں دوبارہ آگ لگائی۔ مگر افسوس میری بدقسمتی سے نہ اس آگ میں تیزی تھی۔ نہ روشنی۔ اور یہ کسی کام نہ آئی اور یونہی جل بجھی"۔

"چونکہ مسٹر کارٹن تمہاری اس ابتر حالت کا سبب میں ہی معلوم ہوتی ہوں ......"

"لیوسی۔ یہ مت کہو۔ نہیں اگر ممکن ہوتا تو تم مجھے اس تباہی سے بچا لیتیں تم کسی طرح میری اس بُری حالت کا موجب نہیں ہو سکتیں"۔

"چونکہ جو کچھ حالت تم اپنی بیان کرتے ہو وُہ کسی نہ کسی طرح میرے ہی اثر کے سبب سے ہے۔ تو کیا میں اپنا اثر تمہاری بہبودی کے لئے کام میں نہیں لاسکتی؟ کیا مجھ میں کوئی قدرت نہیں کہ تمہارے لئے کچھ کرسکوں"۔

"لیوسی! جو زیادہ سے زیادہ تم میرے ساتھ کرسکتی ہو میں وُہی کرانے کے لئے اس وقت آیا ہوں۔ مجھے تمام عمر یہ بات یاد رہیگی کہ میں نے اپنے دل کا بھید ایک دن تم سے کہہ ڈالا تھا۔ لیوسی۔ اب بھی مجھ میں باوجود دیکہ میں کھویا ہُوا ہُوں۔ ایک بات ایسی ہے جو تمہارے افسوس کا باعث ہوگی۔ اور جو تمہیں مجھ پر رحم کرنے کے لئے اُکسائیگی۔ کیا تم مجھے یقین دلاسکتی ہو۔ کہ میری محبت کا راز صرف تمہارے ہی سادہ اور صاف دل میں جاگزین رہیگا۔ اور کوئی غیر اس سے واقف نہ ہوگا"۔

"ہاں اگر تمہیں اس سے تسلی ہوسکتی ہے"۔

"لیوسی میری محبت کا راز اُس سے بھی نہ کہنا جو تمہیں دُنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہو"۔

"مسٹر کارٹن۔ راز تمہارا ہے نہ کہ میرا۔ اور میں اس کا پُورا لحاظ رکھنے کا وعدہ کرتی ہُوں"۔

کارٹن نے لیوسی کا ہاتھ لیکر اپنے لبوں سے لگا لیا اور دروازے کا رُخ کیا۔

"لیوسی! میں کبھی آج کی باتوں کو آئندہ زبان پر نہ لاؤنگا۔ اور نہ کبھی اشارۃً اس گفتگو کا ذکر کرونگا۔ اگر میں مر بھی جاؤں تو بھی یہ راز اس سے زیادہ مخفی نہ رہ سکیگا۔ اپنی موت کے وقت مجھے یہ بات یاد رہیگی۔ اور میری روحانی تسکین کا باعث ہوگی۔ (اور میرا دل تمہارا احسانمند ہوگا) کہ میں نے آخری مرتبہ اپنے دل کا حال کھول کر تم پر ظاہر کردیا تھا۔ اور یہ کہ میرا نام۔ میری کمزوریاں اور میری مصیبتیں تمہارے دل پر بخوبی روشن ہوگئی تھیں"۔

یہ کہتے وقت اس کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ اور ان الفاظ میں کچھ ایسا درد تھا کہ لیوسی سے نہ رہا گیا اور وُہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

"لیوسی۔ رنج نہ کرو۔ میں ہرگز مستحق نہیں ہُوں کہ تم میرے لئے رنج کرو۔ یہی یہاں سے نکلتے ہی میرے وُہی آوارہ دوست ہونگے۔ میری وُہ ہی بُری عادتیں ہونگی جن کا میں غلام ہوں۔ یہ تمہارے آنسو ہرگز اس قابل نہیں کہ ایسے شخص کے لئے بہائے جائیں جس سے زیادہ بدنصیب شاید اس دُنیا میں کوئی نہ ہو۔ تم تسلی رکھو۔ میرا دل ہمیشہ کے لئے تمہارا ہے۔ اور میری جان بھی تمہاری ہو چکی۔ سب سے آخری التجا جو میں تم سے کرتا ہُوں وُہ یہی ہے کہ تم میرے ان الفاظ کا یقین کرو۔"

"کارٹن میں یقین کرتی ہُوں۔"

میری سب سے آخری التجا یہی ہے کہ تم میرے ان الفاظ کا یقین کرو۔ اس کے بعد تم اُس شخص کی مُلاقاتوں سے امن میں رہوگی۔ جس کو تمہارے ساتھ کوئی موافقت اور مشابہت نہیں ہے اور جس کے اور تمہارے درمیان ایک بعید فاصلہ ہے۔ میں جانتا ہُوں کہ یہ کہنا فضول ہے۔ مگر میرا دل یہ کہنے سے نہیں رُکتا کہ میری جان تمہارے یا تمہارے کسی عزیز کے کام آئیگی۔ اگر خوش قسمتی سے مجھے کوئی موقعہ یا وقت ایسا ملیگا کہ اپنے جوہر سیرت کو ایثار کی صورت میں ظاہر کر سکوں تو اے لیوسی میں تمہارے یا تمہارے کسی عزیز کے لئے اُسے قربان کرونگا۔ لیوسی خوشی کے اوقات میں کبھی کبھی مجھ کمبخت کے یہ سچے اور دل سے نکلے ہُوئے الفاظ یاد کر لیا کرنا۔ وہ وقت آنیوالا ہے اور وہ وقت دور نہیں ہے کہ تمہارے نئے تعلقات ہونگے اور وہ تعلقات ایسے گہرے اور مضبوط ہونگے کہ تمہاری خوشی۔ تمہارا چین اور تمہاری راحت ان پر مبنی ہوگی۔ اس وقت جب تمہاری

شباہت تمہارے ننھے ننھے بچوں کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ اُس وقت تم اپنے دل میں اُس شخص کو بھی یاد رکھنا جو تمہارے لئے اپنی جان قربان کریگا۔ اچھا۔ خدا حافظ"۔

یہ کہا اور وہ فوراً باہر نکل گیا۔

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

اُن بہت سی باتوں میں سے جو انسان کی سمجھ سے بالا ہیں وقت کی رفتار بھی ہے۔ دنیا میں عجیب عجیب تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ نئے نئے انقلابات ظہور پذیر ہوتے ہیں گھڑی بھر میں کچھ سے کچھ ہوجاتا ہے۔ مگر وقت ان سب سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ کوئی حادثہ اسکی رفتار میں کاوٹ پیدا نہیں کرسکتا۔ صبح ہوتی ہے۔ شام ہوجاتی ہے۔ پھر صبح ہوتی ہے۔ پھر شام ہوجاتی ہے۔ ایک باقاعدہ سلسلہ ہے۔ جس کی انتہا شاید اُسی علام الغیوب کو معلوم ہو جس نے انسان کے علم کو محدود کرکے اس سے اس کے عجز کا اقرار کرالیا ہے۔ اور خود بھی صاف کہدیا ہے "وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا" (حضرت انسان! تمہیں بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے)

غرض وقت اپنی عادت کے موافق کارٹن اور لیوسی کی آخری ملاقات کے بعد بھی گذرتا رہا۔ ایک عرصہ ہوچکا۔ کارٹن نے اس کے بعد لیوسی کو اپنی شکل تک نہیں دکھلائی۔ مدت ہوئی لیوسی کی شادی ہوچکی۔ اُس کے بال بچے بھی ہوگئے۔ اور بلاشبہ ان نئے تعلقات میں لیوسی کو کارٹن غریب کا خیال شاید ہی کبھی آتا ہو۔ مگر کارٹن دور سے اِس خاندان پر اپنی اُلفت بھری نظریں ڈالتا رہتا ہے۔ اور لیوسی کی اِس مصروفیت کو حسد کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ کیونکہ اس کا سچا دل اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ کہ وہ خود ہرگز اِس قابل نہ تھا

ڈیوسی اُس کی طرف نظرِ التفات کرتی۔ اس مایوسی میں جو لطف اُسے آتا ہے وہ قریب قریب اس کے دلی اطمینان کے مشابہ ہے۔ وہ نہایت بے صبری سے اُس وقت کا منتظر ہے جب وہ اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کریگا۔

ڈارنے جو لیوسی کا شوہر ہے ایک فرانسیسی ہے۔ اور اتفاق سے یا قسامِ ازل کے علم سے اس کے چہرہ میں کارٹن کی شباہت کا کچھ پتہ لگتا ہے۔ بین فرق زیادہ تر یہی ہے کہ ڈارنے کا چہرہ سُرخ ہے۔ بشاش ہے۔ پُر رونق ہے۔ اُس کے جسم میں چُستی اور اُس کے اعضا میں حرکت ہے۔ مگر مُصیبت زدہ کارٹن زرد رو۔ اُسکا چہرہ افسردہ۔ اُسکی آنکھیں اندر کو گھسی ہوئیں اس کے اعضا ڈھیلے اور اس کا بدن سُست ہے یہ فرق ایک دوسرے کو بالکل جُدا کر دیتا ہے۔

یہ وہ ہی زمانہ ہے جبکہ فرانس میں جمہوری سلطنت کا سنگِ بنیاد رکھا جانے کو ہے۔ تمام ملک میں بدامنی ہے۔ عوام خواص پر غالب ہیں۔ بہت سی قیمتی جانیں ملک کی آزادی پر قربان کی جارہی ہیں۔ شاہی خاندان کی بازاروں میں رسوائی ہو رہی ہے۔ پیرس ایک مقتل بن رہا ہے۔ جابجا بازاروں میں لالٹینوں کے کھمبے سُولی کا کام دے رہے ہیں۔ عوام کی آوازیں کسی شخص کی زندگی یا موت کے لئے قانونی دفعات کا قائمقام ہو رہی ہیں اور آزادی کے شہید گلیوں میں پاؤں کے نیچے روندے جاتے ہیں۔

اسی قیامت کے معرکہ میں ڈارنے بھی عوام کی ناراضگی کا ہدف بنتا ہے۔ ہزاروں آوازیں اس پر موت کا فتویٰ لگاتی ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو اس کی بیگناہی سے واقف ہیں اور لیوسی کے آزردہ دل کو بہلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کو ڈارنے کی رہائی کی اُمید دلاتے ہیں۔ مگر لیوسی بالکل مایوس ہے اور زار وقطار روتے جاتی ہے۔

ڈارنے تن تنہا قید خانہ کی ایک تنگ وتاریک کوٹھری میں بے چینی سے ٹہل رہا ہے۔ اس کو اپنی موت کا پورا پورا یقین ہوگیا ہے۔ اُس کا چہرہ زرد اور بالکل متغیر ہوگیا

ہے۔ بیوی کا خیال اور اُس کی زبون حالت اُسے اور بھی بیقرار کر رہی ہے۔ آخر رات نے اپنا تاریک پردہ اُس کے پریشان خیالات پر بھی ڈالدیا اور ڈارنے فرش خاک پر ایسا بیہوش ہو کر سویا۔ کہ صبح جس وقت اُس کی آنکھ کھُلی سب سے پہلا خیال اس کے دل میں یہی تھا کہ موت ایک لمبی نیند ہے جس سے بیدار ہونا اُس روحانی عالم میں پہنچنا ہے جو ہماری زندگی کا انتہائی مقصد ہے۔ موت ہمارے جسمانی تعلقات کو منقطع کر سکتی ہے مگر ہماری روحانیات میں اُسے کچھ دخل نہیں۔ اس خیال سے اُس کی بہت تسکین ہوئی۔ اور اگرچہ اُس کی موت کا وقت قریب آتا جاتا تھا۔ مگر اس کی طبیعت میں ایک سکون تھا جو ہر ساعت بڑھتا جاتا تھا۔ بیوی اس کو یاد آتی تھی۔ اپنے بچے اس کو یاد آتے تھے۔ اپنے دوست اس کو یاد آتے تھے مگر اس شخص کا اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا جو اُس تک پہنچنے کے لئے صدہا قسم کے جوڑ توڑ کر رہا تھا اور اپنی جان کو اس کے لئے ہتھیلی پر لئے پھرتا تھا۔

گھنٹے بجنے کی آواز اس کے کانوں میں پہنچتی تھی۔ ابھی دس بجے تھے۔ اب گیارہ بجے ہیں۔ اب بارہ بجنے والے ہیں۔ دو گھنٹہ اور باقی ہیں۔ اور ڈارنے ہمیشہ کے لئے اس دنیا کو خیرباد کہنے والا ہے۔ اب اُس کا خوف بالکل جاتا رہا ہے۔ اب وہ موت کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتا ہے اور "اِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ" کی صداقت کا منتظر ہے۔

دفعتہً پاؤں کی آہٹ سُنائی دی۔ دروازہ کا قفل کھُلا اور پھر بند ہو گیا۔ ڈارنے کے سامنے کارٹن کھڑا ہوا ہے۔ اُس کے لبوں پر انگلی رکھی ہوئی ہے اور ڈارنے کو خاموش رہنے کی تنبیہہ کرتی ہے۔ اس کی پیشانی پر مسکراہٹ ہے اور اس کے چہرہ پر غیر معمولی رونق ہے۔ اس کی نگاہ بیقرار ہے اور اس کے رخساروں پر اُس کی دلی نیکی کا ظہور ہے۔ کارٹن اول خاموش رہا اور آخر آہستہ

سے بولا۔

"ساری دنیا کے لوگوں میں سے تمہیں مجھ سے اِس طرح ملنے کا وہم وگمان بھی نہ ہوگا"۔

"بیشک۔ مجھے یقین نہیں آسکتا کہ تم کارٹن ہو۔ مجھے اب بھی شبہ ہے۔ تم بھی کہیں میری ہی طرح مجرم تو نہیں ہو"۔

"نہیں مَیں قیدی نہیں ہوں۔ اتفاق سے اِس جیلخانہ کے محافظین میں سے ایک شخص میرے قابو چڑھ گیا۔ اور اُسی کی بدولت میں یہاں پہنچا ہوں۔ مجھے تمہاری بیوی نے بھیجا ہے۔ اور عزیز ڈارنے مَیں اس کی ایک درخواست لیکر آیا ہُوں"۔

قیدی یہ سُنکر متحیر سا ہوگیا اور گھبراکر پوچھنے لگا "وُہ کیا"۔

کارٹن نے جواب دیا "ایک نہائیت ضروری اور عاجزانہ التجا ہے جو لیوسی نے بنی درد بھری آواز میں کی ہے۔ مگر اتنا وقت نہیں ہے کہ تم مجھ سے پُوچھو کہ مَیں اس درخواست کا لانیوالا کیوں ہوں اور اس کا مطلب کیا ہے اور نہ میں تمہیں بتانا چاہتا ہُوں۔ تمہیں اُسے ماننا پڑیگا۔ اِس کُرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اپنے جوتے اُتارو میرے پہن لو۔ جلدی کرو۔ کچھ مت سوچو"۔

"کارٹن یہاں سے جانبری نہیں ہوسکتی۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ تم پاگل ہو تم بھی میرے ہی ساتھ مرنا چاہتے ہو"۔

اگر مَیں تم سے یہاں سے بھاگنے کو کہوں۔ تب مجھے پاگل بتانا۔ جب مَیں تم سے کہوں کہ اس دروازہ سے باہر نکل جاؤ تب مجھے دیوانہ کہنا۔ اور یہیں رہنا۔ تم میری قمیص پہن لو۔ اور میرا کوٹ اپنے کوٹ سے بدل لو۔ لاؤ مَیں تمہارے بال اپنے بالوں کی طرح موڑ دیتا ہوں"۔

نہائیت تیزی اور حیرت انگیز سُرعت سے کارٹن نے ڈارنے کا سارا لباس

بدل دیا- اور ڈار نے بچوں کی طرح اُس کے ہاتھوں میں تھا۔

"کارٹن - عزیز کارٹن - یہ تمہارا دیوانہ پن ہے - یہ کبھی نہیں ہوسکتا - اس طرح کبھی کامیابی نہیں ہُوئی - ہمیشہ ایسی کوششیں ناکامیاب ہوئی ہیں - خدا کے لئے تم اپنی جان کو میری جان کے ساتھ کیوں خطرہ میں ڈالتے ہو"۔

"عزیز ڈار نے کیا میں تم سے کہتا ہوں - کہ تم اس دروازہ سے باہر چلے جاؤ - جب میں تم سے یہ کہوں تو نہ ماننا - یہاں میز پر کاغذ - قلم - دوات سب موجود ہے کیا تمہارا ہاتھ اس وقت ٹھیک ہے - ذرا جلدی سے لکھو تو - لکھو - جلدی کرو"۔

ڈار نے اپنا پریشان دماغ دوسرے ہاتھ سے سہارے ہُوئے کرسی پر بیٹھ گیا - اور کارٹن اسکے برابر پیچھے کی طرف اپنا ہاتھ سینہ پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

کارٹن "جو کچھ میں کہتا جاؤں - حرف بحرف بالکل وہی لکھنا"۔

ڈار نے - "سرنامہ پر کس کا نام لکھوں"۔

کارٹن "کسی کا نہیں"۔

ڈار نے "تاریخ لکھوں"۔

کارٹن "نہیں - کچھ ضرورت نہیں"۔

ڈار نے ہر ایک سوال پر کارٹن کی طرف سر اُٹھا اُٹھا کر دیکھتا تھا اور سخت حیرت میں تھا - آخر کارٹن نے لکھوانا شروع کیا :-

"اگر تمہیں وہ گفتگو یاد ہوگی - جو مدت ہُوئی ہمارے درمیان ہُوئی تھی - تو تم اس خط کو دیکھتے ہی فوراً سمجھ جاؤ گے - میں جانتا ہُوں کہ تمہیں میرے الفاظ ضرور یاد ہونگے - تمہاری طبیعت ہی ایسی نہیں ہے کہ تم انہیں بھول گئے ہو - خُدا کا شکر ہے کہ اب وُہ وقت آگیا کہ میں انکو سچے ثابت کرتا ہوں - یہ میرا فعل ہرگز قابلِ افسوس نہیں - اور تم اس کا خیال بھی نہ کرنا"۔

یہ الفاظ جونہی کارٹن کے منہ سے نکلے اُس نے اپنا ہاتھ اپنے سینے سے ہٹایا۔ اور ڈارنے کی ناک کے پاس لایا ڈارنے کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ اور وُہ اِدھر اُدھر حواس باختہ دیکھنے لگا۔

"تمہارے ہاتھ میں کیا ہے کوئی ہتھیار ہے"۔

"نہیں کچھ نہیں۔ ڈارنے تمہیں وہم ہے دو چار باتیں اور رہ گئی ہیں۔ قلم اُٹھاؤ اور جلدی سے لکھو"۔

ڈارنے پھر لکھنے لگا۔ "اگر ایسا نہ ہوتا ...."

کارٹن کا ہاتھ پھر اُس کے منہ کے سامنے آیا۔ اُسکی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اسکے اعضا ڈھیلے ہو گئے۔ چند منٹ تک کچھ کشمکش سی کی۔ آخر ڈارنے بیہوش ہو گیا اور کارٹن نے اُسے زمین پر لٹا دیا۔ پھر اُس نے ڈارنے کے کپڑے پہنے اور اُس کے بالوں کو اپنی وضع پر درست کر دیا۔ وُہ کاغذ جو اس سے لکھوایا تھا اس کی جیب میں رکھدیا۔ اور اُسکو ہو بہو اپنی صورت میں تبدیل کر کے باہر والوں کو آواز دی۔ اِس پر تین آدمی اندر آ گئے۔ اور اُن میں سے ایک نے کارٹن سے اشاروں میں کہا "دیکھو کارٹن۔ ثابت قدم رہنا۔ ہماری جانیں تمہارے ہاتھ میں ہیں"۔

اس کے بعد ڈولی اندر لائی گئی۔ اور ڈارنے کو اس میں ڈال کر وہ لوگ اُسے باہر نکال لیگئے۔ دروازہ پھر مقفل کر دیا گیا۔ اور کارٹن اپنے خیالات میں مستغرق ٹہلنے لگا۔ ....

....

ایک گھنٹہ بعد کارٹن پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اور جو خیالات اس کے دل میں اس وقت گذرتے ہونگے وہ قریب قریب یہ ہونگے:۔

"میں دیکھتا ہوں۔ کہ پیرس کا گشت و خون آخر کار ختم ہوگیا۔ ہر شے کی ایک انتہا ہے۔ بعض دفعہ برائیوں میں سے بھی بھلائیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ فرانس کی خود مختار حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ ظلم و ستم انسانی ہمدردی میں منتقل ہوگئے۔ تاریکی روشنی سے بدل گئی۔ اور صدیوں کی کشمکش کے بعد ایک دائمی امن ملک بھر میں قائم ہوگیا۔

"میں دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ جن کے لیے میں اس وقت پھانسی پر لٹکا ہوا ہوں۔ نہایت پُر امن اور اقبالمندانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیوسی کی گود میں ایک بچہ ہے جس کا نام کارٹن ہے۔ . . . .

"میں دیکھتا ہوں کہ میرا نام ان کے دلوں میں اور ان کی اولاد کے دلوں میں جاگزین ہے میں دیکھتا ہوں کہ لیوسی اگرچہ ضعیف ہوگئی ہے مگر ہر سال آج کے دن میرے لئے آنسو بہاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ لیوسی اور ڈارنے ایک دوسرے کی اس قدر وقعت نہیں کرتے جتنی کہ میرے نام کی عظمت اور قدر و منزلت ان کے دلوں میں ہے۔

"یہ میرا فعل اگرچہ سب سے آخری ہے مگر میری زندگی کا بہترین فعل ہے۔ مجھے اس دنیا میں چین نہ ملا نہ سہی۔ مگر اب میں اس عالم کی طرف رجوع کرتا ہوں جہاں میری بیقرار روح کو دائمی راحت اور حقیقی آرام میسر آئیگا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج میری زندگی کا مقصد پورا ہوتا ہے"۔

لطیف احمد

ہائے کیسے دانت تھے موتی سے پیارے گر گئے — جو ہمیں کھانا کھلاتے تھے وہ سارے گر گئے
وہ زباں جو قینچی سی چلتی تھی الکن ہو گئی — ہم کو ہی ڈستی ہے الٹا یہ تو ناگن ہو گئی
پہلے جو چھوٹ گواہی کے لئے تیار تھے — ہونٹ اب ہلتے نہیں کمبخت کیا مکار تھے
کیوں جھکی جاتی ہے گردن یہ کمر کیوں خم ہوئی — دست و بازو میں اپنی طاقت خود بخود کم کیوں ہوئی
ہاے یہ دو ہاتھ ہیں جو قوت بازو رہے — حکم پر جو کار بند جنبش ابرو رہے
لیکن اب افسوس یہ بھی ہلنے جلنے سے گئے — بند ہو کر نبض کی مانند کھلنے سے گئے
پاؤں جو چلتے تھے پہلے اب وہ کاہل ہو گئے — ہائے کہ سب بیکار ہیں ہستی کے ناہل ہو گئے
مختصر یہ ہم سے روٹھے ہیں ہمارے سارے دوست — دیکھیے تو کیسے جھوٹے ہیں ہمارے سارے دوست
ہم انہیں پر ناز کرتے تھے خدا کی شان ہے — چھوڑ بیٹھے ہیں ہمیں جس وقت آدھی جان ہے

کیا کسی پر ہو بھروسہ سب ہے جھوٹی دوستی
دوستی جب ہے یہ اعضا کی تو جھوٹی دوستی

پروانہ و شمع

ایک دن شمع سے یوں کہنے لگا پروانہ — تجھ پہ روشن ہے بہر طور حقیقت میری
اپنی تقدیر میں جل جل کے لکھا ہے مرنا — یوں سدا تجھ پہ تصدق ہے یہی فطرت میری
مجھ سا بیکس کوئی دنیا میں نہ ہوگا اے دوست — کہ نہ مرنے پہ بنائے کوئی تربت میری
حیف صد حیف مری کچھ تجھے پروا ہی نہیں — تو نے جھوٹوں بھی نہ پوچھی کبھی حالت میری
جان دیتا ہوں مگر اُف نہیں کرتا منہ سے — چشم بینا سے ذرا دیکھ تو غیرت میری
مر کے سو بار جیوں تو بھی مروں پھر تجھ پر — غور سے دیکھ تو للہ یہ حسرت میری

فیض میں اہل کرم کے ہے کہاں قید حضور — نور پہنچاتے ہیں کتنی دور تک شمس و قمر

[illegible] نہیں ہوتا ہے چوب خشک کا — گر جوانی میں گرانی ہے طاعت اے پسر

جادہ سے زمزم کے رونق ہے حرم کعبہ کو — کعبۂ دل کے لیے زمزم ہے گویا چشم تر

حسن جو ہر شے میں ہے ہوا ہی کو فنا غم — ننگ کا ہوتا نہیں ہر تیغ جوہر میں اثر

کھولنی مشکل گرہ ہے رشتۂ الفت کی — ناخن تدبیر گھس جائے اگر تو سر بسر

خوف کیا ہے بلبلوں کا [illegible] چشمی کھتے — جو گرہ میں اس کے تھا دیا کو بخت بخطر

دلداروں کی نہیں صحبت مفید بے نوا — بار کا تاکہ کبھی آب گہر سے ہو نہ تر

ہیں حصار عافیت بڑھے جوانوں کے لئے — تیر خدنگ و خود میں نشاں ہو کماں سے چھوٹکر

ارہ کی مانند سے حاصل نہیں ہوتا ہے کچھ — تیز کر کے دانت جو پڑتا ہے مال غیر پر

آتش حرص اہل زر کبھی بجھتی نہیں — چشمۂ خورشید کی ہے آب شبنم پر نظر

قسمت ظالم میں کب لکھی ہے روزی حلال — تیغ میں ہو آب کیا کم خون پیتی ہے مگر

لیکن قسمت ہموار اور آسان ہے نہ راہ عام — آنکھ جھپکی اور پورا ہو گیا دم میں سفر

سرکشی سے نے ہوئی پامال بنکر بوریا — آسمان پر خاکساری سے بگولہ کا ہے سر

مانگتی ہے ہاتھ پھیلا کر قناعت سے صدف — آسماں سے خود بخود آتا ہے رزق اسکا اُتر

آسیا جوع البقر سے ہے ہمیشہ بے قرار — منہ میں آیا رزق کھو دیتی ہے اپنا بے خبر

داد دیگا کون عارف قدرداں ایسا کون ہے
چل کے پڑھنا اب اسے گور غنی پر بیٹھکر

پیرزادہ محمد حسین عارف

زمیں نے نور کے پُتلے دباتے ہیں کیا کیا
کہ سو رہے ہیں لحد میں بتانِ فرخاری

جہاں میں ایک بھی یوسف لقا نہیں ملتا
کدھر گئی وہ حسینوں کی گرم بازاری

نشانہ صید تھا جن کے خدنگِ غمزہ سے
ہوئے شکارِ اجل وہ غزالِ تاتاری

ہُوا نہ دستِ قضا سے کوئی حسین جانبر
کہ آئی دل میں۔ وہ آنکھوں میں تھی جو بیماری

وہ مہ جبین جو بالائے بام سوتے تھے
اب اُن پہ خوابِ اجل زیرِ خاک ہے طاری

فلک نے محوِ تحیر کیا حسینوں کو
کہ زیرِ خاک نہیں شوقِ آئینہ داری

بنا کے نقش فلک نے مٹا دیے لاکھوں
عجب طرح کا ہے کچھ یہ طلسمِ زنگاری

عدم سے مرگ کا سودا چکانے آئے ہیں
سرا میں ٹھہرے ہوئے کچھ جو ہیں یہ بیوپاری

ٹھہرنے دیتی ہے گردش کسے زمانے کی
ہزار قیدِ علائق کی ہو گرانباری

کہاں سے آئے ہیں ہم اور کہاں کو جانا ہے
رہی نہ غفلتِ دنیا میں اتنی خودداری

رہا نہ کچھ زن و فرزند و مال و زر کا خیال
قضا کے آتے ہی نیند ایسی ہو گئی طاری

کرے نہ عمرِ دو روزہ پہ سرکشی۔ کہہ دو
کہ خاک کا ہے یہ پُتلا بشر نہیں ناری

اجل کمیں میں۔ زمانہ عدو۔ فلک دشمن
کرے مقابلہ کس کس کا جانِ بیچاری

زمانہ آنکھ جھپکتے ہی ہو گیا تاریک
وہ شب کا خواب ہوا۔ دن کی تھی جو بیداری

لباسِ عمر اُدھر جسم پر یہ چاک ہوا
بندھا جو سر پہ اِدھر طُرّۂ جہانداری

قضا کے جال میں شاہینِ جاں پھڑکتا ہے
نہیں ہے دامِ علائق کی یہ گرفتاری

گڑھے میں گور کے جاگیردار سوتے ہیں
فلک نے چھین لیا منصبِ زمینداری

کہو کہ دارِ مکافات ہے یہ گھر۔ اس میں
روا کسی کی نہ رکھے کوئی دل آزاری

یہی ہے راہِ فنا جس میں روز و شب غافل
نفس کی آمد و شُد کا ہے قافلہ جاری

یہ کہہ دو شمع سے سونے دے سونے والوں کو
کرے نہ گورِ غریباں پہ گریہ و زاری

سنا ہے قافلے لُٹتے ہیں راہِ ہستی میں
مسافروں کو ہے لازم یہاں خبرداری

یہ مال و زر ہی ہمارا - یہ گھر ہمارا ہے
اسی میں عمر کی پونجی گنوا گئی ساری

بہت غریب لُٹے شاہ راہِ ہستی میں
سُنی اجل نے کسی کی نہ گریہ و زاری

دیا نہ اُن کو کفن پیرِ زالِ دُنیا نے
قبائے زر تھی کبھی جن کے دوش پر بھاری

کفن کو یاد کیا رو کے بزمِ ماتم میں
کسی کو غم میں اگر اشک ہو گئے جاری

قرار اس میں کہاں ساکنانِ عالم کو
کہ گھومتا ہے ہمیشہ یہ چرخِ دوّاری

کہاں وہ مسندِ جم ہے کہاں وہ جامِ نشاط
کہاں ہے قصرِ فریدوں کی اب وہ تیاری

پتہ نہیں ہے کہ رستم کی ہڈیاں ہیں کدھر
رہی نہ سام و نریماں کی کبر و خود داری

کہاں ہے خسرو و بہمن کی بارگاہِ رفیع
کہاں قباد کی ہوشنگ کی جہانداری

اُڑا کے تختِ سلیماں کو لے گئے دم میں
قضا کے جھونکوں میں تھی کتنی تیز رفتاری

لگائے دل نہ کوئی پیرِ زالِ دُنیا سے
کہ اس عجوزہ نے یاروں سے کی ہے عیاری

تمام عمر رہا سامنا قضا کا سرور
گئی نہ وہ جو کلیجے پہ چوٹ تھی بھاری

بچّہ کا دِل

بات یہ کیا ہے بتا پیارے تری کیسی ہے خو
دم میں ہنس پڑتا ہے تو اور دم میں رو دیتا ہے تو

میں کہوں اسکو تلوّن یا ترا سمجھوں کمال
ایک دم میں جمع کر لیتا ہے ان ضدّین کو

کس لئے گریاں ہے کہ تو اپنی ماں کی گود میں
ہم تو سُنتے ہیں کہ جنت کی یہاں آتی ہے بُو

قہقہے کیوں مارتا ہے خالی بستر پہ پڑے
آ گئی ہے کیا خوشی کی چیز تیرے روبرو

واسطے تیرے جہاں کی شادی و آلام کیا
جزر و مد سے اِس ترے ننھے سے دل کو کام کیا

بے سبب بیتابیوں نے شکل دکھلائی تجھے
بے وجہ آئی کہاں سے پھر شکیبائی تجھے
کونسی شے ہے کہ جس کے ایسے پڑتے ہیں اثر
کیسے نقشے کا میں سمجھوں تماشائی تجھے
گدگدا یا کس نے تجھ کو کس نے لیں چٹکیاں
سچ بتا کیوں رو دیا تو کیوں ہنسی آئی تجھے

مَیں سمجھتا ہوں کہ گہرا اِس میں کوئی راز ہے
کیا کسی دلدارِ دل آرا سے ساز و باز ہے

کوئی ایسا تیرا معشوقِ خیالی ہے ضرور
مجھ کو ہو سکتا نہیں ہی جسکی حالت پر عبور
ہو نہیں سکتا کبھی وُہ مال و زر کی قسم سے
یہ جگہ پاتے نہیں انسان و حیوان و طیور
کوئی اچھی شکل ہوگی عالمِ ارواح کی
یا وہی موسیٰ نے دیکھا تھا جسے بالائے طور
وُہ کبھی طرزِ تبسم سے تجھے کرتا ہے شاد
اور چھوتا ہے کبھی دل میں نگاہِ پُر غرور
پیار سے تجھ کو بلاتا ہے کبھی وہ اپنے پاس
اور کہتا ہے کبھی نفرت سے چل ہٹ دُور دُور
بے منائے تجھ سے مل جاتا ہے آکر وُہ کبھی
اور کبھی ناراض ہو جاتا ہے بالکل بے قصور
تمکنت اُس کی بھری ہے تیری چپ میں سر بسر
ہے تری ہر تبسم کا وُہی نورِ ظہور
ہے اُسی پر شادی و غم کا ترے دارومدار
اُس کی خواہش پر ہیں بالکل منحصر تیرے امور

پھیر لی اُس نے نگہ اپنی تو تو رونے لگا
ڈالدیں باہیں گلے میں اور تو ہنسنے لگا

الغرض اس اپنی چھوٹی عمر میں بھی آہ آہ
بن رہا ہے تو اُمید و یاس کا آماج گاہ
شاد ہوتا ہے جو تو پاکر کبھی اُمید کو
یاس کا کھاتا ہے دل پر ایک تیرِ بے پناہ
ناامیدی جب ستا چکتی ہے خوب اچھی طرح
کوئی دیتا ہے بتا گویا خوشی کی پھر سے راہ
کر رہی ہے چھیڑ تیرے ساتھ قدرت آجکل
ہے وہ خیر اندیش اور ہے دوربیں اسکی نگاہ
سخت کرتی جائیگی یوں رفتہ رفتہ وُہ تجھے
تا نہ پائیں شادی و غم دل میں تیرے جلد راہ

ہر خوشی پر اس طرح ہرگز نہ ہنسنے پائے گا

دیکھ لینا پھر کبھی کم تجھ کو رونا آئے گا

ابوالحسن ناطق

باپ کی نصیحت

ایک لڑکا آ کے بولا اپنے ابا جان سے جو کہ ہو اچھی نصیحت کیجئے مجھ سے بیاں
تاکہ میں عامل ہوں اُس پر۔ کہیئے مجھ اپنی زبان سے منکشف ہو آپ کی برکت سے یہ رازِ نہاں
کیونکہ آخر مجھ کو بھی ہونا ہے اک دن نوجواں

باپ کا دل بھر گیا الفت سے۔ بولا آؤ تم میں بتاتا ہوں تمہیں تا تم پہ کھل جائے یہ راز
بات تب ہو اسکو دل سے یاد کر لیجیو تم تا ہو آئندہ تمہیں اچھے بُرے میں امتیاز
اور دنیا میں تمہیں ملتا رہے آرامِ جاں

ایک تو تم فکرِ آئندہ کو دل سے توڑ دو تا نہ اطمینان دل میں آ کے وہ ڈالے خلل
اپنی ساری حاجتوں کو تم خدا پر چھوڑ دو رہنما اس کو بناؤ گو چلو گھٹنوں کے بل
حاجتیں پوری کریگا وہ تمہاری بیگماں

دوسرے تم اپنے آئندہ دنوں کو آج سے اس خداوند خدا کو سونپ دو۔ کیا خوب ہے
راہ پر اس کی چلو تا وہ تمہارا ساتھ دے وعدہ اس کا ساری دنیا کو بہت مرغوب ہے
بات بدلیگی نہ اس کی گو بدل جائے جہاں

تیسری اک بات یہ ہے جو تمہیں درکار ہے دو خدا کو سونپ اپنے جسم اور اسباب کو
وہ محافظ ہے تمہارا اُس کا یہ اقرار ہے وہ تمہیں ہرگز نہ چھوڑے گا اگرچہ کچھ بھی ہو
وہ اتارے گا تمہارے دوش سے بارِ گراں

ہیں تمہارے واسطے باتیں یہی لے ہونہار
خوبیاں جو ان کی ہیں۔ وہ سوچنے کی بات ہے

تم چلو ان پر۔ مگر کس کر بڑھو مردانہ وار
شاکر ان کا نفع۔ جیسے چاندنی کی رات ہے

جس سے ہو آنکھوں میں ٹھنڈک۔ روح میں آجائے جاں

(از انگریزی) پیارے لال شاکر (میرٹھی)

طاعتِ الٰہی

ہر صبح انتظامِ معیشت سے کام ہے
ہر شام اہتمامِ صبوحی و جام ہے

غفلت سے آدمی ہے ہمیشہ عذاب میں
مخمور دن کو رات کو مدہوش خواب میں

محنت نہیں نمازِ الٰہی میں دُکھ نہیں
ایمان ہو تو اس کے سوا اور سکھ نہیں

دولت سے ہے غرض نہ معیشت سے ہے غرض
اس راہ میں وفورِ عقیدت سے ہے غرض

بندے پہ جو گراں نہ یہ بھاری خدا کو ہے
طاعت وہ چیز ہے کہ جو پیاری خدا کو ہے

ہم سے جو ایک لحظہ بھی غافل رہا نہ ہو
کیا اس کی بندگی ہمیں دم بھر روا نہ ہو؟

پڑھتے ہوئے نماز طبیعت اُچاٹ ہو
طاعت کا وقت آئے تو دولت کی چاٹ ہو

شاہین چور ہو کوئی یا ہو بلا کا چور
افسوس اس کی ذات پہ جو ہو خدا کا چور

کس کام کی زبان جو دل سبحہ خوان نہ ہو
بہتر ہے صدقِ قلب جو جھوٹی زباں نہ ہو

بیشک اسے ثواب کمانے کی فکر ہو
جس شخص کو نمازِ الٰہی کی فکر ہو

جس وقت جسم و روح کا جھگڑا تمام ہو
اُس وقت بھی زباں پہ خدا ہی کا نام ہو

کیا کام پھر کہ عرصۂ محشر میں آئیے
لیکن خدا کا نام جو دنیا سے جائیے

بندوں کی بندہ روز خوشامد کیا کرے
افسوس ایک دن بھی نہ یادِ خدا کرے

روشن ہوا یہ داغ جبینِ نیاز سے
دنیا کی تمکنت نہیں بہتر نماز سے

جو خواستگارِ منزلِ صدق و صفا کا ہے
کعبہ بنالے دل میں کہ یہ گھر خدا کا ہے

کھل جائے بابِ عرشِ تقدّس کا ہو ظہور
پردہ اُٹھے دوئی کا تو وحدت دکھائے نور

کعبے میں ڈھونڈھنے کی ضرورت نہ دیر میں
اپنے ہی دل میں ہے وہ۔ نہیں جائے غیر میں

بچ جائیگا وہ جرم و گنہ کی سزا سے صاف
رکھے گا قلب کو جو نماز و دُعا سے صاف

طالبؔ نمازِ حق سے جو آغازِ کار ہو
دنیا بشر کے واسطے دارُالقرار ہو

طالبؔ بنارسی (از بمبئی)

تازہ غزلیں

خان بہادر سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی ایک عرصہ تک مختلف قسم کے آلامِ روحانی میں مبتلا رہے ہیں۔ اِس لئے آپ کا کلام مخزن میں کچھ عرصہ سے شائع نہیں ہو سکا مگر اب امید ہے کہ آئندہ آپ تلافیِ مافات کی طرف توجہ فرمائینگے۔

یقیں یہ ہے کہ مر جانے پہ سارا حوصلہ نکلے
قیامت ہو اگر اے آسماں ہم وہ جدا نکلے

تمنّا اپنے دِل کی قیدِ تنہائی میں کیا نکلے
جو سب احباب زندہ پھر کے ہوں تب حوصلہ نکلے

میں البس کیا ہو جو کہوایا جاتا ہوں وہ کہتا ہوں
دہن میں تب زباں چُپ ہو جو تن سے بولتا نکلے

عدو تک کی بھی خواہی رہی مقصود باطن میں
بظاہر ہو زباں پہ بد دُعا دل سے دُعا نکلے

عجب ٹکسال ہو اے مے پرستو بزمِ ساقی کی
جنہیں ہم رند سمجھے تھے وہ اکثر پارسا نکلے

عدم میں آکے بھی خوف و رجا ہمراہ ہے اپنے
ہنوز آلودہ ہیں دُنیا سے نکلے بھی تو کیا نکلے

فقط واعظ پہ کیا موقوف اے ناصح سب اچھے ہیں
نہ کہوا مجھ سے کیا کہتے کو جاہوں منہ سے کیا نکلے

وہ آنکھیں ہیں پری جن سے کھلے سب حال نیلا — تماشا دیکھنے بیکار اس میلے کا آ نکلے
مزا آزادیوں کا اپنی تھا اپنی ہوائی میں — قفس سے ہم اگر پیری میں بھی نکلے تو کیا نکلے
در و دیوار کی الفت نے بیخود کر دیا ایسا — ترے مہماں بمشکل تجھ سے اے مہماں سرا نکلے
پسینہ آگیا انکو بھی میری آہ سوزاں سے — بھری محفل سے آخر کھول کر بندِ قبا نکلے

پلٹ کر پھر نہ پوچھا شادؔ جیتا ہے کہ مرتا ہے
وفادارو عدم میں جا کے تم بھی بیوفا نکلے

شبِ وعدہ بڑی آشفتہ حالی ہوتی جاتی ہے — وہاں کیا ہے یہاں تو رات کالی ہوتی جاتی ہے
خدا کی شان کیا تقدیر آئی ہے بگڑنے پہ — ہماری بات بھی اب تم کو گالی ہوتی جاتی ہے
کہاں کا کیف اب تو دل کا خوں آنکھوں سے بہ نکلا — صراحی جو بھری رہتی تھی خالی ہوتی جاتی ہے
تلون سے مدد لیکر کیا پیچین شوخی نے — یہ حشری اب بڑی انداز والی ہوتی جاتی ہے
سنبھل رہ رہ کے ملنے سے پسینہ پونچھنے والے — جواہر ریز انگشتِ ہلالی ہوتی جاتی ہے
قدم کو پھونک کر رکھے کوئی کتنا ہی دنیا میں — نہیں رکتی کسی سے ہونیوالی ہوتی جاتی ہے

شرر اُڑنے لگے سوزِ دروں کی لاگ سے شاعر
ہماری آہ بھی پھولوں کی ڈالی ہوتی جاتی ہے

وفورِ اضطرابِ شوق میں دل آج بیکل ہے — قیامت کی تمہارے وعدۂ دیدار میں کل ہے
نہ دیکھا اس کمر کو غور سے نازک خیالوں نے — نظر میں دیکھنے والوں کی اک تنا ہی تو بل ہے
خدا جانے رہے انجام کیا آغازِ الفت کا — جسے آساں سمجھتے تھے وہ مشکل آج اول ہے
نگاہِ عینِ وحدت میں سمائے دوسرا کیونکر — نظر آتے ہیں دو جس کو وہ نقصِ چشمِ احول ہے
جدھر جا پا گیا لیکر وہیں عاشق مزاجوں کو — طبیعت کی دلِ وحشت زدہ کے ہاتھ میں کل ہے
نظر کے ساتھ اُن کی پتلیاں بھی سحر کرتی ہیں — ادھر کاجل میں جادو ہے اُدھر جادو میں کاجل ہے
زمانے سوز الٰہی دیکھ ہے کچھ خانہ بدوشوں کی — دوشالہ زیبِ تن ہے آج کل کاندھو پہ کمل ہے

دیارِ عشق ہو آباد میرے دم سے دنیا میں — جہاں رہتا تھا قیسِ عامری وہ کوئی جنگل ہے

زمیں سے اُٹھ کے شاید رنگ لایا خونِ شہیدوں کا — شفق ہے آسماں پر یا غبارِ خاکِ مقتل ہے

نکالا ہے نیا انداز اُس نے چھپکے رہنے کا — مرے پہلو میں ہے لیکن مری آنکھوں سے اوجھل ہے

نگاہوں میں اشاروں میں نظاروں میں ہزاروں میں — بتانِ بیوفا کے بھی ہر اک انداز میں چھل ہے

رہا کرتا ہوں میں اغیار کی صحبت میں یوں چھپکر — کہ جیسے رنگ صندل میں نہاں خوشبوئے صندل ہے

دفورِ نشہ میں دیکھو بہکنا بادہ خواروں کا — کسی کا سر ہے ساغر پر کسی کے سر پہ بوتل ہے

مری آتشِ جانی کے شرارے بن گئے تارے — حصارِ گنبدِ نیلی مری آہوں کا بادل ہے

اُٹھے فتنے مٹے ارمان ٹوٹے دل بسی حسرت — تری رفتار سے ظالم قیامت کی یہ ہلچل ہے

نکلتا ہے عجب اک حُسن اُن کے منہ چھپانے سے — گھٹا میں چاند آتا ہے نظر یا رُخ پہ آنچل ہے

وہی تم ہو وہی میں ہوں وہی جھگڑے وہی شکوے — جو ٹھہرے منصفی باہم تو پھر قصہ ہی فیصل ہے

کمالِ نظم کا تیرے ضمیم اے واہ کیا کہنا
فنِ شعر و سخن کے کاملوں میں آج اکمل ہے

کیا تھا غیروں کے جو اس کو سرِ محفل دیکھا — دل نے دیکھا مجھے میں نے طرفِ دل دیکھا

تیری اُلفت کے تعلق سے رہائی ہے کسے — ایک عالم کو گرفتارِ سلاسل دیکھا

سر یہاں تن پہ گراں قتل سے وہ ناواقف — ایسا جانباز نہ اس طرح کا قاتل دیکھا

میں نہ پہچان سکا قیس تھا یا اور کوئی — ایک کو خاک اُڑاتے پسِ محمل دیکھا

میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ نزاکت کی نہ لے — زخم ہنستے ہیں تری تیغ پہ قاتل دیکھا

دی ہیں اس عشق نے منہ مانگی مرادیں کیا کیا — ہم نے خالی نہ کبھی کاسۂ سائل دیکھا

حضرتِ دل نے مرے پایا ہے بچوں کا مزاج — جو میسر نہ ہوا اس پہ یہ مائل دیکھا

آدمی قتل بھی ہو جائے لہو بھی نہ بہے — یہ تو اک تیغِ نگہ میں تری قاتل دیکھا

میں ہوں بے صبر کس طرح سے پہچان لیا — نہ جگر آپ نے دیکھا نہ مرا دل دیکھا

عشق نے سارے زمانہ کو ڈبویا اتحاد — کس نے اس بحرِ بلاخیز کا ساحل دیکھا

ضروری اطلاعیں

۱- انتخاب مخزن چھپ کر تیار ہو گیا ہے۔ جسقدر فرمائشیں ہمارے پاس موصول ہو چکی تھیں اُنکی تعمیل کر دی گئی ہے

۲- بعض خریداران میں سے جنہوں نے میعاد مقررہ تک ایک ایک روپیہ بھیجکر انتخاب مخزن بابت حاصل کیا ہے اُن میں سے صرف اُنکی خدمت میں روانہ کیا گیا ہے جنہوں نے محصول ڈاک کے ٹکٹ بھیجے تھے۔ جن صاحبوں کے پاس کتاب نہیں پہنچی وہ ۲؍ کے ٹکٹ بھیجیں یا بیرنگ طلب فرمالیں۔

۳- انتخاب مخزن کی قیمت عوام کے لئے ۱۲؍ مقرر ہے اور مخزن کے خریداروں سے [illegible]

[illegible]

۴- مخزن کی اشاعت میں اب اور بھی پابندی وقت کا خیال رکھا جائیگا۔ موجودہ انتظام کی صورت میں ہم یہ وعدہ کر سکتے ہیں کہ انشاء اللہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک مخزن شائع ہو جایا کریگا۔

۵- جہاں تک ممکن ہے ہم پرچے کی روانگی میں ہر طرح سے احتیاط کرتے ہیں۔ اس پر بھی بعض اصحاب پرچے کے نہ پہنچنے کی شکایت کرتے ہیں۔ آئندہ اگر ناظرین مخزن مفصلہ ذیل امور کا خیال رکھینگے تو ممکن ہے کہ اس قسم کی شکایتیں کم ہو جائیں۔

(۱) ایک آدھ مہینے کے لئے پتہ تبدیل کرنا ہو تو اس مقام کے پوسٹ ماسٹر کو تبدیلی مقام کی اطلاع دینی کافی ہوگی۔

(۲) خط و کتابت کے وقت اپنا نام معہ پتہ مفصل و نمبر رجسٹر تحریر فرمایا کریں۔

— جس مہینے کا رسالہ نہ پہنچے اسی مہینے میں اطلاع کرنی چاہئے۔ ورنہ دو تین ماہ کے بعد اگر کوئی لکھے کہ اتنے مہینوں کے رسالے نہیں پہنچے تو تعمیل نہ ہوگی۔

۶- منی آرڈر بھیجتے وقت پتہ مفصل لکھئے اور مینیجر مخزن کے نام علیحدہ اطلاع کا آنا بھی ضروری ہے +

مینیجر مخزن لاہور

ہتھیلی پہ سرسوں

ہاتھ سے معمولی تیل کی طرح سفید بالوں کو سیاہ کرنیوالا خوشبودار عرق

دنیا میں ہر فرد بشر اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ خدا تعالیٰ نے بوڑھوں کو جوان بنانیکے لئے کیا اعلیٰ خضاب پیدا کیا ہے اگر سچ پوچھیں تو مہندی درحقیقت [illegible] دنیا میں اور کوئی خضاب نہیں کہ مہندی قدرتی رنگ کیطرح سفید بالوں کو سیاہ کر دیتا ہے۔ لیکن اس میں صرف نقص یہ ہے کہ گھنٹوں بیمار کی طرح پٹی باندھ کر بیٹھے رہنے سے بالوں کو سیاہ کرتا ہے۔ سو اس تکلیف کے رفع کرنے کے لئے خدا کے فضل و کرم سے مجھ کو یہ تجویز سوجھی کہ میں مہندی اور وسمہ و دیگر اجزا وغیرہ کا جوہر کشید کر کے عرق کی شکل میں تیار کرنیکی کوشش کروں تاکہ اس میں حدت پیدا ہو اور بال جلد سیاہ کر دے۔ غرض کہ سالہا سال کی محنت بحمد اللہ تعالیٰ کے بعد ایک خاص ترکیب سے بذریعہ مشین مہندی وسمہ کا عرق نکالا ہے۔ کہ واہ سبحان اللہ ادھر لگایا اور ادھر قدرتی رنگ کی طرح چند منٹ میں فی الفور سیاہ۔ اور طرفہ یہ کہ سیاہی ایک ماہ تک بالکل زائل نہیں ہوتی۔ مگر اس عرصہ کے بعد رنگت میں کسی قدر تبدیلی ضرور واقع ہو جاتی ہے لیکن پھر دوبارہ لگانے سے ایک ماہ کے لئے آ جاتا ہے۔ غرضیکہ ایک دفعہ کا عرق منگایا ہوا برس بھر کے لئے کافی ہے۔ یہ عرق بالوں کو ملائم۔ چمکدار اور معطر رکھتا ہے۔ اسکو لگانے سے جلد پر کسی قسم کی سیاہی قائم نہیں رہتی۔ اس خوشبودار عرق کیلئے فضول خضابوں کی طرح برش وغیرہ کی مطلق ضرورت نہیں۔

صاحبان۔ اب اس سے بڑھکر دنیا میں اور کیا خضاب ایجاد ہوگا کہ جسکی آپکو تلاش باقی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اس سے بڑھکر روئے زمین پر کوئی زود اثر اور عمدہ خضاب ایجاد نہیں ہو سکتا قیمت فی شیشی عہ محصولڈاک علاوہ

[illegible]

مخزن

خارستان و گلستان

خارستان

(سلسلے کے لئے مخزن بابت ماہ جون ملاحظہ ہو)

(۲)

تاڑ، برگد، سال، چیڑ اور ببول وغیرہ درختوں کے ایک اصلی اور قدیم جنگل میں سوکھے پتوں پر درندوں کے چلنے کی آواز، بیچ جنگل سے اٹھنے والی آندھی کے شور سے ملکر سمندر کے خروش سے باتیں کر رہی تھی۔ ہر زندہ شے، اس فریاد کا ظلمت میں "تدارک غذا" و گذران زمان کے لئے کبھی شیرانہ جرأت سے کام لیتی تھی اور کبھی ایک بودی جھجک سے کانپ اٹھتی تھی۔

ساحل کے قریب جہاں جنگل ختم ہوتا ہے، ایک تنہا موقع پر ایک چٹان کے کنارے ایک مرد انگیں بے حرکت حالت میں شام کے وقت سمندر پر نظر گاڑے ہوئے ہے۔ چہرہ کی سرخی اس بات کا ثبوت دے رہی ہے کہ رگوں میں پر صحت خون دوڑ رہا ہے۔ کندھوں تک لٹکے ہوئے بال گھنے اور چمکدار ہیں اور بتا رہے ہیں کہ جسم کا نشو و نما جوش پر ہے۔ اس مرد نے انگڑائی لی اور دور سے ایک شیر کی گرج کو مسکرا کے سننا شروع کیا۔

. . . .

. . . .

. . . .

آریاؤں اور ہندوستان کے قدیمی باشندوں سے بھی پہلے ایک قبیلہ ہندوستان سے ہجرت کرکے جزیرۂ لنکا کے جزیرے میں جا بسا تھا۔ اس قبیلہ کی بیتاب طبیعت نے ایک خاندان کو مجبور کیا، کہ جزیرہ سرندیپ سے بھی نقل مکان کرکے، اللہ توکل کسی نئے مقام کی تلاش میں نکل پڑے۔ کچھ لنکا میں زندگی کی ناسوازی کچھ قدیم انسان کی سیماب وار طبیعت غرضکہ یہ سرندیپ میں بھی نہ ٹھہرے، چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر اپنے تئیں بحر ناپیدا کنار کے سپرد کر دیا۔ سمندر کے طوفانوں نے بہت سی کشتیوں کو غرق کر ڈالا، صرف ایک کشتی جس میں رئیس قافلہ کا بیٹا خارا، اور سات آدمی اور تھے، جزیرۃ العرب کے جنوب غرب میں ایک خالی جزیرہ کے کنارے آلگی۔ عورتیں کچھ تو سمندر میں ڈوب چکی تھیں، دو ایک جو بچی تھیں وہ مصائب سفر سے جانبر نہ ہوئیں۔ خارا کی عمر اس وقت چار برس کی تھی۔ ان سات آدمیوں نے جو اس جزیرہ تک پہنچے تھے، اس قسمت کی ضد پر جس نے انہیں اس جزیرے میں لا پھنسایا تھا۔ اور گذشتہ پرلطف زندگی کی یادگار کے طور پر اس بچے کو نہایت چاؤ اور پیار سے پالا۔ کشتی میں جس قدر آلات و اسلحہ تھے، یہ لوگ انہیں لیکر نکلے تھے! اور سب سے پہلا کام جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ خارا کی حفاظت کے لیے زیر زمین غار نما ایک گھر بنایا، اور ایسا انتظام کیا کہ اس میں بھیڑیا، چیتا وغیرہ کوئی درندہ نہ گھس سکے۔ ان سات آدمیوں میں سے ایک آدمی ہر وقت خارا کی حفاظت کے لیے رہتا تھا۔ باقی صید و شکار کو نکل جاتے، شکار کا گوشت، اور بکریوں کا دودھ لاکر، اس بچہ کو پالتے تھے۔ خارا نے پہلی بات جو سیکھی وہ اپنے تئیں درندہ جانوروں سے بچانے کے لیے ان کا مقابلہ کرنا تھا۔ ابھی جزیرہ میں آئے چھ ہی مہینے ہوئے تھے، کہ ایک دن خارا

کے محافظ کو بڑی مسرت کا دن نصیب ہوا یعنی غار کے سامنے سے ایک چڑیا اُڑ کر جا رہی تھی، خارا نے ایک پتھر کھینچ کے مارا، جس سے چڑیا زخمی ہو کر زمین پر آ پڑی + اس واقعہ پر بڑا جنگل میں منگل کیا گیا، اور ان ساتوں آدمیوں نے ملکر اپنے رئیس زادے کی شان میں گانے گائے +

اب خارا، ہر شے کو جس پر اُس کا بس چلتا، توڑتا، پھوڑتا، مارتا، اکھاڑتا تھا کسی چڑیا کا گھونسلا ہاتھ لگ جاتا تو اُسے توڑتا، انڈوں کو پھوڑتا، بچوں کا گلا مروڑتا تھا +

ایک دن (کئی سال کے بعد) خارا نے پہلی دفعہ ایک بارہ سنگھا شکار کیا، ایک بڑا پتھر اس کے سر پہ مارا جس کی ضرب سے بارہ سنگھا گر پڑا، خارا، اُسے کھینچ کھینچ کر غار تک لایا، اور اپنے ساتھیوں کو فخر کی ادا سے دکھایا۔ اُس دن ساتھیوں نے پھر عید منائی اور خوشیاں کیں۔ اس بارہ سنگھے کے سر کو، غار کے منھ پر لٹکایا۔ خارا نے اس کی کھال سے جسے اُس نے خود صاف کیا اور سکھایا تھا، اپنے لئے ایک لباس بنایا + یہاں ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے اور پتھریلی زمین، اونچی چٹانیں، خوفناک گھاٹیاں، اس جزیرے کی اجزائے مرکبہ تھیں۔ جب کبھی آندھی اٹھتی تو جزیرے کے اونچے اور تناور درختوں میں سائیں سائیں کے شور مچاتی + کسی دن آندھی کی شدت سے درخت ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کے، پتھر اُڑ اُڑ کر طغیانی انگیز سمندر میں گرتے تھے، اور جزیرے کے پرندوں کا شور سمندر کے پرندوں کی چیخوں سے ملکر ایک محشر ہیجان پیدا کرتا تھا + اُس وقت اس گوشۂ عافیت یعنی خارا کے غار میں ایک عمیق خوف طاری ہوتا تھا خارا اور اُس کے ساتھی، ایک دوسرے سے ملے ہوئے، نا اُمیدی، نفرین، اور ڈر کے ساتھ، اس وحشی غلغلہ کو سنتے تھے اور کانپتے تھے +

کبھی رات موسلا دھار مینہ پڑتا، اور پانی ریلا کرتا ہوا، اس غار تک آتا، بجلی چمک چمک کے، تڑپ تڑپ کے، بادل گرج گرج کے، اس جزیرے کو گھیر لیتے؛ قدرت کے اس شور وشغب میں، شیر کی ڈکار، ہاتھی کی چنگھاڑ، اور درندوں کی چیخ پکار قیامت برپا کر دیتی تھی۔ کبھی جزیرہ کی ایک طرف کوہ آتش فشاں آگ اُگلتا، اور اپنے چاروں طرف ہر زندہ شے کو جھلسا دیتا تھا +

ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے + یہ سات آدمی تدارکِ معیشت کے لئے صبح نکلتے تھے اور شام کو واپس آتے تھے، مگر اس طرح کہ کانٹوں سے پاؤں زخم کھائے ہوئے، ہاتھ چھدے ہوئے، چہرے چھلے ہوئے۔ غار میں بیٹھ کر اُن زخموں کو دھوتے؛ لیکن اسوقت ان زخموں کو دھونے، اور چہرے اور ہاتھوں کو روغن ملنے کے لئے، عورت کے ہاتھ کی ضرورت محسوس ہوتی تھی + اس ضرورت کو محسوس کر کے ان میں کا ایک بڈھا آدمی، غار کے سامنے کے ایک پتھر پر بیٹھ جاتا اور سفید لٹوں کو ہلا ہلا کے، اور زخمی سینہ کو کھول کے، سمندر کی پُرعناد اور ظالم موجوں کی طرف گھونسا تانتا اور قسمت پر لعنت بھیجتا۔

خارا اس آفتاب کے تلے، اس کٹیلی پتھریلی زمین پر، ان درندے حیوانوں میں پلا تھا، اس کے ہاتھ سینکڑوں مرتبہ جھل چکے تھے، سینہ پر ہزاروں مرتبہ کھرچیں لگی تھیں؛ چہرہ تمتما کے تانبا ہو گیا تھا۔

غرضکہ ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے؛ کبھی اُس کے خون کا جوش اُسے آدھی رات کو خواب سے بیدار کر کے باہر لیجاتا، اور ایک سائر فی المنام شاعر کی طرح جو فضائے نامتناہی کی سیر کر رہا ہو، خارا بھی ایک چٹان پر بیٹھ کر خیالات میں غرق ہو جاتا! یہ ظاہر ہے کہ خیالات اس جزیرے اور خارا کی کل زندگی کی مناسبت سے پُرحدت ہوتے تھے، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ کبھی کبھی؛ نرم و نازک خیالات ایک سفید چھوٹی چڑیا کی طرح اس کے دماغ کے

سامنے منڈلاتے نظر آتے تھے! اور کبھی اس کی سیاہ آنکھوں کے سامنے اس طرح مجسّم ہوتے تھے جیسے ہوا چل رہی ہو اور درختوں کا متحرک سایہ کانپ رہا ہو۔

خارا کی عمر اس وقت بیس برس کی تھی۔ حسیات کا ہجوم تھا، اور اکثر رات وہ کسی پہاڑی پر درختوں میں گذارتا +

ایک شام کو غار میں آیا اور بستر پر جا پڑا۔ تین دن تک بخار میں بیہوش پڑا رہا + اس بخار کی حالت میں اس کی پیاس بجھانے کے لئے اور سوکھے ہونٹوں کو تر کرنے کے لئے، اس کے ساتھی اُسے جگا کر پانی دینا چاہتے تھے مگر وہ نہیں جاگتا تھا + اس وقت وہ بڈھا اپنے سوکھے ہاتھوں کو جس میں رگیں اُبھری ہوئی نظر آتی تھیں اُٹھا اُٹھا کے کہتا "آہ! ایک عورت! ایک عورت" اور پھر خارا کی تیمارداری کرتا + آخر خارا نے آنکھیں کھولیں اور اسکی حالت بہتر ہونی شروع ہوئی، تاہم نقاہت باقی تھی۔ ایک شام، یہ سب اسی خارا کے بستر کے گرد بیٹھے ہوئے تھے، کہ بڈھے نے ایک پرانا راگ جسے وہ بھول نہیں گیا تھا، گنگنانا شروع کیا:-

"جینا تو ایک نیند ہے پیارے، پریم ہے اُس کا سپنا"

خارا نے پوچھا:

"جینا کیا چیز ہے؟"

بڈھے نے جواب دیا "پریم"

"پریم کیا ہے؟"

"عورت"

اس طرح خارا سوال اور بڈھا توضیح کرتا تھا۔ غرضکہ نوجوان کو معلوم ہوا کہ زندگی میں کانٹے اور پتھر ہی نہیں ہیں، بلکہ پھول اور خوشبوئیں بھی ہیں، چیرنا، پھاڑنا ہی نہیں، بلکہ ملنا اور گلے لگانا بھی ہے +

اس کے بعد یہ نوجوان اپنے ہمراہیوں سے اکثر علیحدہ رہتا، اور اکثر سوچا کرتا۔ دن میں جسے اکثر کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ کسی تنہا جگہ پر نکل جاتا۔ اور وہاں ایک مرمر کے ٹکڑے کو لیکر، بڈھے کی بیان کی ہوئی تصویر کے موافق ایک مورت بنانا شروع کرتا، جس کی پوری شکل اس کے خیالخانہ دماغ میں بھری ہوتی تھی - پہلے سر بنایا، پھر سینہ تراشا، پھر ہاتھ نکالے۔ اس جزیرے کی چٹانوں میں، اور سمندر کے کنارے، زمرد، الماس، لعل، یاقوت وغیرہ چمکدار اور رنگین پتھروں کی بہت کثرت تھی۔ خارا نے، انہیں جمع کر کے، اس مورت کی آنکھ سفید اور سیاہ الماس سے، دانت موتی سے ہونٹ لعل و یاقوت سے بنائے ایک برس کامل اس شغل میں بڑی حرص اور بڑے شوق سے مشغول رہا۔ ایک دن ہمراہیوں نے آکر اسے دیکھا اور بہت تعجب کیا، لیکن بڈھا ہنسا اور کہنے لگا: "اچھی ہے مگر حقیقت سے بہت دور ہے" تاہم خارا کے لئے یہ مورت ایک بدیعہ خیال تھی۔ اس نوجوان نے اپنے حیات کی تمام قوت اس مرمر میں صرف کی تھی۔ صبح سے شام تک نظر اس مورت پر گاڑے رہتا اور اس درجہ مستغرق ہوتا کہ ہمراہی کھانے کے وقت آکر اسے جبرًا وہاں سے لیجاتے، اور اس وقت بھی خارا مورت کی طرف ہاتھ بڑھاتا اور پُر شوق نظریں اس پر ڈالتا۔

اس طرح مہینے گذر گئے۔ خارا، پتھر اور سیپیں جمع کرتا تھا، اور اپنے خواب، اور خیالوں کی تصویریں ان پتھروں سے بنانا چاہتا تھا - لیکن اسے خوف ہوتا تو صرف اس بات کا کہ بڈھے کے اعتراض اور استہزا سے یہ تصویریں بچینگی یا نہیں - کبھی ایک مورت بناتا وہ ٹھیک نہ ہوتی، اسے توڑ دیتا، دوسری شروع کرتا۔ کبھی دوڑا دوڑا، بڈھے کے پاس آتا اور اس سے سوال کرتا: "پھر بتا، عورت کیا ہوتی ہے - کیسی ہوتی ہے" بڈھا دور بادلوں پر اپنی نظر گاڑ کر، اس کے سوال کا جواب دیتا، اور کہتا "عورت! عورت آدھا میوہ آدھا پھول ہے" پھر چپ ہو جاتا اور رونے لگتا - خارا گھنٹوں اس بڈھے کی آنکھوں پر

سوال کی نظر ڈالے ہوئے، اس کی باتوں کو سنتا تھا اور سمجھنے کی کوشش کرتا تھا + بڈھا اٹھ کر
غار کے باہر بیکے، جنگل میں ایک طرف جاتا، اور کسی نارٹک کے پیچھے دو چرانے، اپنی گردن، ایک
دوسرے سے ملائے کھڑے ہوتے انہیں دکھاتا اور کہتا: "دیکھتے ہو، سمجھتے ہو؟ بس"+
خارا کچھ نہ سمجھتا۔ اور پھر سوال آمیز نظروں سے بڈھے کے چہرے کو دیکھتا۔ خارا
نے کئی مورتیں تراشیں، جس میں وہ بغیر استاد کے، محض اپنی طبیعت کے زور سے ماہر ہو گیا
بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اس نے خود ہی یہ فن ایجاد کیا + اس کی حاصل عمر یہ مورتیں تھیں اور وہ
ان سے بےحد محبت کرتا تھا، محبت ہی نہیں پرستش کرتا تھا + یہ مقام گویا اس کا معبد تھا+
مبارزۂ حیات سے تھک کر یہاں آتا، اور گھنٹوں مبہوت نظروں سے ان مورتوں کو
دیکھا کرتا، اور سوچا کرتا کاش یہ مورتیں سمندر پار کی حقیقت سے خبردار کریں، اور بتائیں کہ
اس پر طوفان سمندر کے اس طرف، ان مورتوں جیسی زندہ مخلوق ہے کہ نہیں + کبھی اپنے
خیالات کے تخیل کرنے سے عاجز ہو جاتا، تو غصہ میں آ کے، ایک سباعانہ وحشت سے
کسی مورت کو توڑ ڈالتا پھر رنج کرتا اور نکل کھڑا ہوتا، اور جو جانور ملتا، اسے بعنوان
انتقام مار ڈالتا +

....

رات کا وقت تھا، گھنے درختوں میں، خارا چیتے کی کھال بچھائے بیٹھا تھا کہ اتنے
میں پاؤں کی خفیف آہٹ سنائی دی، تھوڑی دیر میں آہٹ زیادہ واضح ہوئی۔
اس نے سر پھرایا تو دیکھا کہ ایک بارہ سنگھا آرہا ہے، اتنے میں ایک لومڑی نکلی +
بارہ سنگھے نے اپنے سینگوں پر لومڑی کو اٹھا کے پھینکدیا + یہ بارہ سنگھے کی شوخی،
وکلیل تھی + لیکن یہ شوخی وکلیل بہت دیر تک نہ رہی کیونکہ ایک تیندوا بارہ سنگھے پر
لپکا، بارہ سنگھے نے اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنا شروع کیا + خارا، نہایت
شوق سے یہ گیرودار اور بھاگ دوڑ کو دیکھ رہا تھا + بارہ سنگھا اپنی تمام قوت سے

دوڑ رہا تھا، یہاں تک کہ تھک کر اس کی رفتار میں سستی معلوم ہوئی؛ پسینہ میں شرابور ہوگیا اور ہانپنے لگا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود اسے اپنی جان کی سلامتی کی امید نہ رہی تھی + پندرہ منٹ کے اندر تیندوا بارہ سنگھے تک پہنچ گیا اور اسے دبوچ لیا + مارا، تعجب کر رہا تھا کہ بارہ سنگھا بہت جلد مغلوب ہوگیا؛ اور اس کا دل چاہتا تھا کہ بارہ سنگھے کو کسی طرح مرد پہنچائے کہ اتنے میں ایک گرج سنائی دی اور ایک بڑا سایہ جھپٹتا نظر آیا: سر پھرایا تو کیا دیکھتا ہے کہ یکہ تاز میدان شجاعت، بادشاہ بیابانِ وحشت یعنی شیر چلا آرہا ہے +

شیر نے تیندوے اور بارہ سنگھے پر ایک پُر غیض و غضب نظر ڈالی، اور پھر ایک پُر ہول ڈکار کے ساتھ پھلانگ مارتا نظر آیا۔ تیندوا، پہلے تو باوجود اپنی تھکن اور ضعف کے، ہر چہ باداباد آمادہ مقاومت معلوم ہوتا تھا، لیکن شیر کے زہرہ پر گرج نے جو اس نے اپنی تمام قوت سے کی تھی، تیندوے کے حواس باختہ کر دیئے، اور وہ مجبوب اور منفعل کانپتا ہوا، اپنا شکار اور اپنی نخوت شیر کے لئے چھوڑ گیا + تھوڑی دیر تو تیندوے نے آثارِ غصہ ظاہر کیئے تھے اور اس کی طرف گھور کے دیکھا تھا۔ لیکن شیر کی آتش بار آنکھوں سے کون آنکھیں ملا سکتا تھا + اِن آنکھوں کا دوچار ہونا تھا، اور گرج کا نکلنا تھا کہ تیندوے نے ہار مان لی۔ شیر نے، بارہ سنگھے کے جسم پر اپنے پنجے گاڑ کر اُسے ٹکڑے کرنا شروع کئے + مارا، جو اس سے پہلے بارہ سنگھے اور تیندوے کی کشمکش بے پروائی اور بغیر خوف کے دیکھ رہا تھا، اب ذرا سنبھل بیٹھا + اُس کے دل میں خوف اب بھی نہ تھا۔ لیکن ذرا احتیاط سے بیٹھا ہوا تھا۔

اب شیر لپ لپ کر کے خون پی رہا ہے، ہڈیوں کو چبا رہا ہے + اور جھوم رہا ہے + غلبہ اور کامیابی کے نشہ میں، اپنی دُم دائیں اور بائیں مار رہا ہے + اور اس پُر لطف ضیافت کو کھاتے وقت، مزے میں آکر کبھی اپنا سر اُٹھا کے اوپر کو دیکھتا ہے

ایک دفعہ اس نے اپنی دُم اُٹھا کے، اور اپنے اگلے پاؤں، بارہ سنگھے کے مُردہ جسم سے ہٹا کے نظر تفتیش سے اِدھر اُدھر دیکھا، اور پھر اُس کے سر اور اُن ہڈیوں کو جن پر ابھی گوشت باقی تھا، چبانے کے لئے وہاں سے گھسیٹ کر لیجانا شروع کیا + اتنے میں شیر کی نظر خارا پر پڑی، اور اس زرد خونخوار طاقتور مخلوق کی آنکھیں اس جزیرے کے جوان اِنسان سے دوچار ہوئیں + آدھ گھنٹہ پہلے خارا اس اِعتشام مجسم جنی شیر کو، اس کی ہیبت اور طاقت سے متاثر ہو کر دیکھ رہا تھا اور اس غالب مغرور کی دل میں عزت کر رہا تھا۔ لیکن اس وقت جبکہ شیر اُس کے سامنے تھا اس وقت ایک قدرتی جوش مقابلہ سے وہ اس کی طرف بڑھا + شیر بھی جاتے جاتے رُک گیا، وہ شاخوں اور پتوں کو اپنے پاؤں کے نیچے دباتا توڑتا، اور کھڑ بڑ کرتا ہوا خارا کی طرف چلا + غرضکہ لڑائی کی ٹھن گئی، اور خارا نے شیر کے بائیں طرف سے اس پر حملہ کرنے کی ٹھہرالی +

شیر نے سر اُٹھا کر پھر اسے دیکھا، اور اس پر کودنے والا ہی تھا کہ خارا نے ایک سیکنڈ رائگاں نہ کر کے، کمان کو پوری طاقت سے کھینچ تیر چھوڑا + تیر ایک ہوا چاک سرسراہٹ سے اُس کی طرف گیا اور گردن میں گھُس گیا + اس کے ساتھ ہی خارا نے اپنی ڈھال سنبھال کے، اور ایک ہولناک "ہاو" کا نعرہ مار کے بائیں طرف پھرتی سے پھر کر، اپنا گرز شیر کی گدی میں (جو چھلانگ مار کر اس پر جا گیا تھا) مارا۔ پھرتی اور طاقت خارا کے جسم میں بچپن سے ایسے مشاغل میں رہنے کی وجہ سے ہم جیسے آدمیوں کی نہ تھی + پس اُس نے اِدھر اپنی تمام قوتِ بازو سے گرز مارا اور اُدھر اپنی کمر سے برچھی نکال کے اب مارے غصہ کے دیوانہ شیر کے پیٹ میں پوری کھبو دی + اس دفعہ، اس درندہ جانور نے پیچ کھا کے، خارا کے بائیں بازو کو پکڑنا چاہا؛ لیکن اُس کے مُنہ میں خارا کی ڈھال جو وہ بائیں ہاتھ میں

لئے ہوئے تھا آگئی، اور شیر نے شدتِ غضب اور درد میں اُسی کو چبانا شروع کیا۔ لیکن اس عرصہ میں بیحد خون شیر کے جسم سے نکل چکا تھا، اور اُس پر ضعف طاری ہونا شروع ہو گیا تھا + خارا نے ایک دفعہ پھر پہلے کی طرح نعرہ مار کے، اور پہلی جیسی قوت سے برچھی کو گھسا دیا۔ آخرکار، شیر اپنی غرورِ جنسی کے باوجود، زمین پر آ رہا + لیکن نوجوان نے اس گرنے کو، اور اس مغلوبیت کو حیلہ تصور کیا، اور برچھیوں پر برچھیوں کے وار کرتا رہا +

مگر اب شیر کی زرد بے نور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، پنجے پھیلے تھے، منہ بغیر نفس کے کشادہ تھا، جس میں سے اُس کے بڑے دانت باہر نکلے ہوئے تھے، جو خون سے سُرخ ہو رہے تھے + یہ وہی شیر تھا، جس کی مہیب آواز اندھیری راتوں میں ہر جاندار کو کنپا رہی تھی، وہی شیر اب اُس کے پاؤں کے تلے مسکین حالت میں پڑا ہوا تھا + یہ خیال خارا کے دل میں گذرا، تو اُس کا سینہ ایک شیریں غرورِ جلادت سے اُبھرا، اور وہ ایک خود کام نمائش کے ساتھ، اپنی تیر و کمان، ڈھال، برچھی، اور گرز کو ایک جگہ رکھ کے نہایت فخر کی ادا سے شیر پر بیٹھ گیا، اور متحمل اور متفکر نظروں سے مشرق میں آہستہ آہستہ اُبھرتے ہوئے نور پاش ماہتاب کو دیکھنے لگا +

رات کی سیاہ پلکیں کھلنے کے بعد صبح کا رنگین نور آسمان میں اِدھر اُدھر سنہری تیر پھینک رہا تھا + رفتہ رفتہ یہ تیر تیز اور پُرحدت ہونے شروع ہوئے + اور نوجوان کی آنکھیں صبح کے وقت، اور موقع اور گذشتہ واقعہ کی یاد سے پُرنور، اور اس کا دل دُور سے دکھائی دینے والے سمندر کے شور کو سُن سُن کر ذوقِ حیات سے متلذذ ہو رہا تھا + اِتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ نہایت پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ، رنگوں میں لپٹی ہوئی ایک شے صبح کے ایک مجسم ٹکڑے کی طرح، ہوا میں تیرتی ہوئی، خارا سے کچھ دُور زمین پر آ رہی + تھوڑی دیر میں، وہاں پہلے تو مشکوک اور مبہم اور پھر عیاں اور واضح ایک

شکل لطیف پیدا ہوئی +

خارا کا رفیق بڈھا، جب کبھی نہایت تھک جاتا، یا کسی اضطراب میں ہوتا، یا اور کسی تکلیف سے بیتاب ہوکر "عورت ... عورت، عورت" کہہ کے آہیں بھرا کرتا تھا اور خارا پوچھتا تو بیان کرتا کہ وہ کیا شے ہے + غرضکہ یہ نازک شے اُس بڈھے کی بیان کی ہوئی چیز سے بہت ملتی تھی + اور اُس مورت سے (جسے اُس نے بڈھے کی تعریف کے مطابق پتھر سے تراش کے بنائی تھی) بہت مشابہ تھی + اس کو دیکھ کر نوجوان کا دل ایک عجیب پُرشوق رقت سے کانپنے لگا + اور اُسنے اُس کی طرف اپنے ہاتھ بڑھا دیئے + اور سوچنے لگا کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟ اُس کا دل چاہتا تھا کہ دوڑ کے اُس سے جا ملے، اُسے پکڑلے + لیکن اُس بسے شیر کی طرح لڑائی نہیں لڑنا چاہتا تھا؛ بلکہ یہ چاہتا تھا کہ یہ شکار جو اس قدر رنگوں میں، اس قدر محبت آمیز احتشام، اور ایسی نرماہٹ کے ساتھ زمین پر آیا ہے اس شکار کو آہستہ آہستہ جا کے نہایت ہلکے سے چھو لے، اور اُسے خوف نہ دلائے بلکہ پھسلا پھسلا کے، چمکار چمکار کے پکڑلے + سوچا کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ اور یہ سوچ کے سب آلاتِ حرب ایک طرف رکھ دیئے، اور دبے پاؤں اُس کی طرف چلنا شروع کیا + دو قدم نہ رکھے ہونگے، کہ جیسے نسیم کسی چھوٹے پودے کو ہلاتی ہے، یہ خیال دلفریب بھی جنبش کھا کے بادلوں کی طرف ہٹنا اور خارا سے دُور ہونے لگا + اور ایک منٹ کے بعد، زمین پر چٹان کے کناروں اور پتھر کے روڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا +

عمر میں یہ پہلی دفعہ تھی کہ خارا، ویا + غار کو نہایت رنجیدہ حالت میں واپس آیا اور اپنے ساتھیوں کو ساری سرگذشت سُنائی + ساتھیوں میں سے بعضے کہنے لگے "یہ خیال تھا" اور بعضوں نے کہا: نہیں، تم نے خواب دیکھا ہے" +   باقی آئندہ

مکتوباتِ آزاد

(۴)

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

عالی جناب من تسلیم۔ جو کچھ عنایت فرمائی۔ اس کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔ مگر انسدادِ تحریر کا سبب جب تک ذہن نشین نہ ہوگا۔ ایک پھانس سینہ میں کھٹکتی رہیگی۔ کام کی کثرت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ جو ہوا۔ خیر الحال انشاءاللہ کبھی موقع ہی سے یہ عقدہ حل ہوگا۔ آپ نے غضب کیا۔ وُہ کٹا پھٹا میرا اعلان مع اصل ہی بھیجدیا۔

عورتوں کا تذکرہ جو آپ فرماتے ہیں۔ ایسی کتاب اب تک میری نظر سے نہیں گذری نہ مجھے ایشیائی مصنفوں سے اُمید ہے کہ کسی نے لکھی ہو۔ بھوپال سے بھی ایک صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ ان مضامین کا کچھ سرمایہ مجھے دو۔ مگر وہ فقط شاعرہ عورتوں کے باب میں لکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس وقت میں نے مجملاً اتے پتے لکھ بھیجے۔ اب جو میں خیال کرتا ہوں تو البتہ یہ ممکن ہے۔ کہ اُن عورتوں کے ناموں کو بہ تکلف پھیلایا جائے۔ کہ جن سے کئی کئی شعر تذکروں میں مذکور ہیں۔ لیکن اصل مقصود آپ کا یہ ہے کہ ایسی عورتوں کے حالات ہوں۔ جو صاحبِ علم ہوں۔ یا علم کے ساتھ صاحبِ تصنیف ہوں۔ یہ بات نہایت مشکل معلوم ہوتی ہے۔ فقط ایک گلبدن بیگم ہمایوں کی بہن تھی۔ کہ اُس نے ہمایوں نامہ لکھا تھا۔ وُہ نسخہ بھی اب میرے پاس نہیں۔ دلّی میں بڑی کوشش سے بہم پہنچایا تھا۔ اس کے پہلے ورق پر چند عورتوں کے حال اور بھی کسی نے لکھدیے تھے۔ وُہ بھی شاعرانہ طور سے اور شاعری کے سلسلہ میں تھے۔

سلیمہ سلطان بیگم ہمایوں کی پھپھی زاد بہن تھی۔ وہ نہایت عالی فہم۔ ذکی الطبع۔ خوش تقریر۔ صاحبِ تدبیر۔ لطیفہ گو۔ بذلہ سنج تھی۔ اور اکثر شاہ اور شاہزادوں میں جو معاملات اُلجھا کرتے تھے وُہ سُلجھایا کرتی تھی۔ لیکن اُس سے جہاں دیکھا۔ ایک ہی شعر لکھا دیکھا۔ مخفی تخلص کرتی تھی۔

اور کتاب کا بھی شوق رکھتی تھی +

زیب النسا کا حال سب جانتے ہیں۔ خیر چند ہی بہاں اور سہی مگر انہیں صاحب علم اور صاحب تصنیف کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ میرا اور آپ کا جی چاہتا ہے۔ پھر بھی خیال رکھونگا۔ اور جو سرمایہ بہم پہنچے گا۔ اُس سے آپ کو مطلع کرونگا +

آزاد
۲۹ ستمبر ۱۹۰۳ء

ہاں وہ شعر سلیم سلطان بیگم کا جی یاد آگیا۔ آپ کے بھی خیال میں رہے۔

کاکلت را من بمستی رشتۂ جاں گفتہ ام مست بودم زیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

جناب من۔ دام مجدکم العالی۔ تسلیم۔ میں تو پہلے ہی ادائے شکریہ میں قاصر تھا۔ اب تو شکریہ مجذور ہو گیا۔ اس پہ حسن قبول تو سبحان اللہ۔ وہ نعمت ہے کہ اس کا صلہ آپکے جد کی بارگاہ سے عطا ہو۔

آب حیات کے باب میں جو کچھ فرمایا ہے۔ فقط قدر افزائی ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ آپ کے عنایت نامے اور آپ کے بھائی صاحب کے مرحمت نامے۔ کئے مضامین تقریباً متحد تھے۔ اس لیے دو دو جگہ لکھنا فضول سمجھ کر اُن کے لئے کہتا ہوں اور آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں۔ آپ ملاحظہ فرما کر ادھر بھیجد یجئے گا۔ جو کچھ حال سنا میں نے صاف صاف لکھدیا ہے +

آزاد لاہور

۱۵۔ اکتوبر ۱۹۰۳ء

جناب من۔ تسلیم۔ گھوڑے کے باب میں جو عنایت فرمائی۔ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں نے سب طرف کو خط لکھدیئے ہیں۔ اسی ضمن میں آپ کو بھی تکلیف دی تھی معاف فرمائیگا۔ غلطی مجھ سے ہوئی کہ پسند پر منحصر رکھا۔ ورنہ للہ کا معاملہ تھا۔ ریل میں ڈالدیتا وہاں پہنچ جاتا۔ بے شک میں سزا کا مستوجب تھا ؎

سزا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانیکے تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا

سائیس کپورتھلہ کا رہنے والا تھا + وہاں بھی تحریر دوڑا دی ہے۔ خیر یہ جھگڑے تو

یُوں ہی چلے جاتے ہیں - اگر قسمت کا ہے تو انشاء اللہ آجائیگا -

سرمد اگر ش وفاست خود می آید　　گر آمدنش رواست خود می آید
بیہودہ چرا درپئے او می گردی　　بنشیں اگر او خداست خود می آید

میرا حال یہ ہے کہ آج کل اس قدر مصروف ہوں کہ اس سے زیادہ ہو نہیں سکتا میں آپے سے باہر ہوگیا ہوں - اور ضعف نے نکما کر دیا ۱۲

. . . .

آزاد - ۱۶ - جنوری ۱۸۸۴ء

حالی جناب من تسلیم - عظّم اللہ اجورنا بمصائبنا سے من در چہ خیالم و فلک در چہ خیال - کاریکہ خدا کند فلک را چہ مجال - ہائے افسوس[1] - صد ہزار افسوس - آسمان ٹوٹ پڑا - زمین تہ و بالا ہوگئی - خدا جانے کیا ہوا اور کیونکر مر گئے - اچھا - اب کیا ہو سکتا ہے یا اللہ - یا ارحم الراحمین - رحم کر بحق محمد و آل محمد - اوّل اُن کے لئے رحمت و مغفرت کی دُعا کرنی چاہئے - بعد اس کے یہ سوچنا چاہئے - کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے - گورنمنٹ کو سب اہل عمل ایک میموریل لکھیں - کہ آپ جس طرح کل ممالک ہندوستان کے مالک ہیں اسی طرح اس قطعہ مختصر کے بھی مالک ہیں - آپ پر یہ واضح ہے - کہ مرحوم جنت مکانی نے اس ریاست کا انتظام کیا کر رکھا تھا - اور کن کن اصُول پر کر رکھا تھا - اور یہ بھی واضح ہو کہ وُہ کیسا تھا - پس ایک کل یا ایک گھڑی جبکہ اپنے پرزوں کے ساتھ چل رہی ہے تو کچھ ضرورت نہیں ہے - کہ اس میں تغیر و تبدل کیا جائے - اس لئے واجب ہو کہ اس انتظام کی حفاظت کرے -

(۲) گورنمنٹ کو یہ بھی معلوم ہو کہ اس انتظام کے کیسے کیسے مخالف پہلو میں موجود ہیں اس سے بھی اس انتظام کو بچائیے کہ خلل انداز نہ ہوں -

[1] سر سالار جنگ کے انتقال پر یہ کلمات لکھے گئے ہیں ۱۲

(۳) سرکارِ عالی کی ناتجربہ کاری اور عدم واقفیت کا حال ظاہر ہے۔ جس طرح اُس مرحوم مغفور نے انہیں اپنی حفاظت تربیت میں رکھا تھا کچھ عرصہ تک اسی طرح گورنمنٹ رکھے اور صاحب رزیڈنٹ اسی طرح نگران حال رہیں۔

(۴) بہت سے دلی اضمیر اور تجویزیں اُن کی تھیں کہ ظاہر نہ تھیں۔ یا ابھی ارادے میں تھیں۔ وُہ اُن کے خاص خاص ماتحتوں کے سینوں میں مخزون ہیں۔ ان لوگوں کو صاحب رزیڈنٹ اپنے ہاتھ پاؤں سمجھیں۔ اور انکی صلاح سے کام کریں۔

مَیں نے اسی وقت بخار میں یہ حال دیکھا ہے۔ عقل ٹھکانے نہیں۔ حواس پریشان ہیں۔ ہاتھ لکھنے کے قابل نہیں۔ مگر لکھے بغیر رہ بھی نہ سکا۔ اِس لئے چند حروف نامربوط لکھ کر لفافہ میں بھر دیئے ہیں۔ آگے سوا افسوس کے کیا لکھوں۔ جی چاہتا ہے کہ خود حاضرِ خدمت ہوں اور دل کی بھڑاس نکالوں۔ مگر پھر کہتا ہوں کہ حاصل کیا۔ اِس لئے وقت پر منحصر رکھا۔ اگر قسمت ملک یاور ہوئی۔ تو عجب نہیں کہ مولوی سید حسین صاحب کو اس وقت میں گورنمنٹ بہت عزیز سمجھے۔ کیونکہ زیادہ تر یہی اُن کی تدبیروں اور تجویزوں اور ارادوں کا خزانہ تھے۔ جو کچھ انکو معلوم ہے۔ شاید کسی کو معلوم ہو۔ ان میں بڑا وصف یہ ہے۔ کہ سولائزڈ ہیں اور گورنمنٹ کے مقاصد کو اغراضِ ملک کے ساتھ ترکیب دیکر اس طرح کام کر سکتے ہیں کہ دونو نقصان یا ہرج سے محفوظ رہیں اور ایک دوسرے کے فواید اور منافع اور آسائش و آرام سے متمتع ہوں۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔

آزاد

از لاہور - ۱۱ - فروری ۱۳ء

عالی جناب مرزا دام اللہ اجلالکم - تسلیم - احمق کا قاعدہ ہے کہ اپنی تعریف سُن کر خوش ہوتا ہے - میرا یہ حمق حد سے بہت گذر گیا ہے - کہ تعریف سُنکر غصہ آتا ہے - بات یہ ہے کہ

آپ میری تصنیف کے باب میں کچھ نہ کہا کریں - کیا کہوں فرصت تو ہے نہیں - اور دل یہ چاہتا ہے کہ آپ کے ایک ایک فقرہ کے جواب میں ایک ایک کتاب لکھوں -

اخلاق جلالی کو میرے ایک شاگرد نے سوالوں میں ترتیب دیا ہے - انشاءاللہ جلد بھیجتا ہوں - آپ ہمیں بھول جائیے - ہم تو آپ کو نہیں بھول سکتے - اس کی انگریزی نہ دیکھا کیجیے - وقت ضائع ہوگا - یہ سوالات انشاءاللہ امتحان کے لئے بہت مفید ہونگے۔

سفر کا سلسلہ نہیں ملتا - انشاءاللہ سفرنامہ مرتب ہوگا تو دیکھئے گا -

گرامی کو میں خوب جانتا ہوں - یونیورسٹی پنجاب میں بھی پڑھا ہوا ہے - وہاں سے نکل کر بھی کئی سال تک مجھ سے ملتا رہا - ۱۲ - برس تک مسلسل مشتاق ہے - اور جس رنگ میں وہ لکھتا ہے - اس میں آج اول درجہ کا شاعر ہے - اس کی طبیعت خیال مند ہے - جلال اسیر - قاسم مشہدی - ظہوری وغیرہ ہند میں اسی طرز میں کہتے تھے - افسوس کہ سخندان فارس مشتہر نہیں ہوا - جو میرے اس مختصر فقرہ کا مفصل مزا آجاتا . . . . .

میں نے سخندان فارس کو نظر ثانی کر کے رکھدیا ہے - چاہا کہ اب دربار اکبری کو سنبھالوں مگر مروت اور حمیت نے اجازت نہ دی - کیونکہ استاد مرحوم شیخ ابراہیم ذوق کی بہت سی غزلیں اور قصیدے بے ترتیب پڑے ہیں - اور میں خوب جانتا ہوں کہ انکا ترتیب دینے والا میرے سوا دنیا میں کوئی نہیں ہے اگر میں انکے باب میں بے پروائی کرونگا تو یہ انکی محنت کا نتیجہ جو دریا میں سے قطرہ رہگیا ہے - بے موت مرجائیگا - اور اس سے زیادہ افسوس کا مقام کیا ہوگا - انکے حال پر افسوس نہیں - یہ میری غیرت اور حمیت پر افسوس ہے - چنانچہ اس لئے اب اسے سنبھالا ہے - اور اس میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جس جس قصیدہ یا غزل یا شعر کے موقع پر کوئی تقریب - کوئی معاملہ - یا معرکہ خاص پیش آیا تھا - وہ بھی نقل کروں - کیونکہ میں ہر وقت کا حاضر باش تھا - اور والد مرحوم اور وہ عالم طفولیت میں ساتھ رہے - آپ اس کے لطف کو تصور فرمائیے آج تک کسی شاعر کا دیوان ایسا مرتب نہ ہوا ہوگا - خدا انجام کو پہنچا دے ॥

آزاد - ۲۰ - نومبر ۱۸۹۰ء

آخری تاجدارِ لکھنؤ

(۳)

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

نظربندی قلعہ ولیم | اب انہیں پریشانیوں اور خط و کتابت میں ایک برس گذرا۔ یکایک خبر اڑی کہ بلوائی کچھ جمع ہونے لگے۔ انگریزی فوج برگشتہ ہوگئی۔ کچھ کارتوسوں پہ قصہ ہوا۔ بادشاہ ان روزوں علیل اور تپ شدید میں مبتلا تھے۔ چنانچہ ایک مقام پہ خود فرماتے ہیں ؎

"وہ صفراوی تپ مجھ کو تھی الاماں سلگتی تھی تالو کے اندر زباں"

غرض جلد شفا پائی۔ نذر و نیاز کی تیاریاں اور خوشیاں ہونے لگیں۔ ایک شب کو جلسہ تھا۔ دھوم دھام مچی تھی۔ ثلث شب جا چکی تھی سلطان عالم کچھ خواب میں تھے کچھ بیدار تھے کہ ناگہاں کانوں میں غل کی آواز آئی کہ "ہے ہے غضب ہوگیا ستم ہوگیا"۔ بادشاہ آواز سنکر چونک پڑے۔ خبر ہوئی کہ ویڈر منٹن صاحب لاٹ صاحب بہادر کے سکتر تشریف لائے ہیں۔ خیر طلب کیے گئے۔ انہوں نے کہا کہ گورنر جنرل بہادر کا حکم ہے کہ آپ میرے ساتھ اسی گھڑی سوار ہوں کیونکہ کچھ شبہات آپ کی طرف سے پیدا ہو گئے ہیں۔ بادشاہ نے فرمایا کہ میں نے کوئی خطا نہیں کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے اسی قدر معلوم ہے کہ اعدا آپ کو بھی اس مفسدہ میں شریک کرتے ہیں۔ بادشاہ نے فرمایا کہ "یہ محض بہتان و فتوا ہے"۔ مگر کوئی عذر سنا نہ گیا۔ دلائل سے کام نہ نکلا۔ سکتر صاحب نے کہا کہ آٹھ آدمیوں سے زیادہ آپ کے ساتھ جانے کا حکم نہیں۔ غرض سواری آئی۔ بادشاہ سکتر صاحب اور برادر السلطان نواب ذوالفقار الدولہ بہادر گاڑی میں سوار ہوئے۔ مجاہد الدولہ اور دیانت الدولہ پیچھے بیٹھ لیے اور قلعہ ولیم میں آ سلاس وقت بادشاہ

کولانڈ کیننگ نے اس مضمون کا محبت نامہ لکھا" مجھے نہایت افسوس ہے کہ اس بلوہ کے متعلق مفسدین آپ کا نام بھی لیتے ہیں چنانچہ کونسل کی یہ تجویز ہے کہ آپ چندے تبدیل مقام فرمائیں۔ جب فتنہ فرو ہو جائے۔ اسوقت شہر میں تشریف لائیں۔ آپ سزاوارِ زندان نہ تھے مگر حالت اشتباہ پیدا ہوگئی ہے۔ آپ کے اعزاز و احترام میں کسی قسم کا فرق نہ آئیگا۔ اور نہ میں اس امر کا خواہاں ہوں کہ آپ کو کسی امر کی تکلیف ہو۔ آپ کے لئے ہر قسم کا سامانِ راحت وہاں مہیا رہیگا"۔ بادشاہ نے جواباً تحریر فرمایا کہ مفسدین میں میرا کون شمول ہونے لگا اگر میرا فرزند یا بھائی بھی ہو تو اس حالت میں میں کبھی اس کا ساتھ نہ دوں۔ میں ان امورِ فتنہ سے ہرگز آگاہ نہیں۔ بالکل بہتان ہے۔

جب بادشاہ قلعہ میں آٹھ روز قیام فرما چکے تو یہ تجویز ہوئی کہ قلعہ کے بیچ میں جو کوٹھی ہے وہاں تشریف رکھیں۔ اور اسباب سلطانِ عالم وہاں سے منتقل کئے گئے۔ اسوقت زن و مرد سب ملاکر حضرت کے ساتھ ۴۳ آدمی تھے وہ سب اسی کوٹھی میں طلب کر لئے گئے۔ نواب فتح الدولہ برق بھی ہمراہ رکاب تھے۔ مگر ضعیف ہو گئے تھے۔ حالتِ چراغِ سحری تھی۔ بادشاہ نے فرمایا بھی کہ آپ سے بارِ ضعیفی نہ اٹھ سکیگا۔ میں بخوشی کہتا ہوں آپ چلے جائیں۔ مگر انہوں نے کہا کہ مجھ سے ستر ہزار فرقِ انور پر فدا ہوں۔ جب تک جسم میں جان ہے خانہ زاد ہرگز قدم نہ چھوڑیگا۔ آخر حالتِ تپ میں ۲۸ صفر ۱۲۷۴ھ کو انہوں نے رحلت کی۔ بادشاہ کو صدمہ عظیم ہوا کیونکہ وہ استاد تھے اور فنِ شعر انہیں سے حاصل کیا تھا۔

دیانت الدولہ بھی ہمراہیوں میں تھے۔ جب ان کا دل گھبرا گیا تو انہوں نے قصدِ عتاب کیا مگر کونسل نے اجازت نہ دی آخر بادشاہ نے برداشتہ خاطر ہو کر انہیں خود رخصت کیا۔ مہتمم الدولہ اچھے خاصے تھے مگر دیوانے بن گئے۔ بیفائدہ مارپیٹ شروع کر دی۔ مجبوری سے بادشاہ نے انکو بھی کہا کہ آپ بھی تشریف لیجائیے۔ کربلائی خانم آب خاصہ بردار بلا کی تند خو تھی۔ بقولِ بادشاہ۔ ع "وہ بدجس طرح زہر ہو مار میں"۔

ہر شخص سے بیواسطہ لڑا کرتی تھی۔ خود سلطان عالم کے ساتھ گستاخیاں اور بدزبانیاں کرتی تھی اور حضرت شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتے تھے چنانچہ ایک نامہ میں ذکر فرماتے ہیں۔ ع

"یہاں تک ستایا۔ نکالا اُسے

بلا تھی بلا۔ میں نے ٹالا اُسے"

حکیم طبیب اللہ والا بھی ساتھ تھے۔ مگر دو ہی دن میں اُن کا عجب حال ہو گیا۔ آخر گھبرا کر بیس س کی رفاقت ترک کر دی۔ محمد شبیر خاں گولہ انداز بھی بہت شریر تھا۔ ہر وقت لڑائی پر تلا رہتا تھا۔ ایک دن باقر حسین سے قیل و قال ہوئی۔ پھر تو یہ بالکل شیر ہو گیا۔ دانتوں سے باقر کی ناک کاٹ ڈالی۔ قید خانہ میں ہائے وائے کا غل مچا۔ شبیر خاں نکالا گیا اور دوسری جگہ قید کیا گیا۔ جب رہا ہوا تو بادشاہ نے اُسے موقوف کر دیا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ بادشاہ نے برادر السلطان نواب ذوالفقار الدولہ بہادر اپنے بھوپھا کو کچھ لکھ کر رکھنے کو دیا تھا اور کہہ دیا کہ اسے حفاظت سے رکھیئے گا۔ اس میں کچھ خانگی باتیں تھیں۔ لکھنؤ کے کسی ملازم کے نام خط تھا کہ زر و مال میرے حکم سے صرف ہو۔ نواب صاحب نے نادانی یہ کی کہ باقر کو دیدیا اور کہا کہ اسے بہت احتیاط سے رکھنا۔ باقر نے ایک دوسرے شخص کو دیا پہرے والوں نے کہیں دیکھ لیا۔ پھر تو غضب ہو گیا۔ باقر فوراً قید کر لیا گیا۔ گمان پیدا ہوا اور پیدا ہونا بیجا بھی ہے کہ یہ خفیہ مضمون کیوں لکھا گیا مگر اس خط میں کوئی بات نہ تھی۔ غرض باقر بھی نکالا گیا اور اب قید خانہ میں زیادہ قدغن ہوا۔ بادشاہ عجب عجب پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ کپڑوں میں جوئیں پڑ گئی تھیں۔ داڑھی بڑھ گئی تھی اور عجب حالت تھی۔ ملکہ سیمتن کو قید خانے سے جو نامہ لکھا ہے اس میں اپنی بیکسی یوں اظہار فرمائی ہے۔ ع

"کوئی آنکھ ہم سے ملاتا نہیں   یہ رجا نور تک بھی آتا نہیں"

مگر اتنا تھا کہ قید خانہ میں لندن کے خط برابر آیا کرتے تھے۔ زندان ہی میں تھے کہ یکایک خبر آئی کہ جناب عالیہ ملکہ کشور تاج آرا بیگم صاحبہ والدہ شاہ نے انتقال فرمایا۔ پھر خط آیا کہ

سکندر حشمت بہادر بھائی نے بھی قضا کی۔ اس کے بعد نویں شعبان کو خبر ملی کہ نواب رفعت آرا بیگم صاحبہ بھتیجی نے بھی رحلت کی۔ اِس غمِ جانکاہ نے رہے سہے ہوش اُور بھی کھو دیئے گویا کمر توڑ دی۔ سلطان العالم خدا کا شکر کر کے خاموش ہو رہے۔ جنابعالیہ کی عمرہ ہ برس کی تھی۔ بھائی کا شباب کا عالم تھا۔ بھتیجی بھی کم سن تھیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد قید خانہ میں یہ بھی خبر آئی کہ اختر محل سے ایک شہزادہ پیدا ہوا ہے مگر صدمات اس قدر غالب تھے کہ اس خوشی کا مطلق اثر نہ ہوا۔

اِس زمانہ میں بادشاہ صاحب فراش اور اُٹھنے بیٹھنے سے مجبور تھے چنانچہ وائسرائے کو تحریر فرماتے ہیں :-

"دریں عرصہ چندروز نوبت بہ استخوان رسید واز شدتِ رنج و صدمات و فرطِ مرض صاحب فراش گردیدہ از نشست و برخاست عاری است"۔ ۵

"چہ احتیاج بہ پیشِ تو حالِ دل گفتن کہ حالِ خستہ دلاں را تو خوب میدانی"

قید خانہ سے خط | سات مہینے کی کڑیاں جھیل کے بادشاہ نے زندانِ مصیبت سے وائسرائے کو پھر تحریر فرمایا:-

"اِس عرصہ میں جو صدمات قلب کو اس وجہ سے ہوئے کہ آپ کے دل میں میری طرف سے شبہات پیدا ہو گئے اور مفسدوں نے اپنے ساتھ مجھے بھی شریک کر لیا ہے وہ بیان سے باہر ہیں اور یہی سبب ہے کہ بیماری روز بروز ترقی کرتی جاتی ہے۔ میں ہمیشہ عارضہ خفقان اور مراق میں مبتلا رہا ہوں مگر اقتضائے فرمانبرداری یہ ہے کہ جب تک آپ پر میری بیقصوری ثابت نہ ہو۔ میں اس وقت تک رہائی کا نام نہ لوں۔ مگر شدتِ مرض۔ خفقان ضعف اور صدمات

سے مجھے یقین ہے کہ میں زندہ نہ بچوں گا۔ اس وقت میرے دل میں یہ حسرت رہ جائیگی کہ میں نے اپنی بے گناہی خود اپنی آنکھوں سے کیوں نہ دیکھی۔ میں اس صورت میں چاہتا ہوں کہ عیال و اطفال سے مل کر اور گھر جاکر علاج کروں۔ آپ کو اختیار باقی ہے۔ آپ تحقیق فرمائیں تا دم مرگ کوئی قصور اور خطا ثابت نہ ہوگی۔ میں یہاں علاج کر سکتا تھا مگر عارضۂ مراق اور خفقان کا علاج اس فصل گرما میں یہاں نہیں ہو سکتا۔ ؎

مشکل ز تو نیست تو آسان ‌ ‌ ‌ ‌ آسان ز تغافل تو مشکل

پھر ایک پرچہ پیام میں اپنا دردِ دل یوں بیان فرماتے ہیں۔

دو مہینے سے اشتہا ساقط ہے اور عارضۂ تپ میں مبتلا ہوں۔ خون بھی آتا ہے اور ضعف کی یہ حالت ہے کہ چند قدم چلنا ناگوار ہے خصوصاً جب سے کہ خبرِ انتقال جناب عالیہ والدۂ ماجدہ اور برادر عزیز مرزا سکندر حشمت بہادر سنی ہے اضطرابِ قلب و اضمحلال دونا ہو گیا ہے۔ زمانۂ مصائب کی طوالت سے دل بیتاب رہتا ہے۔ اور صرف آپ کے الطاف اور انصاف کی توقع پر زندہ ہوں۔ ؎

ہر کس وسیلہ دارد و ما بے وسیلہ ایم ‌ ‌ ‌ ‌ ما را وسیلہ نیست بجز ذاتِ خاص تو

متمنی ہوں کہ مجھے اذن ہو تو اہل و عیال کے ساتھ سکونت اختیار کروں بچوں کی گفتگو سے اپنا دل بہلاؤں اور مغفورین کے مراسم اُخروی بجا لاؤں جو میری عدم موجودگی کے سبب ابھی تک ملتوی ہیں۔ میں مخلص بے ریا ہر جگہ اور ہر حالت میں آشنائے یکرنگ اور خیر اندیش صادق ہوں۔ دوسرے یہ کہ ولیعہد بہادر تنہا ہیں اسوجہ سے اور بھی مشوش اور متردد رہتا ہوں لہٰذا چاہتا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو میں اسکو طلب کر لوں۔

غرض جب خدا کرکے مقدمہ کا جوہ فرو ہوا تو ۲۶ مہینے ۲۷ دن کی مصیبتوں کے بعد سلطان العالم نے قیدِ فرنگ سے نجات پائی۔

حیدر علی سجاد۔ ہوگلی عظیم آبادی

حُسن اور جذبِ حُسن

گر عیب اگر از دیدنت در اضطراب افتم
کہ من پروانہ ام اے شمع خودداری نمے دانم

جن کیفیات اور جن حقائق یا واقعات میں کشش یا جذب ہو۔ انہیں جن الفاظ میں ادا کیا جائے یا جو نام انہیں دیا جاتا ہے۔ ان میں بھی ایک کشش اور ایک جذب ہوتا ہے۔ ان الفاظ کے اطلاق یا ایراد سے دل و دماغ پر اثر پڑتا ہے اور وہ کیفیت جو آنکھوں اور دل میں سما جاتی ہے جس کی وہ تشریح ہوتے ہیں جو مثل وجود کشش کا مسلم ثابت ہے۔ اس طرح لفظی کشش یا لفظی تصنع میں بھی مسلم ہے۔ ساری زبانوں میں ایسے چند الفاظ پائے جاتے ہیں جن کے معانی یا مفاہیم میں ایک قسم کی خاص کشش یا جذب ہے۔ ایسے الفاظ کے منہ سے نکلتے ہی دلوں پر ایک قسم کی زد پڑتی اور کشش اپنا زور دکھاتی ہے۔ جیسے رویت سے اثر ہوتا ہے۔ ایسے ہی سماعت سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ بمصداق ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد

بعض الفاظ میں بمقابلہ بعض الفاظ کے زیادہ کشش ہے۔ اور بعض میں کم۔ کسی لفظ کا جیسا معنوی ظرف ہوگا۔ اس کے مطابق اس میں کشش بھی ہوگی۔ حسن یا خوبصورتی بھی ایک ایسا لفظ ہے۔ کہ اس کے اطلاق سے ہی دلوں پر ایک زد پڑتی یا ایک چوٹ لگتی ہے۔ صرف ایک خوبصورت شے کے دیکھنے سے ہی انسان متاثر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا نام بھی سنکر متاثر ہو جاتا ہے۔ مراد جاتے جب دوسرا شخص کہہ بیٹھتا ہے :-

"کیسا خوبصورت۔ کیسا حسین۔ کیسا پاکیزہ۔ کیسا نفیس ہے"۔

تو سننے والا چونکتا اور ہوشیار ہوکر سنتا اور حیران ہوکر دیکھتا ہے۔ دل متوجہ ہو جاتا ہے

اور دل میں ایک جنبش تو ہوتی ہے۔ اگر ایک خالی مکان کے دروازہ پر صرف (لفظ حسن) موٹے قلم سے لکھ کر لگا دیا جائے۔ تو سینکڑوں آدمی دلوں پر ہاتھ رکھے گذرینگے گو بعض اشخاص اپنی دھن میں ہی گذریں۔ مگر اُن کا دل شہادت دیگا۔ کہ وہ اس کی زد میں آسانی سے آچکا ہے۔ کون اچھی چیز نہیں دیکھتا اور کس کا دل نہیں پسیجتا۔ سب زندہ دل اس مرض میں گرفتار اور مبتلا ہیں۔ ہاں ابتلا کا طریقہ جداگانہ ہے۔ کوئی سفلی نگاہوں سے متاثر ہوتا ہے۔ اور کوئی علوی نگاہوں سے۔ کوئی عوارض پر مفتون ہے۔ اور کوئی حقائق پر۔ کوئی ضبط نہیں کر سکتا۔ اور کوئی دل ہی میں پی جاتا ہے۔ کوئی دل سے بخار نکال دیتا ہے۔ اور کوئی دل ہی دل میں ہائے وہو کرتا ہے۔ کوئی جلد رنگ بدل لیتا ہے اور کوئی دلوانہ اس لے میں مگن رہتا ہے ؎

ندانستم کہ خواہد شد گرفتار پریشانی — من آں روزے کہ دل را در خم زلف دلارامی بستم

کسی کے دل سے ایک ہی حسین اخیر تک نہیں اُترتا۔ اور کوئی ہر رنگ اور ہر کوچہ کے حسینوں پر جان دیتا اور منٹ دو منٹ کے بعد واپس بھی لیتا ہے۔ کوئی ایک ہی پھول کی خوشبو سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اور کوئی سارے زمانہ کے پھول سونگھ کر بھی سیر نہیں ہوتا۔ بلکہ بقول

ہر گلے را بوئے و رنگے دیگر است

ہر گل پر شیدا اور شیدا ہوتا اور ہر کوچہ میں قدم رکھتا ہے۔ لیکن صاف نکل جاتا ہے۔ کوئی دل کا کمزور دماغ کا ضعیف دائرۂ حسن میں ہی رہ جاتا ہے۔

ہائے جانِ من گردیدی اے دل — پھنسنے کی پیرو بار محبت

بعض ایسے بھی ہیں کہ جن کی طبیعتوں پر حسن اثر تو کرتا ہے کشش ہوتی تو ہے لیکن صرف ایک دم کے لئے دیکھا اور نکل گئے۔ ؎

نمی گردد دلم با ہیچکس انس — چہ سازم در مزاجم وحشتے ہست

کوئی ساری عمر ہی اسی کوچہ میں سرگرداں اور پریشان پھرتے پھراتے اور دنیا سے گذر کر عالمِ برزخ

میں بھی خوبصورتی کی لے ہی میں اُٹھتے ہیں۔ ؎

خواستم کز کوچہ دیوانگی بیروں روم ۔۔۔ تا قدم برداشتم زنجیر نالیدن گرفت

ہر شخص کسی نہ کسی رنگ میں حسن پرست ہے۔ اور ہر شخص کی طبیعت میں یہ خاصہ کچھ نہ کچھ پایا جاتا ہے۔ جو لوگ اس سے نابلد بھی ہیں۔ اُن کے دلوں پر یہ بجلی مار کر ہی جاتی ہے۔ وہ بھی کسی نہ کسی زد میں آ ہی جاتے ہیں۔ ؎

غمزہ نگہ غمزہ ابرو کماں ان نشان دل ۔۔۔ نی گر د خط تیر قصنا بود ست دانستم

باوجود اس کشمکش اور افراتفری اور زد و پر زد کے اکثروں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ

"حسن ہے کیا شے۔

"اس کا اطلاق کہاں کہاں ہو سکتا ہے۔

"اور اس کی تعریف کیا ہے۔

جو نہیں سوچتے یا سوچ ہی نہیں سکتے ان کا تصور بھی نہیں۔ بجلی اکثر چمکتی ہے۔ بعض پر پڑتی بھی ہے۔ مگر بہت کم سوچتے ہیں کہ وہ ہے کیا۔ اور کہاں سے اور کیونکر آتی اور پڑتی ہے۔ بجلی پر کیا موقوف ہے۔ صدہا وقوعات ہوتے ہیں۔ اور لوگ انکی نسبت خیال تک بھی نہیں کرتے۔ ہر کہ و مہ کہے جاتا ہے۔

"کیا حسین ہے۔ کیا خوبصورت ہے۔ کیا نفیس ہے۔ کیا دلربا ہے"۔

مگر یہ کوئی نہیں پوچھتا۔ کیا حسن۔ کیا خوبصورتی۔ کیا نفاست اور کیا دلربائی ہے۔ اور کیوں۔

حسن اور خوبصورتی کے متعلق سب سے پہلے دو اہم سوال ہو سکتے ہیں۔

"حسن کیا ہے

"اور اس میں کشش یا جذب کیوں ہے۔

لغت میں لفظ حسن بفتحتین بمعنی خوب و نیکو و بضم نکوئی و خوبصورتی۔ وحسن بدانسان کنایہ از تناسب اعضا و خوش نمائی رنگ است"۔ اگر لغوی اعتقادات سے حسن کی تعریف کریں تو

کہنا ہوگا۔ کہ

"حسن سے مراد تناسب اعضائے انسانی اور خوشنما رنگ یا کسی اور قسم کی خوبی اور نکوئی ہے"

اگر یہی تعریف صحیح اور جامع مان لی جاوے۔ تو پھر کوئی بحث ہی باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ جہاں خوشنما رنگ اور تناسب اعضا پایا جائیگا۔ حسن کا اطلاق ہو سکیگا۔ لیکن یہ درست نہیں۔ باوجود تناسب اعضا اور خوشنمائی رنگ کے بھی حسن کا اطلاق نہیں ہوتا۔ نری نکوئی اور خوبی بھی یہ پایہ نہیں رکھتی۔ اِس سوال کے متعلق کہ حسن کیا ہے؟

یہ سوال بھی ضم کرنا ہوگا کہ:۔

"حسن کا سٹینڈرڈ یا معیار کیا ہے۔"

مختلف حکیموں نے مختلف الفاظ میں حسن کی تعریف کی ہے۔ گو اُن میں سے بعض تعریفیں آپس میں ملتی جلتی ہیں۔ مگر پھر بھی جُدا گانہ ہیں

بعضوں نے وہی تعریف کی ہے جو لغوی پیرایہ میں کی جاتی ہے۔ گویا اُن کے نزدیک لفظ حسن کے معانی ہی اس کی مکمل تعریف ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے کہ

"حسن ایک ایسی کیفیت کا نام ہے۔ کہ دوسرے کے دل و دماغ پر ایک فوری اثر ڈال سکتی ہو۔"

"حسن ایک ایسی کیفیت کہی جا سکتی ہے۔ جس میں ایک جذب اور ایک کشش ہو۔"

"حسن ایک ایسی کیفیت ہے۔ جو بوجہ تناسبات موجودہ کے اپنی ذات میں ایک کشش اور اثر رکھتی ہے۔ خواہ کوئی اُس سے متاثر ہو یا نہ ہو۔"

"حسن ایک ایسی کیفیت ہے۔ جو بمقابلہ اپنے نقصوں کے اپنی خوبی پہلے دکھاتی ہو۔"

"حسن ایک ایسی کیفیت ہے۔ جو صرف حسین میں ہی پائی جاتی ہے۔ اور افراد اُس سے خالی اور مُعرّا ہوتے ہیں۔"

"حسن ایک خوبی ہے۔ جو نمائش اور رویت میں بمقابلہ اور اجزائے نمائشی پائیتی

کے زیادہ تر موثر ہے۔

"حُسن وہ کیفیت ہے۔ جو اُن تمام اوصاف سے متصف ہوتی ہے۔ جو ایک عام رائے سے مان لئے گئے ہیں۔

"حُسن ایک ایسی کیفیت ہے۔ جو اپنی بُری کیفیت پر غالب ہوتی ہے۔

"حُسن وہ کیفیت ہے۔ جو جسم ہر شئے سے تعلق رکھتی ہے۔ باعتبار خوبی اور عمدگی۔ دلچسپی کے۔

"حُسن صرف ایک دلچسپ کیفیت کا نام ہے۔

"حُسن صرف ایک موثر کیفیت ہے۔ خواہ کسی رنگ میں ہو۔

"حُسن اپنی اپنی پسند اور اپنا اپنا مذاق ہے۔

"حُسن کوئی کیفیت نہیں۔ صرف چند مذاقی تصرفات کا نام ہے۔

"حُسن صرف ایک وہم اور تصور کا نام ہے۔

مُندرجہ ذیل الفاظ میں بھی تعریف کی گئی ہے۔

"حُسن وہ ہے۔ جو طبیعت پر خود اُس کے اپنے مذاقی اور وجدانی جذبات کے ماتحت باعتبار اپنی بناوٹ۔ شان۔ آن۔ ترکیب۔ تالیف۔ بندش۔ تناسب کے فوری اثر کرے۔ یا غالب آجائے۔ یا یہ کہ طبیعت اس کی جانب بالخصوص مائل اور راغب ہو۔ عام اس سے کہ وہ میلان یا رغبت مسلسل ہو یا کسی ایک خاص عرصہ یا وقفہ کے واسطے۔

ان سب تعریفوں میں کسی نہ کسی مادہ کی جہت سے گونہ اطلاق ہے۔ اور سب سے پچھلی جو تعریف ہے۔ وہ قریباً کُل دوسری تعریفات کا خلاصہ یا مجموعہ ہے۔ ان سب سے یہ تعریف قریباً جداگانہ ہے۔

"کہ حسن اپنی اپنی پسند ہے۔

اپنی اپنی پسند کی قید بھی جذبات کے اعتبارات سے ہی مربوط ہے۔ چونکہ انسانی طبائع کے جذبات جداگانہ زیادہ اور متحد کم ہوتے ہیں۔ اور اُن میں ضرور تباین ہوتا ہے۔ اس واسطے حُسن کی تشخیص بھی۔ پابندی جُداگانہ جذبات کے جُداگانہ ہوتی ہے اگر مختلف پسند کرنے والے اور مختلف حسین انسان یا حسین اشیا۔ نمونہ کے طور پر دیکھی جاویں تو پایا جائیگا۔ کہ اس بازار حسن کا نرخ اور معیار گاہکی کبھی ایک نہیں۔ ایک شخص ایک شے کو خوبصورت سمجھتا ہے۔ اور اس کا دلدادہ ہے۔ لیکن دوسرا اصحاب اس کے اس کی نسبت بہت ادنیٰ رائے رکھتا ہے۔

ملہ ہر شے یا ہر وجود کے واسطے تناسب یا ترکیبی اور باطنی خوبی اور بناوٹی عمدگی کے سوائے ایک اور خاص کیفیت بھی ہوتی ہے۔ جو دوسروں پر ایک خاص صورت میں اثر کرتی ہے۔ ایسی کیفیت کا نام دوسرے الفاظ میں شان ہے۔ شان وجود شے یا حُسن شے سے ایک جُداگانہ کیفیت ہے۔ اور یہ جاندار غیر جاندار دونوں میں جداگانہ مقادیر اور مراتب میں پائی جاتی ہے۔ بعض ایسے بھی وجود ہیں۔ کہ جن میں یہ کیفیت ہوتی ہی نہیں۔ ہندی میں اسکا نام چھب یا چڑھت ہے بعض وقت یہ جو کہا جاتا ہے کہ جوان تو اچھا ہے لیکن چھب نہیں۔ روپ یا چڑھت نہیں۔ اسکا مطلب یہی ہوتا ہے کہ شان نہیں۔ حسن اور شان یا چھب میں فرق ہے۔ بیشک ایک انسان یا ایک شے حسین اور خوبصورت تو ہو سکتی ہے لیکن اُس سے یہ نہیں لازم آتا۔ کہ چھب دار یا باشان بھی ہو۔ یہ چھب اور شان حسن سے بھی خاص نہیں۔ بعض اوقات عرفی طور پر ایک شخص حسین نہیں ہوتا لیکن اس کی ذات یا اس کے وجود میں ایک چڑھت اور شان ہوتی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ اس کے نقوش بوجہ طبیعت نہیں کرتے لیکن شاندار چڑھت اثر کرتی اور اپنا جوبن دکھاتی ہے۔ بعض جانور گو خوبصورت اور حسین ہوتے ہیں لیکن چونکہ انکی چڑھت اور شان کوئی نہیں ہوتی۔ اسواسطے وہ معمولی کیفیت کے معلوم ہوتے ہیں۔ اور طبائع پر ان کا فوری اثر نہیں ہوتا۔ انسانوں پر ہی موقوف نہیں۔ حیوانات۔ نباتات۔ جمادات میں بھی یہ حالت یا یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ بعض پھولوں میں گو خوشبو اور نزاکت تو ضرور ہوتی ہے۔ لیکن وہ شان اور دلچسپی نہیں ہوتی۔ جو بعض دیگر میں پائی جاتی ہے۔ چنبیلی کے پھول میں بھی نزاکت اور خوشبو ہوتی ہے اور گلاب کے پھول میں بھی یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ مگر جو شان گلاب کے پھول کی ہے وہ چنبیلی کی تو نہیں۔ شیر کا وجود ہاتھی کے وجود سے کم ہوتا ہے مگر ہاتھی کے وجود میں وہ شان اور وہ چڑھت کہاں جو شیر کی ذات اور وجود میں خدا نے ودیعت کر رکھی ہے

ایک شخص ایک شخص کی نظروں میں حسین اور مہ جبین ہے۔ لیکن اس کا دوسرا بھائی اُسے معمولی سلسلہ میں بھی نہیں لیتا۔

مختلف متکلف اور سجے سجائے مکانوں میں سامان آرائش دیکھو۔ تو پاؤ گے کہ ہر مکین انتخاب سامان میں جداگانہ عمل یا مذاق رکھتا ہے۔ اگر ایک مجمع میں چند حسین انسان اور چند حسن بین بیٹھے ہوں تو ہر ایک کی رائے قریبًا جداگانہ ہوگی۔ کسی حالت میں ایک کی نسبت متفقہ رائے نہیں ہو سکتی۔ اس جہت سے یہ کہا جاتا ہے۔

لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید

اگر اس طریق عمل یا اس طریق انتخاب پر بحث کیجاوے۔ تو کہنا پڑیگا کہ حسن کی کوئی تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ یا یہ کہ فی الحقیقت حسن کا کوئی خاص معیار نہیں ہے۔ ہر شخص کا اپنا اپنا مذاق اور اپنی اپنی پسند ہے۔ گو یہ کہا جاویگا کہ اکثر باتوں میں بعضوں کا اتفاق بھی ہو جاتا ہے لیکن باعتبار کشش کے ضرور فرق ہوتا ہے۔ یہ بہت کم نہیں سنا گیا ہو کہ ایک ہی حسین کے سینکڑوں شیدائی اور فدائی ہوں۔ عموماً ایک ہی از کار رفتہ ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو دوسرے لوگ یہ بھی کہا کرتے ہیں۔ کہ

"میاں! بات کچھ نہیں۔ معلوم نہیں کیوں مرتا ہے۔

"شے تو کچھ نہیں۔ یہ دیوانگی کیسی۔

یہ مان لیا جا سکتا ہے۔ کہ ایک حسین کی تعریف میں کبھی کبھی بہت سے لوگ بھی رطب اللسان ہوتے ہیں۔ مگر جو ایک یا دو کے دل میں کشش ہوتی ہے۔ وُہ دوسروں کے دلوں میں نہیں ہوتی

ہاتھی باوجود اس قدر تنومند و قد و قامت کے شیر کے دیکھتے ہی لرزتا ہے۔ بمقابلہ اور جانوروں کے باز کی کیا حقیقت ہے۔ لیکن اسکی شان سب سے فائق اور خوفناک ہے۔ بڑے بڑے جانور گھونسلوں میں چھپے پھرتے ہیں اور دیکھتے ہی فرار ہو جاتے ہیں۔ یہ اسواسطے نہیں کہ باز بعض دوسرے جانوروں سے تندرو اور جسم میں بڑا ہے۔ بلکہ اسکی جوہر ہو کہ اسکی شان بمقابلہ ان کے فائق ہے۔ گو حوصلہ ہی بڑا ہے۔ مگر حوصلہ کیساتھ جو ہستہ و شان بھی اُسے وہاں کیا اور اس امتیاز میں لے آتی ہے۔

سب چاہتے ہیں۔ کہ انہیں اچھی شے ملے مگر جان جوکھوں کے بل خریدار کوئی ہی بنتا ہے۔ قیس نے
بھی لیلیٰ دیکھی اور دُوسرے بھی دیکھتے تھے۔ وُہ حالت اور وہ دیوانگی کبھی بھی نصیب نہ ہوئی
جو قیس کے نوشتہ میں لکھی تھی۔ فرہاد کی طرح اَور لوگ بھی تھے۔ حُسنِ شیریں سے شیریں کلام تھے
لیکن اُن میں سے سوائے بدنصیب فرہاد کے اور کوئی بھی تیشہ عشق سے گھائل نہ ہوا۔ اور
کیڑے مکوڑے بھی پروانہ کی طرح شمع جلتی دیکھتے اور اس کے قرب وجوار سے گذرتے ہیں۔
پروانہ ہی کی شامت آئی رہتی ہے۔ سب جانور چاند دیکھتے ہیں۔ لیکن حسن شوق سے چکور
دیکھتا ہے اَور کون دیکھتا ہے۔ یہ تمام مثالیں ظاہر کرتی ہیں۔ کہ آثار دارادہ کا مختلف
ہونا محض جذباتی یا مذاقی اختلاف کی وجہ سے ہے۔ ورنہ ایک حُسن اور ایک خوبصورتی پر
سب کا متفق رائے اور فدا ہو جانا لازمی تھا۔ کیونکہ جس طرح سب کے نزدیک دو اور دو
چار ہیں۔ اسی طرح ایک حسین اور ایک خوبصورت سب کے نزدیک ایک ہی تعریف اور ایک ہی کشش
کا مرجع ہوسکتا ہے۔ چونکہ ہم ایک دُوسرے سے باعتبار جذبات کے مختلف الطبائع ہیں۔ اسواسطے
حسن کی تعریف بھی جداگانہ ہوتی گئی۔ ایک ملک میں بھُورے بال اور نیلی آنکھیں موجب
خوبصورتی ہیں۔ اور ایک میں سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں۔ ایک قوم میں چھوٹے پیر اور چھوٹے
ہاتھ اور لمبا قد نازک بدن۔ خوبصورتی کی علامت یا خوبصورتی ہے۔ دوسری قوم میں
ہاتھ بڑے پیر بڑے۔ قد متوسط۔ موٹا بدن حسن دلفریب ہے۔ ایک گروہ کتابی چہرہ پر
لٹو ہے۔ اور ایک مدور چہرہ کی تعریف کرتا ہے۔ ایک فرقہ رنگ ملیح پسند کرتا ہے۔
اور دُوسرا لون صبیح۔ ایک سانولہ کی نے ہیں شیدا ہے۔ اور دُوسرا گندم گونی پر رخ ہے۔
ایک کوئی پھول پسند کرتا ہے۔ اور دوسرا کوئی۔ ایک کوئی نقش چاہتا ہے۔ اور دوسرا کوئی۔
ہر طبیعت کا مذاق اور طبیعت کا انتخاب جداگانہ ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اگر آتا ہے۔ تو
کچھ بے دلیل ہے کہ کیوں مذاق اور انتخاب میں فرق ہے۔ بعضوں نے کہا ہے۔ کہ دراصل حسن
میں ہی چونکہ اختلاف ہے۔ اسواسطے طبائع میں بھی اختلاف ساری رہتا ہے۔ بعضوں نے یہ

تاویل کی ہے۔ کہ ہمارے ہر ایک قسم کے مذاق اور انتخاب کی چند غرضیں ہوتی ہیں۔ اور انہیں چند اغراض کے ماتحت انتخاب اور مذاق بھی ہوتا ہے۔

جب یہ سوال پیدا کیا جاتا ہے۔ کہ حسن کا سٹینڈرڈ (standard)[1] یا معیار کیا ہے تو اس کے جواب یا حل میں بعض اغراض بھی بحث میں لائی جا سکتی ہیں۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ جیسے ہماری غرض ہوتی ہے۔ ویسا ہی حسن کا معیار یا سٹینڈرڈ بھی ہوتا ہے۔ یا جیسے ہمارا مذاق یا میلانِ خاطر ہوتا ہے۔ ایسے ہی حُسن کا سٹینڈرڈ بھی سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ہمارا میلان یہ ہے۔ کہ اس قسم اور اس بندش یا اس نوع کا پھول ہونا چاہیئے۔ یا انسان کی شکل و صورت اس طرح کی ہو تو خوب ہے۔ اس کے مطابق ہمارے خیال میں حسن کا سٹینڈرڈ بھی ہوگا۔ ہم کتابی رُخ پسند کرتے ہیں۔ پس ہمارے خیال میں حسن کا سٹینڈرڈ کتابی رُخ ہوگا۔

سٹینڈرڈ دو درجے رکھتے ہیں۔

"مسلّمہ عام۔

"مسلّمہ خاص۔

پہلی قسم کے وہ سٹینڈرڈ ہیں۔ جو عام طور پر تسلیم شدہ ہیں۔ عام لوگوں کے خیال میں اُسی قسم اور اُسی قماش کی نسبتیں یا وجود ہونے چاہئیں۔ جو اُس سٹینڈرڈ کے موافق ہیں۔ خاص قسم کے وُہ ہیں۔ جو باعتبارِ جذبات خاصہ جُداگانہ اصُولوں پر مبنی ہیں۔ عام معیار یا عام سٹینڈرڈ میں وُہ باتیں یا وہ امور ملحوظ رہتے ہیں۔ جو بہت سے تجربوں اور رایوں

[1] معیار یا سٹینڈرڈِ حسن اور تعریف حسن میں فرق ہے۔ تعریف میں تو ایک وجود یا ایک ذات یا ایک شے کی وسعت اور جامعیت کا بیان ہوتا ہے۔ اور تناسباتِ موزونہ کا ذکر۔ سٹینڈرڈ میں خلاف اس کے ایک خاص یا عام معیار بیان کیا جاتا ہے۔ جو گو اس وجود یا اُس ذات اور اُس شے سے ایک نسبت رکھتا ہے۔ جس سے اُسے نسبت ہے۔ لیکن پھر بھی ایک جداگانہ کیفیت یا اصُول رکھتا ہے ۱۲

کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔ اور خاص معیار میں وہ امور یا وہ اصُول جو خاص خاص جذبات یا خاص مذاق کے ماتحت ہوتے ہیں ۔ اگر دونوں قسم کے انتخابات پر بنظرِ تعمق غور کیا جاوے ۔ تو پتہ لگ سکتا ہے ۔ کہ ہمیشہ ان دونو قسموں میں کس قسم کا فرق اور تمیز ہوتی ہے ۔ سونے کے پرکھنے کے بہت سے معیار ہیں لیکن منجملہ ان کے بعض اصُول خاص بھی ہیں ۔ یا یُوں کہئے کہ انتخابی نظریں ہمیشہ جداگانہ ہوتی ہیں ۔ جب چند انتخابات ایک ہی اصُول کے نکل آتے ہیں ۔ تو انہیں عام سٹینڈرڈ کہا جاتا ہے ۔ اور جب جداگانہ انتخاب سے کام لیا جاتا ہے ۔ تو وہ خاص سٹینڈرڈ سے تعبیر کئے جاتے ہیں ۔

ہر انتخابی صُورت ایک سٹینڈرڈ یا ایک معیار رکھتی ہے ۔ اس کے مطابق انتخابی عمل عمل پذیر ہوتا رہتا ہے ۔ کبھی کبھی ایسا سٹینڈرڈ سیکنڈ نیچر یا طبیعتِ ثانی کی کیفیت رکھتا ہے ۔ منتخب کنندہ بوجہ سنا بہت اتم اس میں اور طبیعتِ اوّل میں فرق اور تمیز مشکل سے کرسکتا ہے +

سُلطان احمد (از سبانوالی)

ملاکا بید کی ایک چھڑی

جناب محمد یار خانصاحب مالک سٹی ایزن ورکس سیالکوٹ شہر نے ہمارے پاس ایک برائے نوٹس بھیجی ہے ۔ یہ خوبصورت چھڑی نہایت اعلیٰ قسم کے سیاہ بید کی ہے ۔ اور سیاہ بید پر چاندی کی خوشنما اور منقش مقام بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتی ہے ۔ بلحاظ لمبائی ۔ موٹائی کے یہ چھڑی ہر طرح سے موزون ہے ۔

اپنے مُلک کی دستکاری کے قدردان ضرور منگوائیں ۔ قیمت تین روپیہ (ے) زیادہ نہیں ۔ ہر خریدار کا نام بھی شام پر انگریزی حروف میں کندہ کردیا جائیگا +

نباتاتی غذا

چند سال ہوئے مجھے یہ سنکر بہت تعجب ہوا تھا۔ کہ میرے ایک ہندو دوست ۔ جو تین چار سال انگلستان رہ کر وطن کو واپس آئے تھے ۔ اپنے زمانۂ قیام انگلستان میں برابر ویجی ٹیرین رہے ۔ یعنی نباتاتی غذا کھاتے رہے ۔ میرے متعجب ہونے کے دو سبب تھے ۔ اول تو یہ کہ انگلستان کی سرد آب و ہوا میں اُن کا گذارہ گوشت کھائے بغیر کیونکر ہوا ۔ اور دوسرے یہ کہ وہ نباتاتی غذا کے پکوانے کا بندوبست کیونکر کر سکے اور سفر میں کیا انتظام ممکن تھا ۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ انگلستان میں ویجی ٹیرین رہنا ہر طرح ممکن ہے ۔ اور ہر جگہ نباتات کھانے والے کے لئے سہولتیں مہیا ہیں ۔ اگر وہ اُنکی تلاش کرے ۔ چنانچہ اس وقت کئی ہندو طالب علم یہاں پورے ویجی ٹیرین موجود ہیں ۔

انگلستان کے متعلق ہمارے ملک میں بہت سی غلط اطلاعیں ہیں ۔ اُن میں یہ بھی ہے ۔ کہ گوشت اور جگہ خواہ ضروری غذا نہ ہو ۔ مگر انگریزی آب و ہوا میں اس کے بغیر صحت درست نہیں رہ سکتی ۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ نہ صرف اس غذا کے ساتھ صحت درست رہ سکتی ہے ۔ بلکہ پہلے سے بہتر ہو جاتی ہے ۔ میں نے امتحاناً کچھ مہینوں کے لئے اس غذا کو اختیار کیا تھا ۔ اور اس عرصہ میں گوشت میں نے محض اتفاقیہ طور پر کسی کے ہاں مہمان ہونے کے موقعہ پر کھایا ۔ اس امتحان میں یہ غذا بہت موافق آئی ۔ اور کسی طرح کی تکلیف کا باعث نہیں ہوئی ۔ میرا یا میرے کسی اور ہندوستانی دوست کا تجربہ اس بارہ میں کوئی عام کلیہ قائم کرنے کے لئے کافی نہیں ۔ لیکن ہزارہا انگریزوں کا تجربہ جو اس آب و ہوا میں پیدا ہوئے اور جن کی ابتدائی پرورش بھی غذا پر ہوئی ۔ اگر اس خیال کی تصدیق کرے تو اس نتیجہ سے انکار نہیں پڑتا ۔ کہ نباتاتی غذا یہاں کے لئے بھی ویسی ہی موزون

ہے۔ جیسی کسی اور جگہ کے لئے۔ ہندوستان میں بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ یورپ اور امریکا میں ایک کثیر تعداد نباتاتی غذا کے شایقین کی پیدا ہو گئی ہے۔ جو لحمی غذا سے پرہیز قریب قریب اسی تشدد کے ساتھ کرتے ہیں۔ جو ہم اپنے ہاں ہنود کے پُرانے طبقہ میں دیکھتے ہیں۔ پچاس ساٹھ سال ہوئے یہ تحریک مغربی دنیا میں شروع ہوئی تھی۔ پہلے لوگ اس پر ہنستے تھے۔ اور نباتاتیوں کو باولا سمجھتے تھے۔ اور یہ خیال کرتے تھے کہ جلد طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہو کر پشیمان ہونگے اور گوشت کھانے کی طرف عود کرینگے۔ لیکن جب انھیں نئی غذا راس آگئی اور اُن کا چرچا اخبارات اور رسائل کے ذریعے سے پھیلنے لگا تو توجہ اس تحریک کی طرف کھنچی۔ سب سے پہلے جو لوگ نباتات خور بنے وہ زیادہ تر نباتات کی طرف اس لئے مائل ہوئے۔ کہ اس غذا کے ذریعے سے ماہوار اخراجات میں بہت کفایت ممکن تھی۔ خوشحال امیر نباتاتیوں کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ کہ کنجوس ہیں۔ آخر کچھ اُمرا۔ اور ذی وجاہت اشخاص بھی اس تحریک میں شریک ہونے لگے۔ اور اس دن سے فیصلہ ہو گیا۔ کہ کوئی اصلی خوبی اس غذا میں ہوگی۔ جو لوگوں کو اس کی طرف مائل کرتی ہے۔ اب ویجی ٹیرین مسافر خانے جابجا قایم ہو رہے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں کئی کئی ہوٹل خاص انہی لوگوں کے لئے جاری ہو گئے ہیں۔ جو خالص نباتاتی غذا کھاتے ہیں اس وقت ہزارہا اشخاص زن و مرد ویجی ٹیرین ہیں۔ اور یہ تعداد روز افزوں ہے۔ یہی حال جرمنی کا ہے۔ مجھے لنڈن میں بہت سے جرمن ملے ہیں۔ جو گوشت سے قطعی پرہیز کرتے ہیں۔ اور انگریزوں کے اکثر ویجی ٹیرین خاندانوں سے میں واقف ہوں۔ گر ٹھیک اندازہ اس غذا کی بڑھتی ہوئی ہر دلعزیزی کا لگانا ہو تو چاہیئے کہ دوپہر کے کھانے کے وقت لنڈن کے کسی ویجی ٹیرین رسٹوراں میں جانکلیں تیرہ چودہ نباتاتی رسٹوران لنڈن میں ہیں جن میں بڑے بڑے یہ ہیں:-

(۱) سینٹ جارج کا فے ۔ ۳۷ سنٹ مارٹین لین ۔ ڈبلیو ۔ سی ۔
(۲) فوڈ ریفارم (یعنی اصلاح غذا) ۲ فرنیول سٹریٹ ۔ ہوبرن ۔ ڈبلیو ۔ سی ۔
(۳) ہینشن ہاوس ۔ ۳۴ ۔ ۳۵ پولٹری ۔ ای ۔ سی ۔
(۴) ہائی ہوبرن ۔ ۲۲۸ ہوبرن ۔ ڈبلیو ۔ سی ۔
(۵) اُلفا ۔ ۲۳ اکسفورڈ سٹریٹ ۔ ڈبلیو ۔

ان سب مقامات میں دوپہر کو جگہ ملنی دشوار ہوتی ہے ۔ اور ہر کرسی رُکی ہوئی ہوتی ہے ۔ سینکڑوں آدمی ایک وقت محض نباتاتی کھانا کھا رہے ہوتے ہیں ۔ اور جب وہ اُٹھ جاتے ہیں تو سینکڑوں اُور اُنکی جگہ لینے کو موجود ہوتے ہیں ۔

یہ انتظام لندن تک محدود نہیں ۔ بیرونجات میں بھی اب ایسی جگہیں ہوتی جاتی ہیں ۔ اس لئے سفر میں بھی ویجی ٹیرین مسافر کو تکلیف نہیں ۔ مندرجہ ذیل مقامات میں اب اس کھانے کے لئے رسٹوران کھل گئے ہیں :۔

لورپول ۔ لیڈز ۔ بورن متھ ۔ مانچسٹر ۔ شیفیلڈ ۔ ناٹنگھم ۔ بولٹن ۔ ہیلی فکس ۔ برمنگھم ۔ اسی طرح سکاٹلینڈ میں بھی ہیں اور آئرلینڈ میں بھی ۔ بعض شہروں میں کثیر ہیں ۔ مانچسٹر نباتاتیوں کا بڑا مرکز ہے ۔ اور وہاں چھ ایسے رسٹوراں ہیں ۔

ان کے علاوہ ہر شہر میں متعدد مکان ایسے ہیں ۔ جہاں آدمی مستقل سکونت رکھ سکتا ہے اور غذا ویجی ٹیرین ملتی ہے ۔ ان مکانوں کی فہرست ویجی ٹیرین سوسائٹی کے دفتر سے مل سکتی ہے ۔ جہاں ہر قسم کی کتابیں اس مضمون پر موجود ہیں ۔ اور یہ سوسائٹی اب ہر بڑے شہر میں اپنی شاخ رکھتی ہے ۔

کتابوں میں اس طریق کے اختیار کرنے کی تائید میں طرح طرح کی دلائل سے کام لیا گیا ہے ۔ کوئی تو طبی دلائل پر زور دیتا ہے ۔ اور عام اشیاء خوردنی کا طبی تجزیہ کر کے لکھتا ہے ۔ کہ کونسی غذا زیادہ مقوی ہے ۔ اور کیا کیا جزو کس چیز میں پائے

ہے۔ کوئی رحمدلی کی دلائل سے کام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ جانوروں کو مار کر اپنا پیٹ
بھرنا انسانیت کے خلاف ہے۔ اس آخری دلیل کے ماننے والے یورپ میں ہیں
تو سہی مگر نسبتاً کم ہیں۔ اسی واسطے یہاں اکثر ویجی ٹیرین انڈوں سے پرہیز نہیں کرتے۔
انہیں جو دلیل قائل کر رہی ہے وہ یہی ہے کہ جب از روئے طب نباتاتی غذا سے وہی جسمانی
قوت ممکن ہے۔ جو لحمی غذا سے حاصل ہوتی ہے۔ تو کیوں نباتاتی غذا کو ترجیح نہ دی جائے
جو فطرت انسانی کے زیادہ مطابق معلوم ہوتی ہے۔ اور جس کا صحت پر اچھا اثر پڑتا ہو۔
کئی اخبار اور رسالے یہاں ایسے نکلتے ہیں۔ جن میں صرف ویجی ٹیرین امور کے
متعلق اطلاع درج رہتی ہے۔ کہ کہاں کہاں جلسے ہوئے۔ کونسی نئی کتاب چھپی۔ غذا میں کیا
نئی اصلاح ہوئی۔ کھانے پکانے کی کوئی عمدہ سی ترکیب نئی معلوم ہو تو وہ بھی درج کر دیتے
ہیں۔ اور نئے شرکاء کے ناموں کی فہرستیں بھی اُن میں چھپتی رہتی ہیں۔ بہت عرصہ نہیں ہوا
کہ ایک اخبار نے چند عالی رتبہ اشخاص کے نام اور تصویریں چھاپی تھیں۔ جو ویجی ٹیرین
کہلاتے ہیں۔ اُن میں لارڈ چارلس بیرسفورڈ مشہور امیر البحر کا نام بھی تھا۔ مسٹر
برنارڈ شا جو موجودہ ڈراما نویسوں میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اس تحریک کا بڑا حامی اور
اُس کی خوبیوں کا معترف ہے۔ نامور لیڈیوں میں کونٹس آف ایسکس اور لیڈی سوسٹر
قابل ذکر ہیں۔ جو عرصہ سے نباتات اور فواکہ کے سوا کچھ نہیں کھاتیں۔

حال میں "مکتی فوج" کے ممتاز بانی جنرل بُوتھ نے بھی نباتاتی غذا کے حق میں شہادت
دی ہے۔ یہ تو عام طور پر معلوم ہے کہ جنرل بُوتھ بہت بُوڑھے ہیں اور کام بھی اُن کے
ذمے بہت ہیں۔ مگر اُن کی صحت اب تک بہت اچھی ہے۔ اور باوجود بڑھاپے کے
دُنیا بھر میں اپنی فوج کو اُبھارنے اور مذہب عیسوی کا جوش پھیلانے کے لئے
چکر لگاتے اور پُرزور تقریریں کرتے رہتے ہیں۔ اُن سے کسی اخبار والے نے
جا کر پُوچھا تھا۔ کہ اُن کی غذا کیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ میں نے سات سال سے

مرغ و ماہی ۔ و گوشت ترک کر رکھے ہیں۔ مگر مجھے اس ترک سے کسی قسم کا ضعف لاحق نہیں ہوا۔ نہ میری صحت بہت عمدہ رہی اور میرا دماغ بہت صاف رہا ہے۔

اب جو اس طرح کئی نامور اور با اثر آدمی ویجی ٹیرین ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس تحریک کو تقویت پہنچی جاتی ہے۔ تو بعض سرگرم ویجی ٹیرین بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے لگے ہیں ایک کتاب میں تو مصنف نے یہانتک لکھدیا ہے۔ کہ گوشت کھانا ایک وحشیانہ فعل ہے۔ جو یقیناً اصلی تہذیب کی ترقی کے ساتھ ختم ہو جائیگا اور وہ دن آنیوالا ہے۔ جب ساری دنیا ویجی ٹیرین ہوگی۔ میرے خیال میں یہ رائے مبالغہ آمیز ہے۔ اور مجھے یہ نہایت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک اصول کی ساری دنیا قائل ہو جائے۔ خواہ وہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو۔ خصوصاً اس مسئلہ پر اتفاق رائے زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ گوشت کھانے والے بھی قوی دلائل اپنے حق میں رکھتے ہیں۔ جن میں مختلف مذاہب ہیں گوشت کھانے کی اجازت کچھ کم زبردست نہیں۔ لیکن جو حالت اس تحریک کی اس وقت یورپ میں ہے اور جس رفتار سے یہ روز بہ ترقی ہے۔ اُس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے۔ کہ عجب نہیں چالیس پچاس سال میں مغربی دُنیا کا ایک معقول حصّہ اس تحریک کی خوبی کا قائل اور گوشت سے پرہیز کے مسئلہ پر عامل ہو جائے۔ اور اگر ایسا ہوا تو مغرب کی تاریخ میں یہ بھی ایک انقلاب عظیم ہوگا۔ جو ہندو دھرم کے لئے جس کے بزرگوں نے مدتوں سے گوشت سے پرہیز کی تلقین کی ہے۔ باعثِ ناز ہوگا۔

میرا مطلب اس تحریر سے گوشت کھانے کی مخالفت بأماس" اور گھاس کی ناگوار بحث کو تازہ کرنا نہیں ہے۔ بلکہ مندرجہ ذیل ضروری واقعات کا اظہار مقصود ہے:۔

(اوّل)۔ یہ کہ یورپ میں عموماً اور انگلستان میں خصوصاً گوشت کھانے کے بغیر بہ آسانی کام چل سکتا ہے اور اس لئے جو اصحاب اس ڈر کے مارے سفر سے گریز کرتے ہوں گے انہیں اپنے عقائد یا عادت کے خلاف گوشت کھانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ وہ اس

روک کو ستہ راہ نہ ہونے دیں۔

(دوم) یہ کہ نباتاتی غذا اکثر ہوٹلوں میں ملتی ہے۔ مکان ایسے مل سکتے ہیں۔ جہاں یہی غذا مستعمل ہو۔ اور مدارس وغیرہ کے کھانوں میں بھی اس کا انتظام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بیرسٹری کے لئے جو لوگ یہاں پڑھتے ہیں۔ اور جنہیں ہر سال چوبیس کھانوں پر ہال میں حاضر ہونا لازم ہے۔ وہ اگر چاہیں تو انہیں ہال کے اندر ویجی ٹیرین کھانا مل جاتا ہے۔

(سوم) یہ کہ ہمارے ملک میں جو گوشت کھانے والے حضرات نباتات کھانے والوں کو گھاس خور وغیرہ تحقیر کے کلمات سے پکارتے ہیں۔ وہ اس تحقیر سے پرہیز کریں اور ہر شخص کی ذاتی آزادی کا لحاظ رکھیں اور اس بات کو تسلیم کریں کہ نباتاتی غذا اپنی جگہ کسی اور غذا سے کم قابلِ قدر نہیں۔ کیونکہ ہندوستان کی گرم آب و ہوا کے لئے تو یہ انگلستان سے بھی زیادہ موزون ہے +

عبدالقادر

نوجوانوں کا رہنما (مصنفہ ڈاکٹر سلیوسٹر گراہم صاحب) جس میں ان خرابیوں کا ذکر ہے جن میں مبتلا ہو کر نوجوان اپنی صحت جسمانی اور قوائے عقلی کو بگاڑ لیتے ہیں۔ اور اُن سے بچنے کی تدابیر اور ہدایات درج کی گئی ہیں۔ مسٹر ہرسرن ایم۔ اے سے ترجمہ کرا کے پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی نے شائع کیا ہے۔ قیمت ۴؎

لطفِ کہسار یعنی سلسلۂ کوہستان شملہ کے حالات منشی رائے بھگونت رائے صاحب نائب ناظم اکالگڑھ ریاست پٹیالہ نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھ کر چھپوائے ہیں۔

اس کتاب میں کوہستان کے حقیقی لطف پہاڑی معابد اور میلے۔ شملہ کی سیر۔ جاکل کا نوشتۂ تقدیر وغیرہ خاص ابواب ہیں۔ جنکو مصنف نے اپنے تجارب اور مشاہدات سے دلچسپ بنا دیا ہے۔ شملہ اور اس کے گرد و نواح کی سیر کیلئے یہ کتاب اچھے گائیڈ کا کام دیگی۔ قیمت ۱۲؍ مصنف سے مل سکتی ہے۔

سیرِ گلفروشاں پر ایک سرسری نظر

دھواں دھار بادل اُٹھے۔ اُودی اُودی گھٹائیں گھِریں۔ نیلا آسماں کاک ریزی ہوا۔ بجلی کوندی۔ رعد گرجا۔ ٹھنڈی ہوائیں آئیں۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنی شروع ہوئی اور آناً فاناً ہی پیشِ نظر منظر کچھ سے کچھ ہوگیا۔ برکھا رُت۔ یہ بھی کیا روح افزا رُت ہے۔ جسے بھاکا والے برکھا۔ اُردو دان برسات۔ انگریز رینی سیزن اور اہلِ فارس بشگال کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں جتنا اثر اس موسم کا ہندوستان پر پڑتا ہے اور جو کیفیت یہاں والے اس موسم کی اُٹھاتے ہیں وہ اور ملکوں میں نصیب نہیں۔ یہاں سبزے لہک جاتے ہیں۔ ہریالی متوالی بیلیں دوڑتی ہیں۔ پھول برستے ہیں۔ ڈالیاں جھومتی ہیں۔ میدان۔ پہاڑ۔ جنگل اور چمنستان۔ ندی۔ نالے بھرے پُرے دریا جوبن پر آجاتے ہیں اور قریب قریب ہر نظر رُوپ سے خالی نہیں پھرتی۔

اِنسان تو انسان اِس رُت کی ہواؤں میں یہ خاصہ ہے کہ حیوانوں میں بھی ایک قسم کی مستی پیدا ہوجاتی ہے۔ مور جھنکارتے ہیں۔ کوئل کوکتی ہے۔ پپیہا الاپتا ہے۔ بھونرے گونجتے ہیں۔ رنگ برنگ کی تیتریاں پھول سونگھتی ہیں۔ مکھیاں بھِن بھِن کرتی ہیں اور جہاں تک دیکھا گیا ہے ہر چرند و پرند ان دلاویزیوں سے سرشار ہوکر جھومنے اور کلیلیں کرنے لگتا ہے۔ گائے۔ بھینس جو سبزہ زار میں چرتی ہیں۔ اُنکے بھرے بھرے جسم۔ تیار بدن۔ نظر پھسل پھسل جانے والے اعضا۔ موتی جیسا پانی پڑتے ہی چمکنے لگتے ہیں۔ وہ نرم نرم ہری ہری گھاس کھاتی ہیں۔ گردنیں اُٹھا اُٹھا کر فضائے آسمان کو دیکھتی جاتی ہیں۔ قدم قدم اِدھر اُدھر بڑھتی ہیں اور گویا زبانِ حال سے اُن تازگیوں کا شکریہ ادا کرتی جاتی ہیں جو قدرت نے اُنکے لیے مہیا کردی ہوتی ہیں۔

برف جیسا سفید دودھ جھاگ جھاگ اُن کے تھنوں میں افراط کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ مکھن اور گھی کی نہریں بہتی ہیں۔ اور پیوسی اور دہی کے جمے ہوئے چشمے اپنے مالکوں کے لیے وقف کر دیے جاتے ہیں۔

ایسے سمے میں دلّی شاہجہان آباد سے سات آٹھ کوس نکل کر جب کبھی قطب صاحب چلے گئے ہیں۔ بس زندگی ہو گئی ہے زندگی۔ سُہانا وقت۔ صاف ستھرے میدان نہائے دھوئے درخت۔ دُھلی دُھلائی سڑکیں اور میلوں کا ہرا بھرا نظارا آنکھوں کو منور دل کو مسرور اور طبیعتوں کو خوشحال کر جاتا ہے۔ تالاب اور جھڑ گڈے پانی سے لبریز ہوتے ہیں۔ لمبی لمبی گھاس ... کے برابر ہوتی ہے۔ لال سبز کالی اپنا سماں دکھاتی ہے۔ کالی کالی گھٹائیں اُمنڈ سایہ کرتی ہیں اور سفید سفید عمارتوں کا جگہ جگہ درختوں میں جھلکنا بس کچھ انہیں کا حوال ہے پوچھئے جنہوں نے دیکھا ہے۔

اسے لیجئے وہ بگلوں کی قطار کالے کالے بادلوں میں روئی کے گالوں کی طرح اُڑتی ہوئی منصور کے مقبرے سے چلی۔ ہوئی نور پہنچی۔ جوگ مایا جی میں براجی اور قطب صاحب کے جھرنوں پر پر مارنے لگی۔

آہا ہا! آج ہی تو پنکھا بھی ہے۔ اور وہ بھی جمعرات کا! شام کے لگ بھگ لاٹھ سے لیکر جھرنے تک بلکہ اس سے بھی پرے۔ ہندو مسلمان غریب امیر وضیع و شریف۔ بڈھے جوان۔ لڑکے بالے سبھی ایلے گیلے پھر رہے ہیں۔ لب لہکارا بانا رنگیلے چھبیلے شوقین مزاج تماشائیوں سے اٹا ٹٹ بھرا ہوا ہے۔ دو رویہ دکانیں سجی ہوئی ہیں۔ شیشہ آلات جھمک رہے ہیں۔ مٹھائیاں چنی ہوئی ہیں۔ کھانے پک رہے ہیں۔ اُنکی بُو باس۔ بلند ہو ہو کر دماغوں کو تازہ کر رہی ہے۔ میوہ جات قرینے سے لگے ہوئے ہیں۔ کہیں سادہ کاری نقاشی۔ زر و زیور۔ چاندی سونے کا دریا بہا رہے ہیں۔ کہیں سلمی ستارے کی جوت آنکھوں میں روشنی دیتی ہے۔ طرح طرح کے سامان۔

وضع وضع کے تکلفات نظر آ رہے ہیں۔ رام رنگی کے متوالے جھومتے جھامتے چلے آتے ہیں۔ صوفی صافی پھریاں لے لیکر مسکرا رہے ہیں۔ کٹورہ بج رہا ہے۔ سودے والوں کی پکار تمام نظارے کو گرم کیے دیتی ہے اور شوقین شہر کے زندہ دل باشندے اپنے مرتبے اور حوصلے سے زیادہ بنے سنورے پوشاکیں پہنے۔ عطروں میں بسے۔ گلوریاں منہہ میں دبائے اُدھر سے اِدھر اِدھر سے اُدھر گشت لگا رہے ہیں۔

دفعتاً ایسے سُروں میں شہنائی کی آوازیں آنے لگیں۔ تسلسل ٹوٹا پھول والوں کا پنکھا لدا پھندا ہوا کو مہکاتا جوبن میں تُلتا سامنے سے آیا۔ غول کا غول بڑھا۔ تماشائیوں نے مڑ مڑ کے دیکھنا شروع کیا۔ بالا خانوں پر پتّا پتّا متوجہ ہو گیا۔ جگہ جگہ نظریں پڑنے لگیں۔ رنگین آنچل ہوا میں لہرائے۔ نگاہیں جھکیں اور نفیری کے دلکش زمزموں نے گردنیں ہلا دیں۔ یہ میلہ شاہی میلہ ہے۔ وہ زمانہ اور اس کا شباب تو ہمیں نصیب کہاں ہوا لیکن ہاں آجکل بھی جیسا ہوتا ہے وہ دُور دُور نہیں ہوتا بلکہ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ دُنیا کے پردے پر ایسا اُجلا میلہ شائد ہی کہیں ہوتا ہو۔ انسانوں کے مذاق مختلف ہیں۔ اس کا تو کوئی ذکر ہی نہیں لیکن ایسا موسم۔ ایسا سما۔ ایسے لوگ۔ ایسے سامان۔ ایسی زمین پر جمع ہو جانے نہایت ہی مشکل ہیں۔ او ہو ہو! وُہ پنکھا آگے بڑھا وہ خلقت ٹوٹی وُہ تماشائیوں کا ہجوم اُسے اپنے حلقے میں لئے چلا۔ وہ پھوار پڑی۔ وُہ بجلی چمکی۔ نم آلود ہواؤں نے لیا اور وہ نفیری کے میٹھے سُر اس ٹھنڈک میں دلوں کی کلیاں کھلا گئے۔ اب جگہ جگہ یہ پنکھا ٹھہرتا جاتا ہے۔ بالاخانوں پر۔ دوکانوں پر لوگ اس عالم کو خوش ہو ہو کے دیکھتے جاتے ہیں اور ہنستے جاتے ہیں۔ نفیری والوں کو گوٹہ لگے رنگ برنگ کے ڈوپٹے روپیے اور ریزگاری انعام میں پھنکتی ہے اور کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ ہنس مکھ چہرے۔ شاد شاد صورتیں خوشی بھری آوازیں ہر طرف سے زندہ دلی کا پورا ثبوت دے رہی

ہیں اہا اک عجیب و غریب عالم ہے جو اس وقت اس مقام پر برس رہا ہے۔ ہاں خوب یاد آیا
اس سے ذرا پہلے جہاں جھرنا جھڑتا ہے۔ وہیں موجیں اک وسیع ظرف (تالاب) میں پیچیں
ہوتی ہیں۔ پیراک پیرتے ہیں۔ اُدھر اُوپر سے گدایاں ہوتی ہیں۔ جوان بچے بلکہ بڈھے
بڈھے جانگیے پہنے۔ لنگ باندھے۔ وضع وضع کی تیراکیاں تیرتے ہیں۔ غوطے لگاتے
ہیں کُشتیاں ہوتی ہیں۔ چھینٹے اُڑتے ہیں۔ چہلیں ہوتی ہیں۔ گھنے اور تناور درختوں
میں جھولے پڑتے ہیں۔ پینگیں بڑھائی جاتی ہیں۔ لال۔ سبز۔ پیڑیاں جگمگاتی ہیں۔ ترانے
اُڑتے ہیں۔ ملار الاپتے ہیں۔ اور گویا ان اشیا کی تکرار کرتے ہیں۔

دُعائے باران

سر نہیں اُٹھتا ندامت سے۔ مگر باراں بھیجدے
ہم گنہگاروں پہ بھی [illegible] بھیجدے

پھول بہت کملا چلے ہیں پھر بہت مرجھا گئے
پھر ہمیں سرسبز ہونے کے سامان بھیجدے

تڑپتے ہیں جانور تک اور تپتی ہے زمیں
اپنی اچھی سی جھڑی اے پاک یزداں بھیجدے

گھاس تو اُگتی نہیں غلہ کہاں سے آئیگا
مر ہی جائینگے ہمیں جلدی سے باران بھیجدے

آج ہم آہنگ ہے شاعر کا سارا ملک ہند
ایک بڑا ابر رحمت کا پُر افشاں بھیجدے

آغا شاعر قزلباش دہلوی

مشکل ہے یہ حالتیں سہی جاتی ہیں
پھانسیں ہیں کہ قلب میں رہی جاتی ہیں

تفصیل نہ پوچھ ہیں اشارے کافی
یونہی یہ کہانیاں کہی جاتی ہیں

(اکبر)

دہلی کے مساجد و معابد کی سرگذشت

ہمیشہ سے اکثر قوموں کی یہ دانشمندانہ بزرگ رسم و عادت چلی آتی ہے کہ وہ اپنے گھروں سے علیحدہ اپنے معبود کا گھر بناتے ہیں اسکو مقدس و متبرک جانتے ہیں اور اپنے رب کی اس میں پرستش کرتے ہیں۔ اُن معابد کی شان و شوکت اُنکی قوم کے جاہ و جلال پر دلالت کرتی ہے۔ دُنیا میں جتنی قومیں سربرآوردہ اور صاحبِ اقبال ہوئی ہیں۔ ان کے معابد عظیم الشان و رفیع المکان مدتوں سے یادگارِ روزگار چلے آتے ہیں۔ ہر معبد اپنی قوم کی تاریخ کا مفسر و مطبع (پریس) ہے جو اس کے حالات کی تفسیر کرتا ہے اور آئینہ کی طرح خیالات کو دکھاتا ہے۔ جتنی طرح کے مذاہب ہیں اتنی طرح کے معابد ہیں۔ اُن میں باہم تداخل نہیں ہوتا مگر مآل سب کا ایک ہی ہوتا ہے کہ خیالاتِ مذہبی پیدا کرنے کے وہ آلہ اور موصل ہوتے ہیں۔ اور آخر کو یہی خیالات لیلیٰ سے زیادہ حسین مجنوں بنجاتے ہیں۔

ہر قوم اپنے معابد کو ایسی رونق دیتی ہے کہ وہ مرجع خلایق بنیں اور اُن سے اسکی [illegible] ہو۔ سوائے اسلام کے اور اکثر اہلِ مذاہب موسیقی کو سب سے بڑا عطیۂ الٰہی انسان کے لئے سمجھتے ہیں۔ اس کے آلات و مزامیر کو معابد میں بجاتے ہیں اور ان میں ستایشِ ایزدی کے بھجن گواتے ہیں۔ بے اختیار لوگ اُنکے سُننے کو آتے ہیں اور سُنکر اپنے معبود کی [illegible] میں محو و مست ہوجاتے ہیں۔ ان میں خدا کی پیکرِ عنصری سیم و زر کی اپنے دماغ و ہاتھ سے تراش کر ایسی رکھتے ہیں۔ کہ آدمیوں کو ان میں اپنے معبود کا جلوہ نظر آتا ہے [illegible] وہ انکی پرستش میں دل و جان سے مصروف ہوتے ہیں۔ شبیہہ کشی اور مصوری سے معابد کو ایسا آراستہ کرتے ہیں کہ اُن کے نقش و نگار ہزاروں دلوں کو ہندو اندر زسکھ نے

لئے الفاظ کا کام دیتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے برخلاف اور قوموں کے موسیقی و بتوں و تصاویر کو اپنی مساجد سے دور رکھا۔ انہوں نے پتھروں سے بت نہیں تراشے بلکہ انکی عمارتیں ایسی بنائیں کہ وہ آدمیوں کی دلکشی میں بتوں پر سبقت لے گئیں۔ انہوں نے موسیقی کو مساجد میں نہیں آنے دیا مگر اس سے زیادہ کلام الٰہی کی قرأت سے دلوں پر اثر پیدا کرنے کا کام لیا۔ شبیہ کشی اور تصاویر سے مساجد کو زیب و زینت نہیں دی مگر ان کی عمارتوں میں میناکاری و پچیکاری سے وہ پھول بوٹے اور بیل و پتے بنائے اور محرابوں پر آیتیں ایسی خوشخط لکھیں کہ جنہوں نے تصاویر کو مات کیا۔

آفتاب اسلام کی اخوت و وحدت کی شعاعوں کی اشاعت کے لئے مسجد جائے ہے جانہ آفتاب سے روشن ہوتا ہے اس کے بغیر تاریک ونکما ہے ایسی ہی مساجد اسلام بغیر اینٹ پتھر چونے کا ڈھیر ہیں۔ مسلمانوں میں آفتاب اسلام کی حرارت کو مساجد ہی پھیلاتی ہیں کہ وہ پانچ وقت نماز میں بھائیوں کی طرح آپس میں ملکر اپنے خدائے واحد کی بڑی خضوع و خشوع کے ساتھ عبادت کرتے ہیں اور اپنی اخوت اور خدا کی وحدت کی پانچ وقت نوبت بجاتے ہیں۔ اس بیان سے مسلمانوں کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ مساجد انپر کیا اثر کرتی ہیں۔

اب ہم دلی کی مساجد کی سرگذشت لکھتے ہیں کہ غدر سے پہلے انکا حال کیا تھا اور اب کیا ہے۔

جامع مسجد[ل] دہلی

اَحَبُّ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰہِ مَسَاجِدُھَا

شاہجہان نے اپنے شہر شاہجہان آباد کے وسط میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر

[ل] اسکو مسجد جامع و جمعہ مسجد بھی کہتے ہیں لیکن مسجد جہاں نما کہنے والے نہیں رہے ۱۲

۱۰۶۰ھ / ۱۶۵۰ء میں اس مسجد کی بنیاد رکھوائی اور چھ سال کے اندر دس لاکھ روپیہ میں وہ ایسی تعمیر ہوئی کہ کوئی در و دیوار طاق و محراب مرغول و کنگورہ تناسب سے خالی نہیں۔ کوئی ایسی خوش قطع اور خوش نما مسجد روئے زمین پر نہیں ویسی متناسب الاجزا ہو۔ مسجد کوہ اساس ہونے کے سبب سے آفت زمین زلزلہ سے ہمیشہ محفوظ رہی۔ مگر آفت آسمانی اور فرسودگی روزگار کے ہاتھ سے نہ بچ سکی ۱۸۱۷ء میں اس کا شمالی مینار بجلی سے گرا اور صحن کا فرش بھی جابجا سے شکستہ ہوکر اونچا نیچا ہوکر بگڑا تو سرکار انگریزی نے بہت روپیہ خرچ کرکے اسکی مرمت خوب کرادی ۱۸۴۲ء میں شمالی دیوار کی باہر کیطرف کی سلیں گریں تو بہادر شاہ بادشاہ دہلی نے سلوں کو پھر لگوا دیا۔ بادشاہ کی طرف سے ہمیشہ اس کی چھوٹی چھوٹی مرمتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ہر سال برجوں کی دھنپر گھاس پھوس اگ آتے تھے اسکی حجامت ہوتی تھی۔ جو لڑکوں کا ایک تماشا ہوتا تھا کہ کاریگر برجوں کی ڈھلان پر گھاس کاٹ رہے ہیں۔ ۱۸۷۵ء میں شمالی برج کلان کے نیچے کی درجھنیوں میں شکستگی نمایاں ہوئی تو شیخ الٰہی بخش رئیس میرٹھ اور حاجی قطب الدین پنجابی سوداگر نے اس زر وقف سے مرمت کرادی جو انکے پاس محمد شفیع گماشتہ کمسریٹ کا جمع تھا۔ اگرچہ صحیح نہیں معلوم کہ کتنا روپیہ اس میں صرف ہوا تھا مگر مشہور ہے کہ بیس پچیس ہزار روپیہ خرچ ہوا۔ جو ظاہرا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

مسجد کی عمر ڈھائی سو برس کی ہوگئی تھی۔ بڑھاپا اس کی صورت پر برستا تھا۔ فرسودگی و کہنگی و شکستگی کے آثار نمودار تھے۔ چھت کے پتھروں کے کھپر بجا کرتے تھے۔ سنگ سرخ و سنگ مرمر و موسیٰ کی پچی کاریاں جابجا سے اکھڑ اکھڑ گئی تھیں۔ پتھروں میں جو جوڑ لوہے کے لگے تھے وہ لوہے کے زنگ آلود ہونے سے اور اس کے گرمی دھوپ کے اثروں کے قبول کرنے سے ڈھیلے ہوگئے تھے۔ اور ان پیوندوں کے پاس پتھر شکستہ ہوکر چیدا ہوگئے تھے۔ اخبار نویسوں نے اس مسجد کا یہ حال زار دیکھ کر دہائی

جاتی ہر مسلمان اس کی مرمت کرائیں۔ نہیں یہ مسجد عدیم المثال عنقریب کھنڈر ہو جائیگی تو مسلمانوں کی ناک کٹ جائیگی۔ خدا تعالیٰ نے اس کی مرمت کے لیے نواب کلب علی خاں والیٔ ریاست رام پور بالقابہ کو دوسرا شاہجہان پیدا کر دیا۔ کہ اس نے انجمن اسلامیہ دہلی سے اس مسجد کا تخمینہ طلب کیا۔ اس انجمن کے صدر انجمن میرزا سلیمان جاہ تھے جو شاہجہان کی اولاد میں تھے۔ انہوں نے اس مسجد کی مرمت کا تخمینہ ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ ایسا کیا کہ اگر اس کے موافق روپیہ ملجائے تو ان کے جد امجد کی مسجد از سر نو نئی ہو جاتے اور آئندہ پھر کسی کے آگے اس کی مرمت کے کے لیے دست گدائی نہ پھیلانا پڑے۔ اس دریا دل نواب نے اس تخمینہ کے موافق آخر ۱۸۸۶ء میں گورنمنٹ پنجاب کو ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ تفویض کیا جس کی یہ شرائط مشہور ہیں کہ یہ روپیہ بنک میں سود پر جمع نہ کیا جائے۔ اس شرط سے گو پچاس ساٹھ ہزار روپیہ سود کا نقصان ہوا مگر بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اگر یہ سود کا روپیہ مسجد کی مرمت میں لگتا تو مسلمانوں کو اس میں نماز پڑھنے میں کلام ہوتا۔ دوسرے شرط یہ تھی کہ گورنمنٹ کے محکمہ انجنیرنگ کی معرفت اس کی مرمت نہ ہو بلکہ وہ انجمن اسلامیہ کی معرفت ہو اور سکی نگرانی ڈپٹی کمشنر دہلی فرمائیں۔ چنانچہ ان ہی شرائط کے موافق مرمت ۲- جون ۱۸۸۷ء سے شروع ہوئی اور ۲- اگست ۱۸۹۰ء میں ختم ہوئی۔ شاہجہان نے تو اس مسجد کی تعمیر میں دس لاکھ روپے خرچ کیے۔ نواب کلب علی خاں نے مرمت میں اس کے چھٹے حصے سے کچھ ہی کم روپے لگائے۔ ان دونوں کے مقدوروں میں ایک اور ڈھائی سو کی نسبت تھی مگر ان کے عطیات میں ایک اور چھ کی نسبت ہوئی۔ جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ نواب اس کار سخاوت میں شاہجہان پر سبقت لیگیا۔ شاہجہان پر تو دلوبارہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس نے خانۂ خدا پر اپنے رہنے کے محلوں کو ترجیح دی کہ ایک میں دس لاکھ روپیے اور دوسرے میں ایک کروڑ روپے سے زیادہ صرف کیے۔ مگر نواب پر یہ الزام

نہیں لگایا جا سکتا - کیونکہ اُس نے تو خانہ خدا کو اپنے محل پر ترجیح دی -

اتفاق سے ۱۸۹۵ء میں جنوبی مینار پر بجلی گری اور اُس کو شکستہ کیا - نواب بہاولپور نے چودہ ہزار روپیہ اس کی مرمت کے لئے عنایت کیا - اس روپیہ سے یہ تین کام ہوئے :- اوّل مینار کی پوری مرمت ہوئی - دوم دونوں میناروں پر کون ڈکٹر یعنی موصل البرق لگائے گئے جن کے سبب سے بجلی کے گرنے سے میناروں کو نقصان پہنچنے کا احتمال بہت کم ہو گیا - سوم جامع مسجد کی تینوں طرف کی سیڑھیوں کے نیچے پتھر کا پختہ فرش بنگیا جس کے سبب سے نمازیوں کی وہ تکلیف مسجد میں جانے کی رفع ہو گئی جو یہاں برسات میں پانی کے بھرنے اور کیچڑ کے ہونے سے ہوتی تھی - مگر ایک تکلیف نمازیوں کو مسجد کے سنگین صحن کے سبب سے ہوتی ہے وہ ہنوز باقی ہے - صحن گرمی میں گرم ایسا ہوتا ہے کہ جمعہ و ظہر کی نماز میں نمازیوں کے پاؤں کو بھرتہ بناتا ہے اور جاڑے میں سرد ایسا ہوتا ہے کہ پیروں کو برف بناتا ہے گرچہ اس تکلیف سے بچنے کے لئے صحن میں ٹاٹ کی پٹیاں پتھروں کے نیچے دبائی جاتی ہیں بعض نمازی پاتابہ وغیرہ پہن کر جاتے ہیں - مگر یہ بھی تکلیف رفع نہیں ہوتی - گرمی جاڑے میں یہ تکلیف ہے برسات میں اور تکلیف ہے کہ صدر دالانوں کے در بڑے بڑے کشادہ اور صحن کے چاروں طرف کے دالانوں کے در کھلے ہوئے ہیں - مینہ کی بوچھاڑ کا تدارک تو نہیں - اس سے دالانوں کے فرش پانی سے تر بتر ہو جاتے ہیں - کبھی کبھی نمازیوں کے کپڑے نماز میں گیلے ہو جاتے ہیں - غرض اس مسجد کی تعمیر میں جیسا مرمت پر خیال کیا گیا ہے نمازیوں کی راحت اور آرام پر نہیں خیال کیا گیا -

حوض مسجدِ جامع

اس مسجد کے دل کشا و فرحت بخش صحن کے بیچوں بیچ میں بڑا روح افزا اور دل ربا زرے سنگِ مرمر کا حوض پندرہ گز سے بارہ گز ہے - اس میں جمعہ و عیدین و الوداع کی نمازوں میں

فوارہ چھوٹتا تھا اس حوض کے غربی گوشہ میں ایک چھوٹا سا کٹہرہ سنگ مرمر کا لگا ہوا ہے جس سے عام لوگ یہ جانتے تھے کہ بادشاہ نے اس لئے بنا دیا ہے کہ اس میں بیٹھ کر حوض کے پانی سے وضو کرے مگر سرسید کی آثار الصنادید میں لکھا ہے کہ ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء میں اسکو محمد تحسین خان علی بادشاہ نے یہ بات بیان کرکے بنایا ہے کہ میں نے جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں اس جگہ بیٹھے دیکھا ہے۔

اس حوض میں پانی رہٹھ کے کنوئیں سے آتا ہے جو اس مسجد سے باہر کچھ فاصلہ پر شمالی مغربی جانب میں ہے۔ کنوئیں کے اوپر بہت بلندی پر چار حوض بنے ہوئے تھے۔ بیل رہٹھ چلاتے تھے جس سے کنوئیں کا پانی ان حوضوں میں پُر ہوتا تھا اور یہاں سے زمین دوز کلی نلوں کے ذریعے سے مسجد کے حوض میں پانی آتا تھا۔ یہ پانی کھاری تھا۔ اس کے میٹھا بنانے کے لئے غدر سے پہلے یہ ترکیب کی گئی کہ ایک زمین دوز نالی کے ذریعہ سے لال ڈگی کا پانی اس کنوئیں میں ڈالا گیا تھا جس سے دونو کنوئیں اور حوض میٹھے ہو گئے تھے۔ مگر برسات میں اور موریاں اس نالی میں مل گئیں جن کے سبب سے دونو کنوئیں اور حوض کا پانی سڑ گیا اور اس میں کیڑے پڑ گئے۔ اس لئے نالی بند کر دی گئی پھر پانی کھاری ہو گیا۔ اب رہٹھ نہیں چلتا۔ نل کا پانی اس کے حوضوں میں ڈالا گیا ہے۔ وہ شاہجہانی نلوں کے ذریعہ سے مسجد میں حوض کے اندر آتا ہے۔ یوں حوض میٹھا ہو گیا ہے۔

اگر عصر و مغرب کے درمیان اس حوض پر بیٹھ کر سیر کیجئے تو عجب قدرتِ الٰہی کا جلوہ نظر آتا ہے کہ عالی شان عمارت میں لوگ خدا کے آگے رکوع و سجدہ کر رہے ہیں بعض بزرگانِ دین مسلمانوں کو وعظ و پند کر رہے ہوتے ہیں۔ کہیں ثقہ مقطع نمازی بیٹھے ہوئے بجیب گپیں گھڑ گھڑ کے اُڑا رہے ہیں۔ اور اس حکم پر کچھ خیال نہیں کرتے کہ مسجد میں سوائے ذکر الٰہی کے اور باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ گپیں بڑی مزہ دار ہوتی تھیں۔

اس حوض کا پانی جو وضو کا موریوں کے اندر ہوکر مسجد سے باہر شمال کی جانب حوض میں جو چبوترہ میں بنا ہوا تھا گرتا تھا۔ اسکو ہندو مسلمان کھجلی کے لئے اکسیر سمجھتے تھے۔ اس مرض کے مریض یا مسجد کے پرنالہ کے نیچے بیٹھ کر نہاتے تھے یا برتنوں میں پانی بھر کر نہانے کے لئے گھر لے جاتے تھے۔ اس سے بہت آدمی اچھے ہو جاتے تھے۔ معلوم نہیں کہ یہ اعتقادی علاج تھا یا واقعی۔

مسجد جامع میں رمضان و الوداع

رمضان المبارک میں یہ مسجد عبادت الٰہی کی بڑی جلوہ گاہ ہوتی تھی اور گلشن اسلام کی بہار دکھاتی تھی۔ اس کے دالانوں میں زاہد عابد اعتکاف نشین ہوتے تھے۔ نماز کی جماعتیں بھی رمضان کے نمازیوں کے سبب سے خوب بھرتی تھیں۔ روزہ کھلنے سے کچھ دیر پہلے بادشاہ کی طرف سے روزہ کی افطاری کے واسطے چھوارے اور کونڈوں میں چنے کی دال مزیدار چٹ پٹی روزہ داروں میں تقسیم ہوتی تھی۔ دربان چھواروں کی تھیلیاں اور دال کے کونڈے کندھوں پر لئے ہوئے سارے صحن میں پھرتے تھے اور روزہ دار لڑکے اُن کے گرد دوڑتے پھرتے تھے اور چالاک لڑکے دال اور چھوارے کئی کئی دفعہ لے لیتے تھے۔ اور امرا کی طرف سے بھی مسجد میں افطاری آتی تھی۔ اس مسجد میں اور مسجدوں کی طرح مُلّا نے نہیں رہتے تھے کہ اُن کے واسطے کھانا آتا۔ جیسا اس مسجد میں الوداع کے جمعہ میں نمازیوں کی کثرت ہوتی ہے ایسے کل ہندوستان میں کسی مسجد میں کہیں اور نہیں ہوتی۔ آس پاس کے دس بیس کوس سے بہت مسلمان نماز پڑھنے آتے ہیں۔ ساری مسجد اور اس کی سیڑھیاں اور چبوترے نمازیوں سے بھر جاتے ہیں۔ نمازیوں کو نماز پڑھنے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ وہ اور مسجدوں میں نماز پڑھنے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ مشرقی دروازہ کلاں کے دریچے میں کرسیوں پر

انگریزی حکام اور بعض میمیں بیٹھ کر سیر کرتی ہیں۔ انگلستان کے ایک عالم متبحر سر ولیم میونیر ہندوستان کی سیر کو آئے تھے اور وہ اس مسجد میں الوداع کی نماز بھی دیکھنے آئے وہ لکھتے ہیں کہ میں اس نماز کو دیکھ کر متحیر ہوگیا کہ مسلمان کس خضوع و التجا و ادب و تعظیم سے اپنے خدا کی عبادت کرتے ہیں کہ ساری مسجد ہزاروں نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ مگر ایک عالم خاموشی طاری تھا کہ سوائے اللہ اکبر لک الحمد کی آواز کے کوئی صدا نہیں آتی تھی۔ اس نماز کو دیکھ کر میرا بے اختیار دل چاہتا تھا کہ مسلمان نمازیوں کی صف میں ملکر اپنی نماز پڑھنے لگوں۔ غدر سے پہلے اس میں بادشاہ کے آنے سے بڑی رونق ہوجاتی تھی۔ اور امراء کی سواریوں کے ہاتھی گھوڑوں کا مسجد کے گرد ہجوم ہوتا تھا اب یہ بات نہیں رہی۔ مگر غریب مسلمانوں کا ہجوم پہلے سے زیادہ ہوتا ہے شہر والوں نے یہ ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے جو اس سے پہلے نہ تھا کہ مسجد کے گرد کے بازاروں میں دیگوں دیگچوں و مٹکوں ٹھلیوں میں پانی بھر کے ان کے پاس بدھنیاں رکھ دیتے ہیں۔ جاڑے میں پانی گرم کر دیتے ہیں جس سے وضو کرنے میں نمازیوں کو آسانی ہوتی ہے۔ مسجد میں حوض پر جاکر دھکا پیل کرنی نہیں پڑتی۔ پہلے مسجد میں حمام کا انتظام وضو کے پانی کے لئے نہ تھا۔ جو اب ہوگیا ہے۔ اور دالانوں کے آگے کپڑے کے سائبان لگا دیتے ہیں کہ نمازیوں کو دھوپ سے تکلیف نہیں ہوتی۔

جامع مسجد میں جھاڑوں اور فانوسوں کا لگنا

غدر سے پہلے حاجی قطب الدین پنجابی سوداگر نے اس مسجد کے صدر دالانوں میں جھاڑ فانوس لگوائے جس پر بعض مولویوں نے غل مچایا کہ یہ بدعت ہے۔ مگر جب انکو یہ معلوم ہوا کہ مسجد نبوی میں مدینہ میں بھی یہ جھاڑ فانوس لگے ہوئے ہیں تو مولویوں نے خاموشی اختیار کی۔ غدر میں یہ روشنی کا سب سامان غارت ہوگیا۔ مگر اس کے بعد اب اور زیادہ روشنی کا سامان مسجد کے لئے مہیا ہوگیا ہے۔	(باقی آئندہ)

میر انیس[1]

مغربی نقادوں میں عموماً رسم ہے کہ کسی شخص کے کلام کا موازنہ کرنے سے پہلے اُس کی سوانح عمری پر ایک سرسری نظر ڈال لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کے تذکرہ نویس بالعموم شعرا کے حالاتِ زندگی سے بالکل قطع نظر کرتے رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی شاعر کا تذکرہ پڑھنے کے بعد اُس کی شخصیت کی نسبت سوائے نام اور تخلص اور چند متفرق واقعات کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ ایسا کرنا اگر مستحسن نہیں تو خالی از فائدہ بھی نہیں۔ کیونکہ دنیا کو مشاہیر کے نام کی نسبت اُن کے کام سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ اور اسی اصول کو مدنظر رکھ کر اس مختصر نوٹ میں ہم زیادہ میر انیس کے کلام سے واسطہ رکھینگے۔

اُن کی ذات و خاندان کی بابت صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ اُن کا نام میر ببر علی تھا۔ اور میر حسن جن کی مثنوی سحر البیان اپنی سلاست زبان کی وجہ سے آج تک مقبولِ ہر خاص و عام ہے۔ اُن کے جدّ امجد تھے۔ اس طرح پر میر انیس کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ اور ان کا خاندان شاعرانہ اردو ادب کی تاریخ میں اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اس کے حصے میں پانچ پشت تک شاعری کی دولت رہی ہے۔ جیسا کہ ناظرین پر واضح ہو گیا ہوگا۔ میر انیس کا خاندان شاہجہان آباد کی خاک پاک سے نسبت رکھتا

[1] ہم مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی [illegible] کے ممنون ہیں کہ اُنہوں نے میر انیس مرحوم کی تصویر جو اس ماہ کے مخزن کے ساتھ [illegible] ہے شائع کرنے کے لئے نہ صرف ہمیں اجازت دی۔ بلکہ اُسے ہمیں عنا

لیکن نامساعدتِ زمانہ نے میر حسن کو مجبور کیا کہ لکھنؤ میں بود و باش اختیار کریں۔ میر انیس
کی پیدائش و پرورش اسی مردم خیز شہر میں ہوئی۔ اور یہ کہنا بیجا نہیں کہ لکھنؤ نے میر انیس
کو مرثیہ گو بنا دیا۔

مرثیہ گوئی کا رواج تو ایرانیوں کی تقلید کی وجہ سے اُردو شاعری کی ابتدائی حالت
ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ سودا کے کلیات میں بھی چند مراثی پائے جاتے ہیں
جو چنداں اعلیٰ پائے کے نہیں۔ اور اس شاعر کے کلام کا شاید سب سے کم قابلِ قدر
حصہ ہیں۔ لیکن انیس و دبیر کے زمانے تک مرثیہ گوئی شاعری کی نہایت ضعیف صنف
تصور کی جاتی تھی۔ اور مرثیہ گو کو بالعموم دیگر شعرا [illegible] بگڑے شاعر کے لقب سے یاد
کرتے تھے۔ انیس و دبیر کی خدا داد ذہانت نے مرثیہ گوئی کو اس معراجِ کمال پر پہنچا دیا
جس پر کہ آج ہم اُسے پاتے ہیں اور مرثیے کی زمین کو اس قدر رفعت دی کہ ہمسرِ آسمان
بنا دیا۔

ہمارا خیال ہے کہ خود مرثیہ میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ کسی صاحبِ کمال کے ہاتھوں
میں فروغ پا جائے۔ شاعری کے لیے اثر کا ہونا ضروری ہے اور ہماری شاعری کے
اصناف میں کوئی صنف اس قدر موثر نہیں جیسا کہ مرثیہ کیونکہ اثر کے لیے صداقت
لازمی ہے۔ اور مرثیہ ہی ایک ایسی شے ہے کہ جس میں شاعر جو کچھ قلم سے لکھتا ہے
سچے دل سے اپنا دین و ایمان سمجھتا ہے۔ پھر ممکن نہیں کہ اثر پیدا نہ ہو۔ علاوہ
بریں مرثیے کو اُردو شاعری کی دیگر شاخوں پر ایک اور بھی فوقیت حاصل ہے وہ یہ
کہ اس کا مقصد نہایت اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس کا منشا ان جذبات کو اُبھارنا ہے جو
انسان کی [illegible] یعنی روحانی خصلت سے تعلق رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے غزل گو شعرا
[illegible] سے اکثر شعرا کی توجہ مبذول رہی ہے اور جس پر اوائل عمر میں خود انیس
نے بھی قدرت حاصل کر لی تھی۔ بالعموم طبع انسانی کی سب سے ادنیٰ خواہشات [illegible]

کو اکساتی ہے۔

مندرجۂ بالا سطور سے واضح ہوگیا ہوگا کہ انیس کا پایۂ شاعری کس قدر بلند ہونا چاہیے۔ مزید براں ان کی زبان کی صفائی۔ خیالات کی نفاست و نزاکت انکو اور بھی کامیاب بناتی ہے۔ لکھنؤ کی صحبتوں نے انیس کو بلاغت سکھائی۔ لیکن ناسخ کی طرح بلاغت کے ساتھ اس فصاحت کو ہاتھ سے نہیں دیا جو دہلی کے ساتھ دور کی نسبت ہونے کی وجہ سے انہیں حاصل تھی۔ لکھنؤ میں رہکر عمر بھر دہلی کا روزمرہ استعمال کرتے رہے۔ اور جب کبھی کسی غیر مانوس ترکیب و محاورے کو استعمال کرتے تھے تو فوراً بلا تامل کہدیتے تھے کہ اہل لکھنؤ اسے پسند کریں یا نہ کریں مگر احقر کے شہر اور گھرانے میں اسی طرح بولتے ہیں[۵۱] امر واقعی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ لکھنؤ کی زبان جو تکلفات و تصنع سے پُر ہے کبھی دہلی کی سادہ و شیریں زبان کے برابر موثر نہیں ہوسکتی[۵۲]

انیس کی شاعری میں علاوہ صداقت و اثر کے شاعری کے دیگر لوازمات تمام و کمال پائے جاتے ہیں۔ تشبیہہ و استعارے کے وہ بادشاہ ہیں۔ اور کبھی تشبیہہ کے معاملے میں اپنے طبقے کے دیگر شعرا کی تقلید میں صحت مذاق کا خون نہیں کرتے۔ بلکہ غیر معمولی نازک خیالی و حسن بیان کا ثبوت دیتے ہیں۔ کسی خوبصورت نوجوان کے رُخ پر سبزۂ آغاز ہوتے دیکھ کر اس سے بہتر کیا تشبیہہ سوجھ سکتی ہے کہ ع

دیکھو نئی بہار کہ سبزہ ہے پھول پر

---

[۵۱] ملاحظہ ہو آبحیات مصنفہ شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد ۱۲

[۵۲] شمس العلما مولوی سید علی صاحب بلگرامی جیسے اہل الرائے نے باوجود دہلی سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنے کے اس شہر کی زبان کو صفائی و شیرینی کے لحاظ سے لکھنؤ کی زبان سے بہتر قرار دیا ہے ملاحظہ ہو دیباچہ تمدن عرب ۱۲

یا اس سے بہتر کیا مطالعہ فطرت کا ثبوت ہوگا۔ کہ خزاں کے موسم میں درختوں کے پتوں کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی جائے۔ ع

پتے برنگِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

غرضکہ اس قسم کی نازک خیالی کی مثالیں انیس کے کلام میں سے سینکڑوں کیا بلکہ ہزاروں دی جا سکتی ہیں۔ نازک خیالی اُن کا خاص جوہر تھا۔ ورنہ انصاف کی بات یہ ہے کہ زور و شکوہ الفاظ میں ان کے ہمعصر مرزا دبیر بازی لے گئے ہیں۔ مگر کہاں بلبل کا نغمہ اور کہاں شیر کی گرج۔ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ لاجواب ہیں لیکن شاعری کے لئے تو کچھ اوّل الذکر ہی زیادہ موزون معلوم ہوتی ہے۔

انیس کی غزل گوئی کی طرف ہم پیشتر اشارہ کر چکے ہیں۔ صرف اس قدر اور کہہ دینا کافی ہے کہ انیس کی جو غزلیات ہم تک پہنچی ہیں۔ وہ نہایت قابلِ قدر ہیں لیکن ہم انیس کو بہت اعلیٰ پایہ کا غزل گو ماننے پر تیار نہیں۔ اُس وقت لکھنؤ میں غزلگوئی کا مرض عام تھا اور ہر ایک موزون طبیعت و رنگین مزاج نوجوان اس میدان میں طبع آزمائی کیا کرتا تھا۔ مشاعروں کی قدردانی و داد اس شوق کو اور بھی بڑھا دیتی تھی۔ اور بڑھی ہوئی مشق کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ ہر ایک شاعر و متشاعر کے کلام میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور پیدا ہو جاتی تھی۔ انیس کی غزلیات بھی خوبی سے خالی نہیں۔ لیکن بحیثیتِ غزلگوئی کے وُہ دُوسرے اساتذہ کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ غزلگوئی کی طرف توجہ کرتے تو دیگر شعراء سے اس میدان میں بھی گو سبقت لیجاتے۔ بدقسمتی سے اب اس خیال کی تصدیق ہونی محال ہے۔ تاہم ہم اتنا کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ ہر ایک شخص ایک خاص کام کے لئے وضع کیا جاتا ہے انیس کا کام فطرتاً مرثیہ کو فروغ دینا تھا۔ اور اس کام کو اُنہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے پورا کیا +

(ایڈیٹر)

فضائے برشگال اور پروفیسر اقبال

اُٹھا وہ جھوم کے ساقی چمن میں ابرِ بہار
چٹک رہے ہیں شگوفے۔ برس رہی ہے پھوار

یہی تیدوں کا ہے جھگھٹ کنارِ آبِ رواں
کہ برج میں لبِ جمنا ہے گوپیوں کی قطار

ترانہ ریز ہے یوں شاخِ سرو پر قمری
کہ جیسے گاتی ہو مدھ بن میں کوئی سندر نار

کلی کلی نے نکالا ہے روپ یوں۔ جیسے
کسی کے سینے پہ کم کم شباب کا ہو اُبھار

حنائی پنجہ ہے یوں شاخ شاخ لالہ و گل
نئی دلہن کی ہوں جیسے ہتھیلیاں گلنار

ہے موتیوں کی لڑی۔ یا قطار بگلوں کی
ہوا میں اُڑتے ہیں جگنو۔ کہ چھوٹتے ہیں انار

عجب نشاط ہے۔ بادہ کشو! چلو تو سہی
پیامِ عیش ہے لایا چمن میں ابرِ بہار

پلا شراب کہ ہیں مغتنم یہ دن ساقی
کہاں یہ سبزہ و گل۔ پھر کہاں یہ صحبتِ یار

بہار آ کے شگفتہ ہوئے گلِ پنجاب
چہک چہک! کہ کدھر تو ہے بلبلِ پنجاب

ترانۂ لبِ شیریں نوا کے دن آئے
غزل سرا ہو کہ شیریں صدا کے دن آئے

عروسِ نظم نے کاجل لگایا آنکھوں میں
فسونِ عشوہ و ناز و ادا کے دن آئے

دھر بھی کوئی ایاغِ مئے سخن ساقی
اُٹھے وہ جھوم کے بادل۔ گھٹا کے دن آئے

شباب جوش پہ آیا۔ پری جمالوں کا
بڑھی نگاہ میں مستی۔ حیا کے دن آئے

بتوں نے ہاتھوں میں مہندی لگائی ساون کی
شہید چونک اُٹھے۔ خوں بہا کے دن آئے

نسیم جھوم کے کہتی ہے منہ شگوفوں کا
[illegible] تبسم فزا کے دن آئے

چلو شراب کی بوتل کوئی بھرا لائیں
سرود۔ دعوتِ آب و ہوا کے دن آئے

ترانہ سنج ہو اے بلبلِ ریاضِ سخن
کہاں ہے تو کہ چمن میں نغمہ کے دن آئے

ترے بغیر ہیں مرغانِ نغمہ زن خاموش
ترے بغیر ہے یاروں کی انجمن خاموش

کلامِ اکبر

یہ کس سے سیکھا ہے تیری آنکھوں نے اس ادا کی نگاہ کرنا
بنا کے دیں کو خراب کرنا دلوں کو اتنا تباہ کرنا

وفا کے وعدے سے چشم پوشی ہمیشہ شام و پگاہ کرنا
حضور نے کیا ثواب سمجھا ہے منتظر کو تباہ کرنا

نئی ادا یہ نہیں فلک کی سدا سے اس کا یہی ہے شیوہ
کسی کو حسرت سے یوں بڑھانا کسی کو بالکل تباہ کرنا

اگرچہ تسکینِ طبعِ ملت ہے حُبِ قومی میں آہ کرنا
مفید تو ہے مگر دلوں کو ضرور شوقِ ادا کرنا

کہیں گے نعرہ [illegible] ذات پر ہوش ان [illegible] تا تو
بتوں کے آگے ہے سخت مشکل خدا کو اپنا گواہ کرنا

کہا جو میں نے نہ توڑ دل کو تجھے مناسب ہے دلنوازی
تو ہنس کے بولا کہ سہل ہوگا دلِ شکستہ میں راہ کرنا

جہانِ صورت کا ذرہ ذرہ جمالِ معنی کا آئینہ ہے
مگر انہیں کو جو دیکھتے ہیں جو جانتے ہیں نگاہ کرنا

کہے کوئی شیخ سے یہ جا کر کہ دیکھئے آ کے بزمِ سید
یہ رونق اور یہ چہل پہل ہو تو کیا برا ہے گناہ کرنا

وہ دورِ چرخ آرہا ہے اکبر کہ اہلِ تقویٰ ہیں زار و مضطر
بزرگ بھی طفلِ دل کو اپنے سکھا رہے ہیں گناہ کرنا

هوائے دنیا بدل گئی ہے سرورِ روح آجکل نہیں ہے
علوم کے باغ گو کھلے ہیں وہ بوئے رازِ ازل نہیں ہے
نظر کو حیرت میں کر سکتا نہ دل منور نہ روح شاداں
فروغِ زورِ عمل بہت ہے ظہورِ حسنِ عمل نہیں ہے
نقوشِ صورت سے یہ اشارے کہ جنسِ ظاہر میں ہیں اُلجھے
خیالِ معنی یہ کہہ کے رخصت کہ جوشِ دل کا محل نہیں ہے

عجب سماں ہے اس انجمن کا حواس اکبر ہیں کشمکش میں
بیانِ غم غیر مستند ہے خوشی کا کوئی محل نہیں ہے

قلم کی تعریف

صد آفریں قلم کو جس نے کتاب لکھی
فصلوں کے باب باندھے تفصیلِ باب لکھی

اجسامِ بندگی میں روحِ ثواب پھونکی
اقلیمِ معصیت میں رسمِ عذاب لکھی

لکھی مبالغے سے گہ بزم و رزمِ رستم
گہ رزم و بزمِ پورِ افراسیاب لکھی

اس طور پہ کہ پڑھ کر ہوں شیخ و شاب راضی
پیری کی ہجو لکھی مدحِ شباب لکھی

تصویر آدمی کی تقریر آدمی کی
گاہے بدیر لکھی گاہے شتاب لکھی

وقتِ حجاب دُزدی کاغذ اُٹھا کے چٹھی
لکھی گہ ابتداءً گہ در جواب لکھی

حاصل جو کی عرب میں تائیدِ ابنِ سیریں
اعجازِ یوسفی سے تعبیرِ خواب لکھی

آلاتِ موسیقی کا جس وقت راگ چھیڑا
کھونٹی پہ تانت باندھی شکلِ رباب لکھی

اقوامِ ہندسی کی تعمیمِ منفعت کو — نمبر لگا کر مشقِ حساب لکھی
کی ضبط پہ متانت تقریرِ صوفیانہ — تحریرِ عاشقانہ پر اضطراب لکھی
لکھی سند ورع کو آباد بستی بستی — عبرت کو زاہدوں کی مسجد خراب لکھی
رندانِ عاقبت بیں کی خوش دلی کی خاطر — کوثر کے حاشیے پر مدحِ شراب لکھی
بڑھتی رہے ہمیشہ تا دردِ دل کی وقعت — مدحِ دلِ برشتہ رُو دے کباب لکھی
ہستی کی۔ کی جو ثابت دنیا کی بے ثباتی — اوراقِ زندگی پر موجِ سراب لکھی
گھستی جبیں جہاں ہے جا کر شہنشہی بھی — اللہ کی کچھ ایسی اونچی جناب لکھی
زندہ ہوا اس جہاں کا گریئے سے تا میسّر — تصویرِ حوضِ کوثر چشمِ پر آب لکھی
کی شاہدِ حقیقی کی نقش جب کہ صورت — ذو ازل کے منہ پر زیبا نقاب لکھی
عالم کا نقش کر کے اک زرنگار خیمہ — کیا قوتِ کشش کی محکم طناب لکھی
لکھ کر مکاں زماں کی کوئی نہ حد ستالی — لکھا حساب بے حد حد بے حساب لکھی
تصویرِ خوش نما کی رخشندگی کی کھینچی — رخشندہ مہر و مہ کی زریں رکاب لکھی
ادیانِ مختلف کے جیسے ہیں جھگڑے — مصداقِ قولِ فیصل فصل الخطاب لکھی
مخزن میں ادویہ کے بن کر حکیم نقاد — وصفِ گلاب لکھا مدحِ شداب لکھی
اشعار بھر دیئے گہ دیوان میں رطب یابس — نظمِ گہ بیاضوں میں انتخاب لکھی
شہبانہ سے منگا کر شب کو دوات کاغذ — آپ اپنی مدح لکھی اور لاجواب لکھی

وداعِ روح

اے روحِ پاک راحت اے جانِ زحمت — اے سیرِ گلستان کی بادِ بہار رخصت
اے ہم نشین و ہمدم۔ اے غمگسار رخصت — ہے آج یہ تری انجام کار رخصت

جا۔ اور جاکے کہنا۔ جھوٹا مکان جھوٹا
کہنا کہ دیکھ آئی سارا مکان جھوٹا

جا۔ اور ایک عالم سے کہدے بے تحاشا ہستی میں تن نہیں تھا پانی میں تھا بتاشا
تھا یہ گھڑی میں تولا۔ تھا یہ گھڑی میں ماشا تھی شعبدے کی بازی۔ تھا آگ کا تماشا

کہنا کہ بات سچی لب سے نکالتی ہوں
کہنا کہ منہہ میں جھوٹے کے خاک ڈالتی ہوں

جاہ و حشم سے کہنا ناحق کی ہر جھپک تھی تاریک شب میں گویا جگنو کی اک چمک تھی
کل معبدوں سے کہنا سب ظاہری جھلک تھی بندہ زمین پر تھا۔ حق کی جگہ فلک تھی

کہدیں جو جاہ و معبد ملکر دروغ ہے سب
کہنا دروغ گو کو حاصل فروغ ہے کب

فرماں رواؤں سے کہنا گولا کہ کر دو فر ہے لیکن مدار اُن کا اوروں کی ذات پر ہے
سر پر ہے تاجِ زریں سر کا مگر خطر ہے ایوانِ قیدِ جاں۔ زندان اُنکا گھر ہے

جھوٹا کہیں جو تجھ کو وہ سخت بے ادب ہیں
چل جائے بات جھوٹی۔ جھوٹے کے پاؤں کب ہیں

کہنا ہوسوں سے بحرِ جہاں کے دھارے جو آبدار دیکھے وہ تھے سراب سارے
ہر چند موجِ حیرت میں ہات پاؤں مارے پہنچے نہ جاکے دم بھر تسکین کے کنارے

جھوٹا کہے جو تجھ کو وہ آپ پُرخطا ہے
تو راست باز ہے تو سچے کو آنچ کیا ہے؟

کہنا فراغِ دل سے تجھ کو کہیں نہ پایا کہنا قرارِ جاں سے تو نام کو نہ آیا
مہر و وفا سے کہنا دکھا نہ تیرا سایا اپنے سے جاکے کہنا نکلا وہ کیوں پرایا

دُنیائے دُوں سے کہنا تو گرچہ دلستاں ہو

اے مایۂ لطافت تجھ میں وفا کہاں ہے

حکمت سے جاکے کہنا یہ مال ہے خزانہ — حرفت سے جاکے کہنا یہ شغلہ بہانہ

اہلِ وطن سے کہنا یہ چند یہ زمانہ — تیرِ قضا کا اک دن ہونا ہی ہے نشانہ

اے روح تجھ کو عالم جھوٹا کرے گا بیشک

"جھوٹے کے آگے سچا روسد مریگا" بیشک

دولت سے جاکے کہنا اے کورِ چشم فانی — فطرت سے جاکے کہنا تجھ میں ہے رائیگانی

کہنا یہ دوستی سے ہوتی اگر تو جانی — تو جان ہجے کر بھی کرتا میں میزبانی

کہنا شباب سے کیوں جھوٹا عذاب کرکے

آیا تھا اچھا خاصہ - بھاگا خراب کرکے

کہنا ہنر سے وہ بھی خالی کمال سے ہے — ہر مدے کو کہنا نقص خیال سے ہے

ہے علم سے مقرا - لاعلم حال سے ہے — کوسوں بعید رمزِ حق تعال سے ہے

گر کوئی کہدے مکتب کا راست ہر بیاں ہو

کہنا کہ "جھوٹ کہنے میں صرفہ ہی کہاں ہو"؟

کہنا عقیدے سے اب اسکا نشاں کہاں ہے — دانش پہ آج اپنی بھولا ہوا جہاں ہے

انسانیت سے کہنا اب وہم ہے گماں ہے — کہنا سخا سے مطلب کی ساری داستاں ہے

جھٹلا کے تجھ کو دانش گر کہدے راست میں ہوں

کہنا کہ "جھوٹ بولوں او تیرے منہہ پہ بولوں"؟

دانش سے جاکے کہنا اے فخرِ زندگانی — تو جانتی تھی تیرا کوئی نہیں تھا ثانی

لیکن قضائے مبرم نے جو کہ دل میں ٹھانی — تیری تو کیا فلاطوں کی رائے تک نہ مانی

لاکھوں میں جاکے کہنا اپنا کلام سچا

جھوٹی تمام دنیا صاحب کا نام سچا

عمرِ رواں سے کہنا تجھ میں زوال پایا
نامِ و نشاں سے کہنا تو بے ثبات آیا
کہنا پری وشوں سے جو حسن پر لُبھایا
آخر کو دو ہی دن میں اُس نے فریب کھایا

کہنا کہ امرِ بیجا ہرگز بجا نہ کہنا
کہنے کی بات جو ہو اُسکو بُرا نہ کہنا؟

اے روحِ ہر خلش سے ہر غم سے پاک تھی تو
اِس خاکداں میں آکر ہاں دردناک تھی تو
پابندِ دامِ حرص و اُمید و باک تھی تو
اسیر ہو کے ناحق آلودہ خاک تھی تو

جا اے ہمارے طالب جا سب پیام کہنا
اور آخری ہمارا سب کو سلام کہنا

(سر والٹر رالی) (طالب بنارسی)

صُبحِ صادق

اُلٹا دیکھ کر گھونگٹ عروسِ صبحِ خنداں کا
ہوا فق رنگِ رُخ لیلائے شب کی زلفِ پیچاں کا
کچھ اس کی پیاری صورت نے انہیں شرما دیا ایسا
کہ تاروں نے فلک کی نیلگوں چادر سے منہ ڈھانکا
غضب کی سادگی ہو سادگی پر بھی یہ طرہ ہے
کہ بننے پر بھی بن سکتا نہیں ایسا کوئی بانکا
ہر اِک ذی روح چونکا تھا چمک سے رُخِ روشن کی
زمانے بھر کی آنکھیں کُھل گئیں جب اِک ذرا جھانکا
گواہی ہو کہ ہے یہ حسن کا قدر قابلِ حیرت
مؤذن کہ اُٹھا اللہ اکبر اہلِ قرآں کا
گیا کیوں شمع کا سوز اور تھمی شبنم کے کیوں آنسو
رُلاتا تھا انہیں کیا ہجر اسی محبوبِ خوباں کا
سوادِ روسیہ نے منہ چھپایا جاکے مغرب میں
پڑا عالم پہ سایہ ملتِ بیضا کے داماں کا
پڑی اِک روشنی ہر سمت کاروبارِ عالم پر
چُھٹا اندھیر کے ہاتھوں سے دامن اہلِ دوراں کا
تمیز اچھے بُرے کی ہو گئی اِس کے بتانے سے
ابھی تک وحشیانہ ایک لاٹھی سب کو تھا ہانکا

یکایک پھٹ گئی کائی سی سب وہام باطل کی
بیاباں میں بھی اب کھٹکا نہیں غولِ بیاباں کا

گر ہم شاعرانِ ہند کیا قدر اس کی جانیں گے
کہ شادی وصل کی اک یاد ہے اور دیجرانکا

نصیبہ سو رہا ہے رات دن یکساں ہر عاشق کو
یہاں خوابِ پریشاں نام ہے زلفِ پریشاں کا

سید ابو الحسن ناطق

کُمہلایا ہُوا پھُول

گذر چکی تھیں بہاریں خزاں کا موسم تھا
کہ اتفاق سے میں ایک چمن میں جا نکلا

عجیب حال گل و گلستاں نظر آیا
نگہ اُٹھا کے جدھر دیکھا۔ آنکھ بھر لایا

وہ زرد زرد تھے رنگ آہ! سبزپوشوں کے
کہ شکل دیکھی نہ جاتی تھی اُنکی آنکھوں سے

کھڑے تھے بیکس و مجبور سے بیچارے سے
لٹے لٹائے۔ پریشان۔ غم کے مارے سے

نہ موتیا۔ نہ چنبیلی۔ نہ موگرا۔ دیکھا
برائے نام نہ غنچہ کوئی کھلا دیکھا

زباں دراز نہ سوسن کہیں نظر آئی
نہ آنکھ نرگسِ شہلا نے ہائے دکھلائی

نہ سبزیاں۔ نہ طراوت۔ نہ تازگی۔ نہ فضا
نہ خوشگوار ہوائیں۔ نہ لطفِ نظارہ

روش روش پہ غضب ابتری سی چھائی ہوئی
خزاں کے ہاتھوں سے اک خاک سی اُڑائی ہوئی

یہ بین دیکھ کے دل میں بہت ہی پچھتایا
کہ آج اس جگہ کیوں سیر کو چلا آیا

یہاں نہ آتا تو ناحق ملال کیوں ہوتا
کسی کے حال کا مجھ کو خیال کیوں ہوتا

چلو یہاں سے۔ یہاں ٹھہرنا نہیں بہتر
کہ اس تماشے سے لگتی ہے چوٹ سی دل پر

یہ سوچتا تھا۔ کہ پہلو سے اِک صدا آئی
ہمیں بھی دیکھتے جانا میاں تماشائی!

بڑے سخی ہیں۔ بھرا گھر لٹائے بیٹھے ہیں
ہم اپنے سارے عزیزوں کو کھا ہو بیٹھے ہیں

ہمارے سامنے سارا چمن ہوا ویران
ہماری آنکھوں نے دیکھی ہیں ٹوٹتی کلیاں

زباں سے اُف بھی نہ کی ہائے کیا غریب ہیں ہم
اور اس پہ جیتے ہیں ابتک وہ بدنصیب ہیں ہم

نظر اُٹھا کے جو دیکھا تو اِک گلاب کا پھول
کِھلا ہوا تھا بظاہر مگر بہ شکلِ ملول

اکیلا شاخ میں اپنی لگا ہوا تھا وُہ
کمر سی ٹوٹی ہوئی تھی جھکا ہوا تھا وُہ

زبانِ حال تھی - اور تھا بیانِ فرقت کا
ادا ادا سے نمایاں ملال صحبت کا

وہ چاک چاک قبا رونقِ چمن کے لئے
جگر فگار عزیزانِ ہم وطن کے لئے

غرض کہ یاس کی صورت ہراس کی تصویر
بیانِ دردِ نہاں کے لئے لبِ تقریر

یہ رنگ دیکھ کے اُس پر کمال ترس آیا
گڑھا کچھ اتنا کہ آنکھوں میں اشک بھر لایا

نہ چاہا دل نے رہے یہ غمِ جدائی میں
کہ ایسی زندگی بہتر نہیں جدائی میں

اسے بھی توڑ کے اب خاک میں ملا دیجے
فضولِ قیدِ غمِ ہجر سے چھڑا دیجے

کہا پھر اس سے یہ میں نے کہ اے گلِ رنجور!
اسیرِ درد و بلا! ہائے بیکس و مجبور!

ہوئے ہیں تجھ پہ جو ظلم و ستم سمجھتے ہیں
جو درد ہے ترے دل میں وہ ہم سمجھتے ہیں

جو تنگ جینے سے ہے تو- تو حق بجانب ہے
کہ ایسے جینے سے مرنا ہی کچھ مناسب ہے

جہاں میں ہجر کا بیمار جو بچارا ہے
بس ایک موت ہی اس کے لئے سہارا ہے

جسے کسی سے محبت نہیں وہ کیا جانے
کسی کے درد کو بے درد خاک پہچانے

ہمیں تو زندگی ایسی ذرا نہیں بھاتی
جُدائی اپنے عزیزوں کی خوش نہیں آتی

خدانخواستہ یہ حال جو ہمارا ہو
تو ایک پل بھی نہ جینا ہمیں گوارا ہو

جُدا حبیب سے ہوں وہ گھڑی اگر آئے
کسی کی آئی ہوئی موت ہم کو آجائے

یہی سمجھ کے ہم اب تجھ پہ رحم کھاتے ہیں
"تجھے بھی نوچ کے اب خاک میں ملاتے ہیں"

یہ کہہ کے ہاتھ بڑھایا اور اس کو توڑ لیا
پھر اپنے ہاتھ سے مل کر زمیں پہ پھینک دیا

اگرچہ میں نے بظاہر بُرا کیا - لیکن
علاج ہی کوئی اس کے سوا نہ تھا ممکن

غمِ جدائی میں جس طرح دل تڑپتا ہے
یہ جس پہ گذری ہے حال وہی سمجھتا ہے

سفرِ زندگی

کیا کہوں کیسا کٹھن ہے زندگانی کا سفر
ہر قدم پر جان کا نقصاں تو ایماں کا ضرر

آفتوں سی آفتیں اور مشکلوں سی مشکلیں
الحذر اس زندگی سے اے عزیزو الحذر

اک طرف خندق رہی تو دوسری جانب کنواں
اور جو ان میں ابھی تھی بال سے باریک تر

ہے یہی منزل وہ شاید جسکو کہتے ہیں صراط
دھار پر تلوار کی ہے نوعِ انساں کا گذر

پہنچے جاناں تلک یا ہاتھ جاں سے دھوئیے
رہتی ہے ہر گام پر یہ بیستاں تو نظر

راستہ ہے پیچ پیچ اور جھاڑیاں ہیں خار خار
ہیں کہیں وہ ہن کے پرزے اور کہیں ٹکڑے جگر

راستی تم کو نظر آتی ہر اک سیدھی سی بات
کار بند اس پر کبھی ہو کر بھی دیکھا ہے مگر؟

اس قدر دشوار گھاٹی ہے کہ کچھ پوچھو نہیں
بیٹھ جاتے ہیں سب اس میں ہاتھ پاؤں چھوڑ کر

آبرو کے واسطے کھویا کئے ہم آبرو
اور عزت کے لئے تکتے رہے ذلت کا در

ہوگئے مجبور کیا کیا مرد تجھ سے احتیاج
اے ضرورت کر دیئے روباہ تو نے شیر نر

عقل کہتی تھی نہ رکھ وادیٔ وحشت میں قدم
شوق کہتا تھا کہ عقلِ نکتہ رس کو کیا خبر

ہم نے دانش کی نہ مانی اور کی جو جی میں آئی
جب گئی لیکن مآلِ کار پر اپنی نظر

چھا گیا اندھیر آنکھوں میں گئی سرسوں سی پھول
اپنے ماتم میں دلِ نالاں ہوا خود نوحہ گر

آ کے صادق پھنس گئے اس جال میں انجامِ کار
جال اپنے ہاتھ سے بنتے رہے جو عمر بھر

صادق (سری نگر)

تازہ غزلیں

ابرو ہیں دونوں دل کے خریدار دیکھئے
آپس میں چلنے والی ہے تلوار دیکھئے

میری طرف نہ غیر سے ہر بار دیکھئے
ٹکڑے اڑائے دیتی ہے تلوار دیکھئے

جی چاہتا ہے پھر انہیں اک بار دیکھئے
گیسو کی شام مطلع رخسار دیکھئے

ہولی بھی کھیلتے ہیں تو عاشق کے خون سے
رنگیں ہیں ہر طرف در و دیوار دیکھئے

آہستہ چلئے ایسی بھی جلدی کہاں کی ہے
دل پس نہ جائیں دیکھئے سرکار دیکھئے

وہ قتل عام کرتے ہیں جب مست جاتے ہیں
کہتا نہیں ہے کوئی کہ سرکار دیکھئے

میں غش ہوا تو سر مرا زانو پہ رکھ لیا
بندہ نوازیاں ہیں ذرا پیار دیکھئے

عاشق کی ہر طرح ہی سے مٹی خراب ہے
جب دیکھئے اسی کو گنہگار دیکھئے

کن مشکلوں سے پیار دیا منہ سے لے لیا
کیا کر گئے ہیں لعل شکر بار دیکھئے

ہرجائی کہہ دیا تو بگڑ کر تڑی یہ دی
یہ لفظ پھر نہ کہنا خبردار دیکھئے

کیا فیصلہ سنائیں تری بے نیازیاں
شاعر ہے بال بال گنہگار دیکھئے

آغا شاعر قزلباش دہلوی

یاس ہی یاس ہے ارمان دل ویراں میں نہیں
ایک سر سبز شجر میرے بیاباں میں نہیں

قتل کے بعد ہمارے نہ کھلے گا احوال
بے سبب آج گرہ گوشۂ داماں میں نہیں

اے صبا جوش میں آ کیا گل تر کو دیکھوں
پھول اشکوں کے یہاں کیا مرے داماں میں نہیں

اس میں کچھ شبہ نہیں خوب ہے وہ بو بھی وہی
سچ تو یہ ہے آپ ملاحت میں ہیں [illegible] میں نہیں

نعش بے نقش ہے پھر تحفہ [illegible] وہ پڑھیں
بیٹھنے کی بھی جگہ گور غریباں میں نہیں

ناصحا ترک محبت ہو کیونکر کہ دل
تو نے وہ بات کہی جو مرے امکاں میں نہیں

نہ تو وہ دل ہے نہ ہے سوز و گداز الفت
یہ سبب ہے جو اثر کچھ مری افغاں میں نہیں

ہمیں مونس ہیں ہمدرد ہیں سب کچھ ہیں
بیکسی کوئی بھی اپنا شب ہجراں میں نہیں

گل وہی رنگ وہی نخل وہی شاخ وہی
پھر سبب کیا ہے وہ رونق جو گلستاں میں نہیں

بیڑیوں کی نہ وہ جھنکار نہ زنجیر کا غل
اے جنوں تیرے سوا کیا کوئی زنداں میں نہیں

تجھ میں ہے آگ بھی تھوڑی سی جلا دے اسی جسم
میری تربت کی جگہ گور غریباں میں نہیں

حشر تک ایک طرح سے یہ جلینگے دن رات
دل کے داغوں میں ہے جو لطف چراغاں میں نہیں

روز و شب بس ترے شانہ پہ پڑی رہتی ہے
ہوش اتنا بھی تری زلف پریشاں میں نہیں

نفس سرد کی آتی ہیں ہوائیں پھر بھی
دل کے روزن میں ہے جو بات وہ زنداں میں نہیں

تربت قیس پہ کیا سبزہ چڑھائیں سجاد
ہائے وہ ایک بھی کانٹا مرے داماں میں نہیں

سجاد — دہلوی عظیم آبادی

آؤ ہم تم کو بتلائیں کہ ہر مریض کس طرح صحتیاب ہوئے ہیں!
طاقت بخش خون افزا روح
قیمت فی شیشی چار روپے
پتہ:۔ موچی دروازہ لاہور

شیخ خیر الدین رحیم بخش دواسازان مالک شفاخانہ یونانی و ڈواکٹری - لاہور

جب یہ لوگ جزیرہ میں آئے تھے، اُس وقت سے اُسوقت تک یہاں سے چھٹکارا پانے کے خواب تو بہت دیکھے لیکن سمندر میں پہلی دفعہ مصیبت اُٹھانے کے بعد کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ پھر اُس طوفان خیز، بے رحم، کس ناشناس موجوں کو اپنی جان سپرد کردے، پس سوائے اس کے کہ اس شکستہ کشتی کی تقلید میں جو انہیں اس جزیرے تک لے آئی تھی، ایک کشتی بنائیں، اس خانہ ویران قافلے نے اور کچھ نہ کیا + ہاں کبھی کبھی ساحل کے قریب خارا کو لیکر دو ایک آدمی کشتی چلا کے مچھلیاں پکڑ لایا کرتے تھے +

ایک رات جبکہ چاندنی کھلی ہوئی تھی، اور جزیرے میں خاموشی طاری تھی، خارا آلات حرب، اور بہت سا خورد و نوش کا سامان لے کے، جزیرہ خارستان کو "خدا حافظ" کہہ کشتی میں بیٹھ سمندر سے مقابلہ کے لئے چپکے سے نکل کھڑا ہوا +

اور اپنے دل میں کہنے لگا "موت؟ آخر کیوں؟ کس لئے؟ کوئی وجہ نہیں، ہرچہ بادا باد، اس یکساں زندگی سے تو نجات ملیگی" یہ کہہ کے کبھی کشتی کھیتا، کبھی چھوڑ دیتا کہ کشتی اپنے آپ چلے + پو پھٹتے ہی اُس کی آنکھوں کو (جو رات کی بیخوابی سے بیتاب اور مخمور تھیں) دُور بہت، بہت دُور ایک نقطہ سا نظر آیا + اور خارا نے یہ اُمید کر کے کہ شاید یہ وہی ارض موعود ہے جس کے لئے اس کا دل و جان بیتاب ہے، خوشی خوشی کشتی کو اس کی طرف لیجانا شروع کیا، اور شام تلک اپنی پوری کوشش اس میں صرف کرتا رہا؛ وہ اس قدر محو تھا کہ اُسے نہ معلوم ہوا کہ تھکن کیا چیز ہے، نیند کیا شے ہے؛ بلکہ اپنے آپ اس کی طبیعت نے ایک گانا بنایا جسے وہ شوق سے گاتا رہا :-

"سُنتا ہوں نگری نیکی ہے اور سُندر ہے سنسار ناؤ تو چلیو پار، ناؤ تو لگیو پار"

رات آدھی گذر چکی ہوگی، کہ یکایک ایک بلبل کی نرم و نازک و شیریں آواز جسے عمر بھر میں اُس نے کبھی نہ سُنا تھا اُس کے کانوں میں آئی + اس آواز کے نشہ سے مست ہوکر اُس نے کشتی چلانا بند کردی، اور بیحس و حرکت بیٹھ کر اُسے سُننا شروع کیا + زمرد یعنی

ٹیلوں سے بوئے گل، اور نوائے بلبل نسیم کے جھونکوں کے ساتھ ساحل تک آ رہی تھی اور سنسنی اور خوشی پھیلا رہی تھی +

اگرچہ چاندنی رات تھی لیکن آسمان پر بادل ہونے کی وجہ سے چاروں طرف کی چیزیں صاف نظر نہ آتی تھیں + خارا اس خفیف تاریکی میں، اس غیر معمولی حالت، اس راحت روح نغمہ و خوشبو کو بچوں کی طرح ہمک کے لینا چاہتا تھا لیکن ان سب سے مست ہو کر + آنکھیں اور ہونٹ کھولے، سر پیچھے کو ڈالے کشتی میں پڑا تھا + اس کے کان جو درندے حیوان کی پرہول آوازوں سے آشنا تھے، اب بلبل کا ترانہ سن رہے تھے، اس کا جسم جو کانٹوں اور پتھروں سے چھدا، اور چھلا کرتا تھا، پھولوں کی خوشبوئیں اس جسم کو آ آ کر لپٹ رہی تھیں۔ اور اس پر ایک پرلطف او رستنبان انگیز سنسنی طاری ہو رہی تھی + خارا اس قدر دلشاد تھا اور ایسا لطف اٹھا رہا تھا کہ اس خوف سے کہ اس میں خلل نہ پڑ جائے، کشتی میں ذرا نہ ہلتا تھا +

جس وقت صبح ہوئی، اور گردونہ گلگونہ آفتاب اپنے مطلع احتشام سے نکل کر آہستہ آہستہ اوپر کو بڑھا، اس وقت درختوں کے سبز پتے اور رنگ برنگ کے پھول، چمک اٹھے، اور پتوں پر قطرات شبنم موتی بن گئے + خارا اس سے بے خبر کہ کہاں آیا ہوں، اور اس سے غافل کہ کیا دیکھ رہا ہوں، متحیر نظریں چاروں طرف ڈال رہا تھا + اتنے میں درختوں کے پیچھے سے ایک چمکدار گرد باد اٹھتی، اور قہقہہ اور زمزمہ کے ساتھ خارا کی طرف بڑھتی نظر آئی۔

نوجوان خارا جو اب تک نہیں جانتا تھا کہ ڈر کیا چیز ہے، اس وقت ایک خفقان اور گھبراہٹ سے کانپنے لگا، اور ہر احتمال کے مقابلہ کے لئے تیاری کرنے لگا +

یہ صرصر رنگ و سحاب، آہستہ آہستہ خارا جہاں کھڑا تھا، اس سے کچھ فاصلہ پر نہر کے کنارے آکر رک گئی، اور جب خاک چھٹی، تو اس میں سے ایک جسم منور ظاہر ہوا۔ خارا پہلی بار

میں نہ سمجھ سکا کہ آیا آفتاب زمین پر اُتر آیا ہے، یا میں آسمان پر ہوں + یہ سوچے بغیر کہ کیا کرنا چاہئے، وہ اپنی کشتی سے نکلا، اور حسب معمول، اُسی "ہا ؤ" کے ساتھ اس نے اس پر حملہ کیا، کہ یکایک ایک تیر نے سامنے سے آکر خارا کو زخمی کر دیا +

نسرین نوش اپنے دل بہلانے کے لئے۔ اکثر اپنی ماں سے اجازت لیکر شکار کو نکلا کرتی تھی، اس صبح کو، اپنی سہیلیاں پیچھے چھوڑ کر، وہ بہت آگے نکل گئی تھی، اور آخر کار تھک کر ساحل تک شکار، اور غسل کے لئے آئی تھی +

خارا جیسی مجہول اور غیر معلوم شکار کو دیکھ کر، اُس نے فوراً اس پر تیر چھوڑا تھا جس سے یہ شکار زخمی تو ہوا، لیکن نسرین نوش نے دیکھا کہ زخم کھا کے وہ اس کی طرف جھپٹا، اور قبل اس کے کہ دُوسرا تیر چھوڑے، اُس نے اپنے تئیں شکار کی آغوش میں پایا + اور شکار اور شکار کرنے والی کی نظریں ایک آتش ریز حرارت کے ساتھ ایک دُوسرے سے ملیں + نسرین نوش سمجھتی تھی خارا کوئی نیا شکار ہے، خارا سمجھتا تھا نسرین نوش کوئی شکار کرنیوالی چڑیا ہے + مگر نہ معلوم کیا بات تھی، اور کیا سبب تھا ان کے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیوں اُنکی نظروں میں ایک دُوسرے کے لئے کشش تھی + دونوں کے دلوں میں گھبراہٹ تھی۔ جانے کیسے، خارا کی فریاد سے نسرین نوش اور نسرین نوش کی پُرغلیان مُسکراہٹ سے خارا نے سمجھ لیا کہ ہم جنس ہیں + نسرین نوش کا نرم ریشمیں لباس بارہ سنگھے کی کھال کے کپڑوں میں جسے خارا پہنے ہوئے تھا پھنس گیا: دونوں نے اسے چھٹانا چاہا، مگر دیکھتے کیا ہیں، کہ ایک کا ہاتھ، دُوسرے کے ہاتھ میں ہے؛ اور ایک ہاتھ دُوسرے ہاتھ کو محبت سے دبا رہا ہے +

خارا نے اپنے اوپر جو نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ تیر کے زخم سے خون نکل رہا ہے، کچھ اس تردد سے کچھ نہ معلوم کیوں، خارا نے اپنے کل ہتھیار زمین پر ڈال دیئے + نسرین نوش کے ہاتھ سے بھی حیرت کی وجہ سے تیر گر پڑے تھے + اب ان دونوں میں اپنے آپ، ایک

بے تکلف بے مراسم، مگر اسرار انگیز آمیزش نہانی پیدا ہو گئی + نسرین نوش اس سے پوچھ رہی تھی: "تو کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے" اور خارا، اشاروں سے سمجھا رہا تھا: "دور سے آیا ہوں، کانٹوں سے، پتھروں سے آ رہا ہوں۔ ہاتھوں کے ملنے سے" نوجوان خارا کے جسم میں ایک عجب برقی حرارت سرائت کر گئی تھی جس کی وجہ سے وہ کانپ رہا تھا، ادھر خون نکلنے کی وجہ سے، اس کے چہرہ کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔

نسرین نوش نے آہستہ آہستہ تیر، خارا کے پہلو سے نکالا + خون کو اپنے کپڑے سے پونچھا، اور زخم دھویا، پھر جا کے قریب سے چند پتے لا کے زخم پر باندھے، انہیں باندھتے وقت، نسرین نوش جو خارا پر جھکی تو ایک مرتبہ پھر اُن دونوں کی نظریں، نظریں کیا، ان دونوں کی روحیں، ایک مبہم شوق کے ساتھ، ایک دوسرے سے ملیں، اور اس دفعہ دونوں کی آنکھوں میں سے ایک جانفروز چمک، اک دلسوز چنگاری نکلی + موجیں ساحل کی طرف کیسے آتی ہیں؟ آفتاب، کائنات پر کس طرح روشنی ڈالتا ہے؟ شہد کی مکھی کس طرح پھولوں کی طرف جاتی ہے؟ بس بالکل اسی طرح، ان دو بیگانہ روح آشنا کے ہونٹ، ایک قدرتی کشش، ایک قدرتی شوق کے ساتھ، ایک دوسرے سے ملے +

یہ جزیرہ گو، بے انتہا خوبصورت تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ ایک گراں خواب میں سو رہا ہے، اور ہمیشہ سے کسی چیز کا انتظار کر رہا ہے + ان دونوں کا ایک دوسرے کا بوسہ لینا تھا کہ جزیرے کے پرند، چہچہا کر اُڑنے لگے، تمام کلیاں، ایک دم کھل گئیں + ایک گرد آہنگ و رنگ، ایک زمزمہ جوش و خروش نے کُل جزیرے کو گھیر لیا + اسوقت دونوں (خارا و نسرین نوش) مدہوش اور بیخبر پڑے ہوئے تھے + خارا کو ایک ایسی خوشی حاصل ہو رہی تھی، جو اُس نے تمام عمر میں اب تک محسوس نہیں کی تھی + اور اس نشہ کی لذت سے، اُس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل رہی تھیں، آغوش کھلی ہوئی تھی، سینہ سانس کی وجہ سے اُبھر رہا تھا اور دل ایک ننھی چڑیا کی اُڑان کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا +

پہلے نسرین نوش ہوش میں آئی تو دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پر جہاں خارا نے بوسہ لیا تھا ایک پھول کھلا ہوا تھا۔ یہ کیا؟ اُس نے سوچا تو یاد آیا کہ ایک مرتبہ جب وُہ سو نہیں رہی تھی، بلکہ آنکھیں بند کئے تھی، اور اس کی ماں حسب معمول اُسے دیکھنے آئی تھی، تو اُس نے کہا تھا: "خدا نہ کرے، مجھے خبر ہوئے بغیر یہاں کوئی مرد آئے لیکن اگر آیا تو مجھے معلوم ہو جائیگا، کیونکہ اگر اُس نے میری بیٹی کا بوسہ لیا، تو بوسہ کی جگہ پھول کھلینگے اور اس سے مجھے پتہ لگ جائیگا + ماں کی یہ تقریر جب نسرین نوش کو یاد آئی، تو وُہ گھبرائی! ایں تو یہ مرد ہے! یہ وہ چیز ہے، جس سے میری ماں مجھے بچانا چاہتی تھی: اب کیا کروں؟ یہ تو بڑا غضب ہوگیا + بڑی بُرائی ہوئی، مگر بُرائی کہتے وقت دل کہتا تھا۔ "اگر بُرائی ہے، تو شیریں اور پُرلطف بُرائی ہے"۔

اب نسرین نوش ہزار طرح سے خارا کو سمجھانا چاہتی ہے، کہ میری ماں آئیگی تو تجھ پر بہت خفا ہوگی، جا، جہاں سے آیا ہے، وہاں بھاگ جا" لیکن خارا نہ سمجھتا تھا نہ سمجھنے کی کوشش کرتا تھا + آخر عاجز ہو کر نسرین نوش رونے لگی، اور آنسو اُس کے سُرخ رخساروں سے ڈھلک ڈھلک کے زمین پر گرنے لگے + یہ آنسو گرتے ہی موتی بن جاتے تھے +

خارا، اس رونے سے بھی کچھ نہ سمجھا، بلکہ پہلی لذت کا جو اثر دماغ میں بسا ہوا تھا، اس سے متاثر ہو کر، پہلے جوش و اشتیاق کے ساتھ نسرین نوش کو آغوش میں لے کر ان رونے والی آنسوؤں سے تر آنکھوں کو چومنے لگا + اور جب نسرین نوش نے اپنے ہاتھوں سے اُسے اپنے پاس سے ہٹانا چاہا، تو خارا نے ہاتھوں ہی کو پکڑ کے چومنا شروع کر دیا۔

نسرین نوش، اس وحشی مگر فسوں کار، سودا زدہ مرد کی آغوش سے چھوٹ کر، بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی، کہ دور سے، اُس کی ماں آتی ہوئی دکھائی

دی + وہ ماں، جو مرد کو سب سے بڑی مصیبت خیال کرتی تھی - وہ ماں جو رات دن اسی دُھن میں رہتی تھی کہ مرد کا گذر اس جزیرے میں نہ ہو اب مرد کے روبرو تھی + اس کشمکش میں اور نیز اپنی ماں کو آتا دیکھ کر، نسرین نوش گھبراہٹ اور خوف کی وجہ سے بیہوش ہو گئی - خارا نہیں جانتا تھا کہ بیہوش ہونا کیا چیز ہے، اس لئے اُس نے اس بیہوشی کو ایک ادائے تسلیمیت خیال کیا، اور نسرین نوش کے پریشان اور بکھرے ہوئے بالوں سے لیکر پاؤں تک لگا تار بوسے لینے شروع کر دیئے اور سر سے پاؤں تک جہاں جہاں بوسے لئے تھے، وہاں پھول کھل گئے، یہاں تک کہ نسرین نوش کے جسم پر کوئی جگہ خالی باقی نہ تھی جہاں پھول نہ کھلے ہوں - نسرین نوش کی ماں کے خارا تک پہنچتے پہنچتے نسرین نوش ایک گلدستہ لطیف بن گئی تھی۔

بڑھیا، اپنی بھویں اُٹھا اُٹھا کے، خارا سے، اس جزیرے میں آنے کا سبب پوچھتی تھی، مگر خارا نہ سمجھتا تھا، نہ سمجھنا چاہتا تھا، بس اپنے ہاتھوں میں کے گلدستے کو دکھاتا تھا اور اپنی آغوش میں لے لیکر بھینچتا تھا - بڑھیا نے خیال کیا کہ بہتر یہی ہے کہ اسے جزیرے سے نکال دوں کیونکہ میں اس کا مقابلہ نہ کر نہیں سکتی - یہ سوچ کے اُس نے اپنی جریب سے اشارہ کیا جا "اس جزیرے سے نکل جا"

خارا فوراً گلدستے کو اپنی گود میں اُٹھا کر کشتی میں جا بیٹھا + نسرین نوش اب تک بیہوش تھی + اس وقت ہوا اور موجوں نے خارا کی کشتی کی مدد کی، اور وہ بہت جلد جزیرہ خارستان کو پہنچ گیا - جزیرے کے کنارے اس کے تمام ساتھی، پریشان، مضطرب، منتظر بیٹھے تھے + خارا اپنے مال غنیمت یعنی اس گلدستۂ رُوح و راحت کو لیکر کنارہ پر آیا تو اس کے تمام ساتھیوں نے جو مدت سے ان پھولوں کی خوشبو سے محروم تھے بہ کمال احترام اس گلدستہ کی خوشبو سے اپنی مشام جان کو معطر کرنا شروع کیا + جب خارا نے اپنی سرگذشت سُنائی، تو ساتھیوں نے تحسین اور حیرت بھری نگاہیں اس پر ڈالیں اور سب سوچنے لگے کہ زندگی کی بڑی کمی کو پوری کرنے والی یہ چیز یعنی عورت کس طرح ہوش میں لائی جائے +

آخر سب نے کہا کہ بڈھے کے پاس (جو غار میں تھا، ساحل تک نہیں آیا تھا) لے چلنا چاہیے، وہ کوئی ترکیب بتائیگا + بڈھے نے تمام حال کو سُنا، اور خوشی خوشی اپنے تمام تجربوں سے جو ہندوستان و سرندیپ میں اُسے حاصل ہُوئے تھے، نسرین نوش کو ہوش میں لانے کی کوشش کی + دوائیں دیں، منتر پڑھے، پانی چھڑکا؛ یہاں تک کہ صبح ہوئی اور آفتابِ عالمتاب، دنیا کو حرارت اور زندگی دیتا ہُوا نمودار ہوا، اور اُس وقت نسرین نوش کے جسم کے پھول، ایک ایک کرکے، زمین پر گر پڑے، اور یہ عورت اپنے تمام عورت پن، اپنی تمام نسوانیت، اپنی تمام شفقت، اپنی تمام شعریت کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی +

اب نسرین نوش، اپنے تئیں خار اکے قوی بازوؤں پر پرستش سینے میں پانے سے خوش تھی؛ اور ایک نسوانی غرور کی ادا سے، چاروں طرف دیکھتی تھی، اور ہنستی تھی، اس کے ہنستے ہی، اس خشک جزیرے کے پہاڑ اور گھاٹیاں سبز ہوگئیں + سیاہ وغمناک کانٹے، پھول اور سنبل بنگئے + اور عورت کی جادو بھری نظر، اور نیم خندۂ سحر نے، اس مصیبت زدہ طائفہ کو جو مدت سے شفقت کے لئے ترس رہا تھا، جان تازہ بخشدی؛ اور یہ لوگ اُن عذابوں کو جو اُنھوں نے اُٹھائے تھے آن کی آن میں بھول گئے +

ہیرے، موتی، زمرد، لعل، یاقوت، فیروزے وغیرہ جو اس جزیرے میں پڑے ہوئے تھے، اور کوئی اُن کی بات نہ پوچھتا تھا، اب جمع کرکے لائے گئے، اور نسرین نوش کے قدموں پر ڈالدیئے گئے + اس حسن و آن کو دیکھ کے بڈھا مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا، اور سر ہلا ہلا کے کہتا تھا: —

"ہاں! محبت پاش، سوداریز بال نہوں، جن میں ہیرے لگائیں جائیں تو ہیروں کی کیا قدر ہوسکتی ہے اور اگر نازک انگلیاں نہ ہوں، تو یاقوتوں سے، زمردوں سے

اس پیاری گوری گردنیں نہ ہوں، تو موتیوں کے وجود سے کیا فائدہ۔"

بُڈھا مارے خوشی کے متوالا سا ہو گیا تھا، کچھ چُپ ہو جاتا، لیکن ترنگ میں آکر پھر کہنا شروع کرتا:

"عورت! عورت! عورت ایک بیل ہے جو خشک درخت کے گرد لپٹ کے، اُسے تازگی، اُسے زینت بخش دیتی ہے۔ وُہ ایک دھونی ہے کہ محبت کی لپیٹ سے مرد کو گھیر لیتی ہے۔ بغیر عورت کے مرد، سخت دل ہو جاتا ہے، اگل کھرا بنتی تا نہ یہ عورت کی شفقت و نوازش ہے یہ اُس کے مُسکراہٹ کا ہی اثر ہے کہ مردوں کا سینہ عالی اور رقیق حسیات سے منتز ہو جاتا ہے۔"

اب نسرین نوش کو ایک دستِ توت مل گیا تھا، جو آہستہ آہستہ میں لے، اور غار کو ایک دستِ شفقت ہاتھ لگ گیا تھا، جو سیاہ زندہ حیات کی اذیتوں کو بھلا دے۔

بُڈھا اس جوڑے کو دیکھ کر، دفورِ مسرت سے چُپ نہ رہ سکا، ناچنے لگتا، پھر کہتا:

"عورت میں حُسن نہ ہوتا، تو مرد میں جرأت اور عالی حوصلگی نہ ہوتی! مرد میں عالی حوصلگی نہ ہوتی، تو عورت کی خوبصورتی و دلبری رائگاں جاتی"۔

اَلْحَمْدُ لِمَنْ قَدَّ دَخَسِیْرًا وَّخَبَالًا وَالشُّکْرُ لِمَنْ صَوَّرَہُنَّا وَجَمَالًا

(ایڈیٹر) سجاد حیدر (از بغداد)

زمانہ قدیم و حال میں بعض ایسے شاعر ہیں جو بے عیب سمجھے جاتے ہیں اور جن کی عیب جوئی کرنا جرمِ عظیم تصور کیا جاتا ہے۔ ایسا خیال قابلِ غور بھی برحق ہے۔ لیکن دراصل یہ محض وا ہمہ ہے، حقیقت حال یہ ہے کہ کوئی شاعر بے عیب نہیں۔ ہر شخص کا دل کم و بیش لذتِ شعر سے نمک چشیدہ ہے۔ لیکن کوئی شخص محض اس میں جب ہم کسی نظم کو خوبی کے ساتھ پڑھیں تو ہم بھی شاعر کہلا سکتے ہیں۔ (کارلائل)

مکتوباتِ آزاد

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

(۴)

آج ان دلچسپ خطوط کی آخری قسط درج کی جاتی ہے۔ اور ان میں چند خطوط بلا تاریخ ملے ہیں اس لئے وہ سب سے آخر میں درج کر دیئے ہیں:-

تسلیم - اللہ اللہ - اس وقت کیا دل خوش ہوا ہے - اور کیا غصہ آیا ہے - میں تو صبر کر بیٹھا تھا - اب سیلی ہوئی بارود کو آگ دینی کیا ضرور تھی - مجھے آپ خط نہ لکھا کریں۔[۵]

دلربائی ہمٔے لیلیٰ کرد مجنوں را خراب

ورنہ آں بیچارہ را میلِ گرفتاری نبود

خیر یہ تو باتیں حسبِ مزاج ہیں - کہ آپ اور میں آمنے سامنے بیٹھے ہوں - مطالب کی باتیں پہلے عرض کر لوں -

دیوانِ حافظ اخلاقِ جلالی ابوالفضل نولکشور نے چھاپی ہے اور خوب محشی ہے - ایک ایک نسخہ لیجئے اور دیکھ ڈالئے - آپ کے نزدیک کچھ بڑی بات نہیں - دیوانِ حافظ پر صوفیانہ حاشیے ہیں - خیر آپ اُس سے اپنا مطالب نکال سکتے ہیں - آپ کے دل پہ ان کتابوں کا بھرم بیٹھا ہوا ہے - اس لئے آپ دیکھتے نہیں - دیکھئے گا تو معلوم ہو جائیگا - آسان کام ہے - اخلاقِ جلالی پر جو حاشیے ہیں - وہ اس کے لئے کافی ہیں - آپ خاطر جمع رکھیں -

. . . .

گفتگو کو آپ مشکل فرماتے ہیں - میں کہتا ہوں کچھ بھی نہیں - لکھنؤ میں دو رسالے عربی[۵ب] ڈائیلاگز دو شخصوں نے جدا جدا لکھے ہیں - وہ کسی کو لکھ بھیجئے - بھیجدیگا - اور پڑھنا

شروع کیجئے۔ حفظ ہو جائینگے۔ امتحان ہیں۔ اس کے یا اُسی قسم کے فقرے ممتحن بولے گا۔ آپ کو یہ بات مشکل نہیں ہوگی۔ کہ توڑ جوڑ کر کے اُلٹے سیدھے جواب دیں اور اس کی خاطر جمع کر دیں۔ ہمت نہ ہاریئے۔ چُپکے نہ رہئے گا۔ اُلٹا سیدھا جھوٹ سچ بولے جائیگا۔

زبانِ فارسی کی تاریخ میں پروفیسر آزاد ایک شخص ہیں۔ اُنہوں نے تین چار لیکچر خوب دیئے ہیں۔ اور زبانِ مذکور کے اصُول اور بہت حالات اور بھی لکھے ہیں۔ ۳-۴ سو صفحہ کی کتاب ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ وہ ابھی مسوّدے ہیں۔ نظرثانی کر رہے ہیں۔ عجب نہیں کہ ہو جائے تو جلد چھپوا دیں۔

ہاں قواعدِ فارسی میں ایک کتاب ڈائرکٹر صاحب کی فرمائش سے مَیں نے لکھی تھی۔ اس کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ اور کتب خانہ آزاد سے فاضل ہے۔ وہ انشاءاللہ روانہ کرتا ہُوں۔ (خدا کرے بھُول نہ جاؤں)۔

آپ دیکھئے گا۔ قواعد کی کتاب ہے۔ اور اصُول و ضوابط بیان کئے ہیں اور پھر دیکھئے کہ طرزِ بیان کو ہاتھ سے نہیں کھویا۔ یہ بھی دیکھئے گا کہ مثالیں کیا خوش آیند بہم پہنچائی ہیں اور زبان کو اور محاورہ کو کس قدر قوت دیتی ہیں۔ خدا کرے آپ کو پسند آجائے۔

ہاں کیا خوب یاد آیا ہے۔ بمبئی میں ایک کتاب کسی نے چھاپی ہے۔ دیباچے رومی۔ اس میں ترکی اور عربی کی گفتگو لکھی ہے۔ اور اس قدر مبسُوط ہے کہ اگر آپ اسے یاد کر لینگے تو کافی و وافی ہوگی۔ وہ بھی منگوا لیجئے۔ اگر نہ ملے تو مجھے لکھئے۔ کتب خانہ آزاد میں ہے فوراً ایسالِ خدمت کر دونگا۔ (آزاد)

عالی جناب من تسلیم۔ مدت گذر گئی کہ خدمت سے مقصّر ہُوں۔ مگر عالمِ مجبُوری ہے کہ آبِ حیات میں غوطے کھا رہا ہوں۔ انشاءاللہ ایک مہینے کا کام اور ہے۔

حیدر آباد کے حالات اتنے ہی معلوم ہیں۔ جتنے اخباروں میں لکھے جاتے ہیں

ایڈیٹر مشفق اتنے اختیارات نے عہدہ کو نواب لائق علی خاں کے لئے کافی نہیں سمجھے میری عقل ناقص میں غل مچانے سے کچھ حاصل نہیں۔ گورنمنٹ کو جو کرنا تھا وہ کردیا۔ جو کچھ ہوگیا۔ وہی مناسب ہے۔ اب نہایت خاموشی اور عرق ریزی سے اس کی تعمیل کرنی چاہئے۔ لیکن اتنا خیال ضرور ہے کہ سکرٹری ہیں۔ صاحب قلم نہیں۔ فقط قلم ہوجائیں جو کہا سو کردیا۔ جو حکم دیا اس کی تعمیل کرکے لکھدیا۔ اپنی طرف سے سرمو دخل نہ دیں۔ میں نے کئی جگہ دیکھ کر ایسے موافق کا تجربہ حاصل کیا۔ جب بالیاقت شخص بے لیاقت اشخاص کے ماتحت ہوجاتا ہے تو اُس سے بے ضابطگی دیکھی نہیں جاتی۔ خواہ مخواہ بول اُٹھتا ہے۔ اسے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ میری ہدایت سے یہ لوگ میرے احسانمند ہونگے اور میری لیاقت کو تسلیم کرینگے۔ لیکن برخلاف اس کے وہ لوگ اس کی بات کو رد کرتے ہیں۔ موتیوں کو خاک میں ملاتے ہیں اور کبھی کچھ اس کی صورت کو ادل بدل کر کام میں بھی لاتے ہیں اور جن باتوں سے ناواقف ہوتے ہیں انہیں سیکھے جاتے ہیں اور تسعوید کرتے جاتے ہیں۔ اور اس شخص کی عقل و دانش کو دیکھ کر اور زیادہ خطر دل میں پیدا کرتے ہیں۔ اِن لحاظوں سے جہاں تک ہوسکے بے وقوف بن کر چپ چپ کام کئے جانا چاہئے۔ اور لیاقت اور معلومات کو دباتے ہوئے احکام کی تعمیل بڑی کوشش سے کئے جانی چاہئے ۔۔۔۔ اس موقع پر بڑی دانائی یہی ہے کہ اپنی آگاہی اور لیاقت دباتے ہوئے سب کے ساتھ ساتھ بلکہ پیچھے پیچھے چلے چلیں۔

با محتسب مگوئید اسرار عشق و مستی تا بے خبر بمیرد در بند خود پرستی

(آزاد)

جنابِ من تسلیم۔ آپ کو معلوم ہے کہ ۹ دن تک پولوس مقدس کا لاہور میں نزول رہا۔ ایک عالم تہ و بالا تھا۔ آزاد بھی اُنہی کی گرفتاری میں رہا۔ اس لئے نیاز نامہ نہ لکھ سکا۔ جس فارسی ڈراما کا آپ نے حال بیان فرمایا تھا۔ وہ میں نے لیکر دیکھا۔ پھر اُس کی

قیمت ہے اس لئے خرید کر بھیجنا مناسب نہیں سمجھا۔ آج کل میں یہاں سے کتب خانہ گورنمنٹ سکول کے لئے امرت سر کو کتابیں روانہ ہونے والی ہیں۔ اُن میں اُسے بھی لکھوا دیا ہے۔ عنقریب وہاں پہنچیگا۔ اور میں بھی لکھونگا۔ وہاں سے لیکر دیکھئے گا۔ یا میں خود لیکر حاضر ہونگا۔ نسخہ مذکور جب تک جی چاہے اپنے پاس رکھئے گا۔

میں نے اُسے دیکھا۔ اتنی بات ضرور ہے کہ لکھنے والے نے جو کچھ لکھا ہے ڈراما کے اصول کے بالکل مطابق لکھا ہے اور نتیجہ بھی برجستہ نکالا ہے۔ یعنی بڑھاپے کی شادی اور خصوصاً دوسری شادی کی تکلیفیں اور خرابیاں جتائی ہیں۔ لیکن چونکہ ابتدائی تصنیف ہے۔ اس لئے تحریر میں پھیلاؤ۔ اور بات کو بڑھانا۔ اور مزے لے لے کر کہنا۔ کوئی مصرع۔ کوئی فقرہ مقفیٰ۔ کوئی لطیفہ کوئی چٹکلا وغیرہ وغیرہ۔ لطف ابھی نہیں پیدا ہوئے۔ خیر جو کچھ کیا ہے۔ نہایت غنیمت ہے۔ عربی۔ فارسی میں یہ شاخ انشا پردازی کی بالکل نہ تھی۔ بڑی بات ہے کہ زمین سخن میں ایک قلم تو لگائی۔ شاخ و برگ بھی نکل آئینگے۔ گل پھول بھی کھل جائینگے۔ ابتدا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر زمانہ فرصت دے تو انشاءاللہ اُردو میں ایک ڈراما لکھ کر میں بھی نمونہ دونگا۔ دل تو بہت کچھ چاہتا ہے۔ مگر اکیلا آدمی۔ اور بے سامان۔ کیا کیا کچھ کرے۔ ؎

یک دل و خیل آرزو دل بہ کجا کجا نہم
سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم

(آزاد)

ایک مضبوط پورے قد کا گھوڑا دنیا کی ہر ایک منڈی میں بیس شرفی سے لیکر دو سو اشرفی تک قیمت پاتا ہے۔ دنیا میں اسکی اسقدر وقعت ہے لیکن ایک مضبوط پورے قد کے انسان کی نہ صرف دنیا میں کوئی وقعت ہی نہیں۔ بلکہ دنیا اُسے دس بیس روپیہ اس شرط پر دینے کے لئے تیار ہے کہ وہ خود اپنے گلے میں پھانسی لگا کر یہاں سے چلتا دھندا کرے۔
(کارلائل)

خانہ بدوش جپسی

انگلستان اور یورپ کے دیگر ممالک میں کچھ خانہ بدوش قومیں اب تک پائی جاتی ہیں۔ جنہیں جپسی کہتے ہیں۔ گو تمدن کی ترقی اور قانون کی سخت گیری سے روز بروز ان کی تعداد گھٹتی جاتی ہے۔ اور ان میں جو ذرا خوشحال ہیں وہ اپنی آوارگی کی زندگی چھوڑکر زیادہ پُر امن پیشوں میں گھستے جاتے اور رفتہ رفتہ فرنگستان کی زبردست آبادی کا جزو بنتے جاتے ہیں اور جو خستہ حال ہیں وہ زمانے کے ہاتھوں تنگ آکر نیست و نابود ہوتے جاتے ہیں۔ تاہم ان کے حالات نہ صرف تاریخی اور علمی اعتبار سے دلچسپی سے پُر ہیں۔ بلکہ اہل ہند کے لئے خصوصیت سے دلچسپ ہیں۔ کیونکہ جدید تحقیقات کا نتیجہ ہے کہ یہ اقوام زمانہ قدیم میں ہندوستان سے آئی تھیں۔ اور اس وقت تک خانہ بدوش لوگ ہندوستان کے اکثر حصوں میں موجود ہیں۔ وہ ان گورے رنگ والے۔ کوٹ پتلون پہنے ہوئے خانہ بدوش جپسیوں کے بچھڑے بھائی ہیں۔

جیسا کہ لفظ جپسی سے ظاہر ہے۔ ایک زمانہ تک اہل فرنگ کا خیال تھا۔ کہ یہ لوگ "آجپیٹ" یعنی مصر کے رہنے والے ہیں۔ اس خیال کی دو وجہیں تھیں۔ اوّل تو یہ کہ مدت تک مصر ہی اہل یورپ کے لئے مشرق کا حکم رکھتا تھا۔ مصر سے پرے کی مشرقی اقوام سے ادھر کے لوگ عموماً واقف نہ تھے اور بہت دُور جاتے تھے تو مصر تک جاتے تھے۔ اس لئے ان مشرقی خط و خال کے آدمیوں کو اُنہوں نے آجپشی سے تعبیر کیا اور یہ لفظ بعد میں "جپسی" بن گیا۔ دوم یہ کہ غالباً یہ لوگ ایشیا سے یورپ میں مصر کے راستے ہی داخل ہوئے۔ اور جیسا کہ اُس زمانہ میں ضروری تھا۔ ہند سے نکل کر بمنازل یہاں پہنچے۔ پہلی بڑی منزل ایران میں ہوئی۔ وہاں سے کچھ فارسی الفاظ سیکھے۔ ایران سے رُوم میں آئے اور رُوم سے مصر میں۔ مصر سے یورپ کون بڑی بات تھی۔ جب

گھر سے نکل پڑے تو دور و نزدیک کا کیا پوچھنا۔ خصوصاً اُس حالت میں جب خانہ بدوشی کی عادت ہو۔ بچپن سے سفر اور آوارگی گھٹی میں پڑے۔ اور پاؤں میں چکر ہو۔ یہ غریب ہندی نژاد مصر سے نکل کر یورپ بھر میں پھیل گئے۔ اٹلی۔ فرانس۔ جرمنی۔ آسٹریا کون سا ملک ہے جہاں اُن کا نشان نہ ملتا ہو۔ ہسپانیہ میں تو کچھ دنوں ان کا بہت چرچا رہا۔ اور انگلستان بھی ان کے حملے بے شور و غل سے نہ بچا۔ یورپ کے پرانے قصوں میں تو کوئی قصہ مشکل سے جپسی کے بغیر مکمل ہوتا ہے۔ سکاٹ کے کئی فسانوں میں جپسی فال نکالتے۔ نجوم کا احوال بتاتے۔ ہاتھ دیکھ کر ماضی و مستقبل کا حال کہتے نظر آتے ہیں۔ یہ پیشہ یورپ میں اب تک باقی ہے۔ گو پیشہ وروں کو بہت احتیاط سے چلنا پڑتا ہے۔ ورنہ قانون کے پھندے میں پھنس جائیں۔ ان دنوں جپسی لوگ انگلستان میں اُس کثرت سے نظر نہیں آتے۔ جس سے آج سے نصف صدی پہلے تک انہیں دیکھنا ممکن تھا۔ اور بڑے بڑے شہروں سے عموماً الگ رہتے ہیں۔ پھر بھی دیہات میں نکل جاؤ۔ تو کئی جگہ ان کے ڈیرے خیمے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا اصولِ زندگی اس بیسویں صدی میں بالکل وہی ہے جو ہزار برس پہلے تھا۔ اور جو ان کے بھائی ہندوؤں کا ہے جو ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ قافلہ قافلہ مل کر نکلتے ہیں۔ سختی برداشت کرنے میں زن و مرد یکساں ہیں۔ مرد عورتوں کی طرح چابکدست اور عورتیں مردوں کی طرح دلیر ہیں۔ کھانا پینا غریبانہ اور سیدھا سادہ۔ زندگی بے تصنع اور بے تکلف۔ ہندوستان میں گھاس پھوس کے جھونپڑے بناتے ہیں۔ یہاں کپڑے کے تنبو لئے لئے پھرتے ہیں۔ وہاں نہایت بھدا سا چھکڑا یا گدھے اسباب لادنے کے لئے رکھتے ہیں۔ یہاں دو تین بند گاڑیاں ہوتی ہیں۔ جو ایک کمرہ کی طرح بنی ہوتی ہیں۔ اس کے اندر عورتیں بچوں کو لیکر بیٹھ جاتی ہیں۔ اور اسباب سمیٹ لیتی ہیں۔ مرد گاڑی ہانکتے یا گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کچھ مریل سے ٹٹو باربرداری کے لئے ہوتے ہیں اور آئے دن یہ کاروان ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتا رہتا ہے۔ جن گاؤں میں جاتے ہیں۔ وہاں کسی نہ کسی قسم کا سفری تماشہ ساتھ لے جاتے ہیں۔ بچوں کے لئے ہنڈولے گاڑ دیتے ہیں

ٹٹو اور گدھے کرایہ پر دیتے ہیں۔ اور جہاں پہنچیں ایک میلہ جمع کر لیتے ہیں۔ ان کی صورت
دیکھو۔ تو ان میں اور ادنیٰ درجہ کے انگریزوں میں بہت کم فرق ہے۔ زبان انگریزی گنواری
لہجہ میں اچھی طرح بولتے ہیں۔ اور سوائے سیاہ بالوں یا سیاہ آنکھ کے جو کبھی کبھی مشرقی اصل کا
پتہ دے جاتی ہے۔ رنگ ڈھنگ سب چیزیں فرنگی ہیں۔ اور اس نظر سے ہر ہندی کے
لئے انہیں دیکھنا بہت کچھ نصیحت اور عبرت کا سامان ہے۔ ہندوستان میں ان کی برادری
سیاہ رنگ ہونے میں خصوصیت رکھتی ہے۔ اور شرفائے ہند عموماً صاف رنگ کے
ہیں۔ یہ رنگ ان کا ہر وقت باہر دھوپ میں رہنے کی وجہ سے ہے اور اس عادت کا
اثر ان کے چہروں پر یہاں بھی موجود ہے۔ مگر اتنا ہی جتنا کسی اور انگریز پر ہو جو عموماً دھوپ
وغیرہ میں چلتا پھرتا ہو۔ لیکن آب و ہوا کی خوبی دیکھئے۔ اس سرد ملک میں چند صدیوں کی
بود و باش نے انہیں بھی وہ چیز عطا کر دی ہے۔ جس کو اہل فرنگ اپنا سرمایہ ناز سمجھتے
ہیں یعنی سفید رنگ۔ اگر وہ ذرا غور کریں تو ان کو معلوم ہو جائے۔ کہ نازش کمالات
پر ہونی چاہیئے اور وہ آج کل اہل فرنگ کا حق ہے۔ لیکن رنگ پر اترانا اور صرف اسکی
وجہ سے اپنے آپ کو گندم گوں یا سیاہ رنگ لوگوں سے اعلیٰ مخلوقات جاننا کتنی بڑی
غلطی ہے۔

جیسے انگلستان میں انگریزی بولتے ہیں۔ فرانس میں فرانسیسی۔ ہسپانیہ میں ہسپانیہ
کی زبان۔ مگر اپنے حلقہ خاص میں اپنی خاص بولی بولتے ہیں۔ اس بولی میں جہاں جہاں
دور رہے ہیں سب زبانوں کے الفاظ مل گئے ہیں۔ لیکن اس پر بھی اس کی اصلیت
مٹائی نہیں گئی۔ اور جو شخص اس بولی کو غور سے سنے یا ان کے الفاظ کو لکھا ہوا دیکھے
وہ بے تامل یہ کہدے گا۔ کہ ان کے ہندی الاصل ہونے میں شبہ نہیں۔ کیونکہ گھر
کے استعمال کی چیزوں اور باہمی تعلقات کے لئے ان کے الفاظ نہ صرف عموماً ہندی ہیں
بلکہ ان الفاظ میں امتداد زمانہ بہت کم تغیر کر سکا ہے۔ چنانچہ پانی کو وہ پانی کہتے ہیں

مُنہ کو مو - چومنے کو چومیا - چور کے لئے چور اور ماس کے لئے ماس اُن کے ہاں موجود ہے۔

اور الفاظ جنکو ہر ہندوستانی کم و بیش سمجھتا ہے۔ اور جپسی زبان میں مروج ہیں۔ یہ ہیں۔ سَبیل - بمعنی سبزی - تتو بمعنی گرم - جبھ اور چیبھ بمعنی زبان - یہ الفاظ مجھے ڈاکٹر گریرسن صاحب سی آئی ای نے بتائے ہیں۔ جو ہندوستان کی متعدد زبانیں جانتے ہیں اور گورنمنٹ کی طرف سے السنۂ ہند پر ایک مفصل رپورٹ لکھ رہے ہیں۔ اُن کی رائے اس تحقیق کے ساتھ متفق ہے کہ یہ جپسی ابتدا میں ہندوستان سے آئے ہونگے۔ اور اُنہوں نے ایک ملاقات میں مجھے کئی اشعار جپسی زبان کے سنائے۔ جو اس خیال کی مزید تائید کرتے ہیں۔ اُن میں سے مندرجہ ذیل شعر مجھے یاد رہ گیا ہے:-

اندرے دا ویش اوپرے دا رُکھ آر چڑی کلو اینڈ چڑی کلی
اندرے دا ویش تلے دا رُکھ آر پیارا اینڈ پیاری

اس کا ترجمہ یہ ہے - جنگل کے اندر - درخت کے اوپر چڑا اور چڑیا (بیٹھے) ہیں
جنگل کے اندر - درخت کے تلے پیارا اور پیاری (بیٹھے) ہیں

گویا پورا شعر ہندی زبان میں ہے - سوائے اس کے کہ انگریزی لفظ [illegible] اور آر بمعنی ہیں اور اینڈ بمعنی اور ہندی الفاظ کو باہم ترکیب دینے کے لئے درمیان آ گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ اکثر ان لوگوں سے جا کر باتیں کیا کرتے ہیں اور کوئی نہ کوئی نئی بات سن آتے ہیں۔ چنانچہ انہیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ دُور کو دُور ہی کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ فارسی سے لیا گیا ہوگا۔ چھری کو چھری کہتے ہیں۔ "مجھے گوشت دے" کہنا ہو تو "دے موسے ماس" بولتے ہیں -

ان مثالوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ کہ وطن کی مُہر کتنی زبردست ہے۔ جو صدیوں میں مٹائے نہ مٹی۔ جپسیوں سے پوچھو تو انہیں کچھ معلوم نہیں۔ کہ انکی مٹی کہاں کی ہے۔ ان کے باپ دادا یہیں تھے۔ بس اتنا جانتے ہیں۔ یہ ہندی الفاظ روز بولتے ہیں مگر انہیں کیا معلوم کہ یہ ہندی ہیں۔ وہ تو یہ جانتے ہیں۔ کہ ان کے بزرگوں نے دور اندیشی سے انہیں ایک خاص بولی سکھا دی تھی جسے سوائے ان کے دوسرے لوگ نہیں سمجھتے۔ تاکہ وہ چپکے سے کی باتیں یا کسی چوری کی سازشیں اس بولی میں کر لیا کریں اور پاس والوں کو خبر نہ ہو۔

طرفہ یہ ہے کہ اس بولی کے کئی الفاظ بے معلوم طور پر خود انگریزی زبان میں انہی جپسیوں کے ذریعے داخل ہو گئے ہیں۔ کہ ان میں سے اکثر بازاری بول چال میں (جسے سلینگ کہتے ہیں) آتے ہیں۔ اور شریف لوگ انہیں کم بولتے ہیں۔ گو کبھی کبھی وہ بھی انہیں زوردار سمجھ کر استعمال کر لیتے ہیں۔ مثلاً "جبر" جپسیوں میں بمعنی "شے" مروج ہے اور انگریزی میں اس کے معنے ہیں "عمدہ یا اول درجے کی چیز"۔ انگریزی میں ([illegible]) دادا یا باپ کے لئے پیار کی اصطلاح ہے۔ اس کے متعلق لغت میں لکھا ہے کہ غالب ہے کہ یہ لفظ جپسی لفظ دادا سے ہو جو وہاں باپ کے لئے مستعمل ہے یا گیا ہو۔ انگریزی میں ([illegible]) ڈھونڈ نکالنے کے لئے ہے۔ اس کی نسبت بھی قیاس ہے کہ یہ جپسی لفظ مونگ سے جو مانگنے کے لئے ہے ماخوذ ہے۔ انگریزی میں Tinny چھوٹے کو کہتے ہیں۔ اور جپسی میں ٹونو۔

کچھ عرصہ ہوا۔ انگریزی میں بازاری الفاظ و محاورات کی ایک ڈکشنری[1] شائع ہوئی تھی۔

---

[1] کتاب کا نام یہ ہے۔ The Slang Dictionary
Publishers Chatto & Windus London

ایک یہ ترکیب راز کی باتیں کرنے کی لکھی ہے۔ کہ حروف کی ترتیب بدل دیتے تھے مثلاً مٹن چاپ کو چمٹن ماپ کہتے تھے۔ اور یہ رواج ایسے لوگوں میں ہندوستان میں بھی بعینہٖ موجود ہے۔ ایک اَور رواج ہے۔ جو ہندوستان کے ایک رواج سے بہت مشابہ ہے۔ یعنی کوئی زائد حرف ہر لفظ میں ڈال کر اُس کی صورت مسخ کر دی جاتی ہے۔ مثلاً "تَشیل وری گو" (یعنی کیا ہم جائینگے) کو "تنگیل وگی گگو" کہنا۔ اِس کے مقابلہ کے لئے پنجاب کے بعض آوارہ لوگوں کی وہ ترکیب قابل ملاحظہ ہے۔ جس میں وہ "میں تینوں کہنا ہاں" کی جگہ "مفیں تفینوں کفہنا ہفاں" بولتے ہیں۔ انگریزی میں بھی یہ ترکیب کچھ حرفِ گ سے مخصوص نہیں۔ بلکہ بعض نے گ کی جگہ ف یا ل سے اس بولی کو ترتیب دیا ہے۔ ڈی کوئنسی۔ جو انگریزی مصنفین میں ایک مشہور شخص گذرا ہے۔ ایک جگہ بیان کرتا ہے۔ کہ اس کے بچپن کے زمانے میں اس بولی کا خاصہ رواج تھا۔ اور ونچسٹر کالج کے طلبہ خاص طور پر اس کے مشتاق تھے۔ چنانچہ اس نے بھی اسے سیکھا اور اس قدر مشق بہم پہنچائی کہ پچاس سال بعد اسے لارڈ وسٹ پورٹ کے ساتھ اس میں گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا تو بھی نہایت آسانی اور روانی کے ساتھ بولتا چلا گیا۔ اس زبان کا اصطلاحی نام زَرف ہے۔

میرا مُدعا ان چند واقعات کے اظہار سے نہ صرف کسی قدر نئی معلومات کا ناظرینِ مخزن تک پہنچانا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ تحقیق پسند طبائع یہ تھوڑا سا اشارہ پاکر جیسی خانہ بدوشوں کی اصل کے متعلق زیادہ مسالہ بہم پہنچانے کی کوشش کریں +

عبدالقادر

دہلی کے مساجد و معابد کی سرگذشت

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

(۲)

جامع مسجد میں دھونسے کا بجنا

غدر سے پہلے ماہ رمضان میں پچھلے پہر ایک مشرقی والان میں دھونسہ بجا کرتا تھا جو سحری کھانے کے لئے مسلمانوں کو جگاتا تھا۔ اس کے تین ڈنکے بجتے تھے۔ مگر اب اسکا بجنا اس سبب سے بند ہوگیا کہ قلعہ میں گوروں کی چھاؤنی تھی۔ دھونسے کی آواز ان کی خوابِ راحت میں خلل ڈالتی تھی۔ اس کا سبب کوئی مذہبی نہ تھا جس سے مسلمان ناراض ہوں بلکہ تہذیب تھی جس کے سبب سے روشنی اور ہوا کے سب آدمی مالک برابر ہیں۔ ہر شخص کو یہ استحقاق حاصل ہے کہ روشنی و ہوا میں اگر کسی حرکت کے پیدا ہونے سے انکو تکلیف پہنچے تو وہ عدالت میں نالش دائر کرکے اسکو بند کرا سکتا ہے۔ یہ زمانہ حال کی تہذیب کی ایجاد ہے۔ پہلے روشنی اور ہوا کے سبب سے عدالت میں ایسی نالشیں نہیں دائر ہوتی تھیں۔ ہوا کے مالک ہونے میں مسلمان اور گورے برابر تھے۔ اس لئے مسلمان اپنے دھونسے کی دھوں دھوں سے گوروں کی نیند میں خلل نہیں ڈال سکتے تھے۔ اس بات کو مذہب کے منصب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

جامع مسجد کے اندر وعظ اور مذہبی بحثیں

غدر سے پہلے جامع مسجد میں بادشاہ کی طرف سے ایک واعظ تنخواہ دار مقرر تھا جو جمعہ کی نماز کے بعد صدر دالان کے پیش طاق میں منبر پر بیٹھ کر مسلمانوں کو وعظ سنایا کرتا تھا

بعض اوقات مذہبی مباحثے بھی عالموں کے درمیان اس مسجد کے اندر ہوتے تھے جب شہر میں باہر سے کوئی نامور عالم یا واعظ دین آتا تو وہ اس مسجد میں ضرور وعظ کہتا اور مسلمان اس کے وعظ و پند و نصائح سے مستفید ہوتے لیکن غدر کے بعد وعظ و مذہبی مباحثوں کا یہ رنگ ڈھنگ نہیں رہا۔ واعظین میں آپس میں ایسا تفرقہ پڑا کہ جب ایک واعظ منبر پر وعظ کہتا تو اور مولویوں اور واعظین پر تبرہ بھیجتا جس کے سبب سے بعض اوقات مسجد میں ایسا دنگہ فساد مچ جاتا کہ پولیس کو دست اندازی کی ضرورت پڑتی کبھی کبھی نماز کے درمیان آمین بالجہر کہنے پر آپس میں لپاڈکی ہو جاتی مذہبی مباحثوں میں بھی مسلمانوں میں دنگہ آپس میں ہو جاتا۔ اس لیے حکام دہلی نے مسجد کے دروازوں پر ایسا حکم آویزاں کیا جس کی دفعہ یہ ہے کہ مذہبی بحث کی مسجد کے اندر اجازت نہیں ہے اور نہ سوائے اغراض نماز کے اور کسی مجمع کی اجازت ہے اور بلا اجازت کسی منتظم کے مسجد کے اندر وعظ کرنے کی ممانعت ہے"۔

دروازے پر دو کانسٹبل پولیس کے تعینات رہتے ہیں جو ان احکام کی تعمیل کے نگراں رہتے ہیں۔

مسلمانوں کے فرقوں میں باہم ایسا نفاق ہے کہ وہ اس سے خوش ہیں کہ جامع مسجد کے منبر پر کوئی واعظ بیٹھ کر وعظ نہ کہے۔ ع

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی گو مشتِ خاکِ ما ہم برباد رفتہ باشد

یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ ایسی مسجد جامع میں جو ہندوستان کی ساری مسجدوں کی ناک ہے۔ مولویوں کے عناد و فساد کے سبب سے وعظ بند ہو۔ پولیس کی حراست میں مسجد ہو۔

جامع مسجد میں کتنے آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں

یہ مبالغہ سے کہا جاتا ہے کہ اس مسجد میں مور و ملخ سے زیادہ آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں اور الوداع کی نماز میں لاکھ سے زیادہ آدمی نماز پڑھتے ہیں۔ یہ کہنا ایسا ہے جب

کہ ایک گنوار نے مسجد کو دیکھ کر کہا تھا کہ مسجد بڑی ٹھوک ہے ایک مہر میں تو بنی ہوگی۔ یہ تو
بیالیس اور حساب کی بات ہے۔ اس سے صحیح صحیح تقریباً تخمینہ ہو سکتا ہے کہ کتنے آدمی اس
میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ مسجد کا کل رقبہ ۲۱۹۶ ہندوستانی گز ہے اور بحساب اوسط ہر
نمازی کے واسطے ۱۲ گرہ عرض اور اٹھارہ گرہ طول میں جگہ چاہیئے۔ اس حساب سے آسانی
پچیس ہزار ایک سو آدمی کی صف بندی کے ساتھ نماز پڑھ سکتے ہیں اور اس کی دالانوں
کی چھتوں و برجوں اور سیڑھیوں و چبوتروں پر چار پانچ ہزار آدمی باقاعدہ نماز پڑھ سکتے
ہیں۔ غرض تیس ہزار آدمیوں سے زیادہ آدمی کسی طرح اس میں نماز نہیں پڑھ سکتے۔ اس لئے
جب نمازی اس سے زیادہ آجاتے ہیں تو آس پاس جدولوں میں جاکر نماز پڑھتے ہیں۔

صحن مسجد کے چاروں طرف کے مکانات

صحن مسجد کے چاروں طرف خوشنما دالان اور ایوان سب سامنوں سے کھلے ہوئے ہیں
مغربی جانب کے دالانوں کے دروں پر دروازے ہیں اور کھڑکیاں لگی ہیں۔ مسجد کے چاروں کونوں
پر چار برج بارہ دری کے بہت دل آویز ہیں۔ اس کے نیچے حجرے دالانوں سے ملے
ہوئے ہیں۔ ایک شرقی دالان کے آگے صحن میں ایک سنگ گز بھر اونچا ہے جس پر کرہ
زمین کا نقشہ نہایت خوشخط کندہ کیا ہوا چسپاں ہے جو مسلمانوں کی جغرافیہ دانی پر دلالت
کرتا ہے اور دوسرے شرقی دالان کے آگے دائرہ ہندی جو دھوپ گھڑی کی طرح
اوقات بتلاتا ہے سنگ مرمر پر کندہ کیا ہوا لگا ہوا ہے جو مسلمانوں کی ہیئت دانی ثابت
کرتا ہے کہ نماز کے ٹھیک وقت بتلانے کے لئے یہ سامان کیا تھا۔ مگر ان دونوں کی مرمت
کے نہ ہونے سے اور وقت نما شملتی زنجیر پڑے کے اکھڑ جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ
اب علم جغرافیہ اور علم ہیئت سے مسلمان بالکل بد ہو گئے ہیں۔ صحن میں تین عالی شان
دروازے ہیں۔ شمالی اور جنوبی دروازے عام آدمیوں کی آمد و رفت کے لئے ہیں

اور دروازہ مشرقی خاص سلاطین و اُمرا کے آنے جانے کے لئے ہے یہ دروازہ اور دروازوں سے زیادہ عالی شان اور رفیع المکان ہے۔ اس میں بہ نسبت اور دروازوں کے مکانات بھی زیادہ ہیں۔ غدر کے بعد ان مکانوں کا انداز انگریزی کمروں کا سا کواڑوں کی جوڑیاں چڑھا کے بنا دیا ہے۔ الوداع کی جب نماز ہوتی ہے تو اسی دروازہ کے اُوپر کرسیوں پر حکام اور میمیں سیر دیکھتی ہیں۔ یہ دروازہ اب بھی بند رہتا ہے اس کی کھڑکی کھلی رہتی ہے۔ جب گورنر جنرل یا لفٹنٹ گورنر یا کوئی یورپین شاہزادہ و ہندوستانی والی ملک آتے ہیں تو کھولا جاتا ہے۔ غدر سے پہلے صرف وہ بادشاہ کے لئے کھولا جاتا تھا۔

ان عمارات کے سبب سے صحن مسجد کو ایک عجیب رونق دلفریب ہوگئی ہے۔ غدر سے پہلے اُن میں ایک اور رونق بھی تھی۔ جو اب نہیں ہے کہ ایک مغربی اور دوسرے جنوبی دالانوں میں مسلمان لڑکوں کے قرآن خوانی کے مکتب تھے جو لڑکوں سے بھرے رہتے تھے۔ ان کے اُستاد حافظِ قرآن دالانوں کے حُجروں میں رہتے تھے۔ ناظرہ اور حفظ قرآن مفت پڑھاتے تھے۔ مسجد کے اَور حُجروں میں بھی بعض بزرگانِ دین آباد تھے جن سے مسلمان فیضیاب ہوتے تھے۔ مگر اب نہ یہ مکاتب ہیں کہ جن میں لڑکوں کے ہل ہل کر قرآن پڑھنے کی آوازیں کان میں آئیں۔ نہ حُجروں میں زاہد و عابد رہتے ہیں کہ جن کے فیضِ صحبت سے مسلمان مستفیض ہوں۔ پہلے ہر وقت مسجد آباد معلوم ہوتی تھی اب نماز کے وقت کے سوا اکثر اَور وقتوں میں سناٹا رہتا ہے اور رات کو تو ہو کا مقام ہوتا ہے۔ دروازوں میں دربان بیٹھے رہتے ہیں۔ جنوبی و شمالی دروازوں میں گھڑیال بجا یا کرتے ہیں۔

درگاہ آثار شریف

جامع مسجد کے مغربی شمالی کونہ کے ایک قطعہ کا نام درگاہ آثار شریف تھا۔ وہ اس طرح بنائی گئی تھی کہ صدر دالان کے متصل مغربی دالان کے باہر کے دروں کو بند کر دروازے لگا دیئے تھے جو بہت مضبوط تھے اور دالان کے آگے سائبان ڈالا تھا اور دالان کے بیچ میں بہت خوبصورت کاٹھ کی راؤ ٹی رکھی تھی جس پر بانات کا غلاف چڑھا رہتا تھا اور اس کے اندر چاندی کی جالیوں میں آنحضرت کا موئے مبارک ۔ قدم شریف ۔ نعلین مبارک اور جُبّۂ مقدس اور حضرت علیؓ اور امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطِ کوفی میں سیپارے و بیاضیں رکھی ہوئی تھیں۔ اور راؤٹی کا دروازہ مقفل رہتا تھا۔ اس غربی دالان کے ساتھ شمالی مغربی کونے کے برج کے نیچے کا حجرہ اور شمالی دالان بھی ملالئے تھے اور انکے آگے کچھ صحن چھوڑ کر کنگورہ دار پتھر کی جالیوں کی دیواریں کھڑی کی تھیں جن سے اس درگاہ کا احاطہ جدا محدود ہو گیا تھا۔ اس درگاہ کے تین دروازے رکھے تھے۔ ایک شرقی دروازہ اور دوسرا شمالی دروازہ عین شمالی مینار کے نیچے یہ دونو دروازے عام آدمیوں کی آمد و رفت کے لئے تھے۔ تیسرا دروازہ مسجد کے پیچھے کے صدر دالان کے شمالی در میں چوکھٹ اور کواڑ لگا کے بنایا گیا تھا اور اس کے آگے پتھر کا زینہ بنایا گیا تھا وہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ جب بادشاہ مسجد میں آتا تھا تو اس کے واسطے درگاہ میں جانے کے لئے وہ کھولا جاتا تھا۔ شمالی دالان کے پیچھے ایک چھوٹا سا تہ خانہ تھا جو بادشاہ کے استنجا کرنے کے لئے بنایا گیا تھا اور اس کا دروازہ جامع مسجد سے باہر چبوترہ پر رکھا گیا تھا۔ اور اس کے اندر ایک کھڈی سی بنی ہوئی تھی۔ مگر اب یہ تہ خانہ اس درگاہ کے چراغ تیل بتی رکھنے کا گدام تھا۔ درگاہ میں روشنی ہر روز ہوتی تھی۔ اس میں مسجد کی طرح اندھیرا نہیں رہتا تھا۔

چراغ بتی روشن کرنے والے بادشاہ کی طرف سے ملازم تھے۔ یہ پتھر کی جالیاں ایک آندھی میں گر کر ایسی ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں کہ وہ لگانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ وہ مسجد ہی کے ایک کونے میں پڑی رہتی تھیں۔ ان کے گرنے کے بعد درگاہ کا احاطہ پھر محدود نہیں ہوا۔

کہتے ہیں کہ شاہجہان نے اپنی مسجد کو ان تبرکات سے متبرک بنایا تھا جو اس کے باپ دادا نے جمع کئے تھے اور وہ ان کی سواریوں کے جلوس میں سب سے آگے فیل نشین ہو کر چلتے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کو ان کے مستند ہونے پر اعتقاد ہے اور سوا قدم شریف کے ان آثار شریف پر کوئی مورخانہ اعتراض بھی نہیں ہو سکتا۔ ہر جمعہ کی نماز کے بعد ان تبرکات کی زیارت کرائی جاتی۔ اس درگاہ کو مسلمان ایسا متبرک تبرکات کے سبب سے سمجھتے تھے کہ اس کے شمالی دالان کے باہر کی یعنی مغربی دیوار پر حجر اسود کی نقل بنائی تھی۔ جس پر لوگ ہاتھ پھیر کر اپنے منہ پر پھیرتے تھے اور بوسے دیتے تھے۔ اس پر ھُوَاللّٰہُ اور بعض آیتیں لکھی ہوئی تھیں۔ غرض اس کا استلام حجر اسود کا سا ہوتا تھا۔ بارہ وفات یعنی ربیع الاول کی ۱۲ ار شب کو ان تبرکات کی زیارت کرائی جاتی تھی۔ ساری مسجد میں روشنی۔ قندیلوں اور قمقموں کے ذریعے سے ہوتی تھی اور نہایت عمدہ ملیدہ پر نیاز ملتی تھی۔ ملیدہ کو لاکھی خوانچوں میں رکھ کر اور لاکھی سرپوشوں سے ڈھک کر خادم بادشاہ کی خدمت میں لے جاتے تھے۔ بادشاہ انکو دو سو روپیہ دیتا تھا۔ درگاہ میں ہر جمعرات کو ختم ہوتا تھا۔ اور مہینہ میں گیارھویں کی نیاز ہوتی تھی بعض دفعہ نیاز ہندو بھی دلاتے تھے۔ اس میں مدح خوانی بڑی خوش الحانی سے ہوتی تھی

بادشاہ الوداع یا عیدین کی نماز میں آتا تو بعد نماز درگاہ میں تبرکات کی زیارت کو جاتا اور مدح خوان جو اس درگاہ کے ملازم تھے اس کے روبرو مدح خوانی کرتے اور وہ انکو کھڑا ہو کر سنتا اور تبرکات کی زیارت سے مشرف ہو کر چلا جاتا۔ اور معمولی نذرانہ دے جاتا۔

اس شہر کی یہ رسم ہے کہ جب لڑکوں کا ختنہ ہوتا ہے اور اس کے بعد انکا غسل صحت ہو کر ایک شادی ہوتی ہے۔ جس کا نام گھوڑے چڑھنے کی شادی ہے۔ عزیز و اقربا لڑکے کو دولہا

بنا کے اور گھوڑے پر چڑھا کے باجے گاجے کے ساتھ مسجد کے نیچے لاتے ہیں۔ دولہا مسجد کے اندر درگاہ میں جاتا ہے اور آثار شریف کی زیارت کر کے چلا آتا ہے۔ حسب مقدور نذر دیتا ہے

تبرکاتِ آثار شریف درحقیقت وقف ہیں جو ابتدا سے مسجد جامع کی تولیت میں چلے آتے تھے اور درگاہ میں جدا رکھتے تھے۔ لیکن یہ تبرکات خادمانِ آثار شریف کو ایک نیک نہاد رسالدار کی عنایت سے ایامِ غدر میں ہاتھ لگ گئے وہ اس کو اپنی ملکیت سمجھنے لگے۔ وہ ممبرانِ کمیٹی منتظم کی نیت کو خوب سمجھتے تھے کہ وہ ہم کو علیحدہ کر کے تبرکات سے جو منفعت ہم کو ہوتی تھی محروم کر دینگے۔ اس لئے انہوں نے اپنی ملکیت کا دعویٰ کیا۔ کہ ہم نے انکو بچایا ہے ہم ہی ان کے مالک ہیں۔ انکو درگاہ میں جہاں وہ پہلے رکھے ہوئے تھے ممبران کمیٹی نے رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ اور کہا کہ مسجد نماز پڑھنے کے لئے ہے تبرک پرستی کے لئے نہیں ہے کہ درگاہ میں تبرکات رکھے جانے سے نماز کے سامنے وہ آئینگے جس سے یہ شبہ پیدا ہوگا کہ تبرکات کو مسلمان سجدہ کرتے ہیں۔ خادموں کو اجازت دی گئی کہ ایک چھوٹے دالان میں تبرکات رکھیں۔ دالان کے شمالی جانب کے سب در بند کئے گئے نواب بہاولپور نے بہت پر تکلف راوٹی تبرکات رکھنے کے لئے بنا دی جس پر سفید روغن بہت چمکتا ہوا اور اس پہ سنہری کام بنا ہوا ہے۔ اس کی برجیاں اور مینار و کنگورے بڑے خوبصورت ہیں پھر ممبرانِ کمیٹی نے تبرکات پر قبضہ کرنے کے لئے اپنا قفل راوٹی پہ لگا دیا۔ خادموں نے عدالت میں استغاثہ کیا۔ عدالت نے ان کے حق میں انصاف کیا کہ تبرکات پر خادموں کا قبضہ بحال رکھا۔ ممبرانِ کمیٹی نے خادموں کی تنخواہ جو مسجد کی آمدنی سے ملتی تھی بند کر دی۔ اور جامع مسجد میں جو اور عطیات آتے رہتے ہیں اُن سے بھی انہوں نے ان کو محروم کر دیا مگر تبرکات کی زیارات سے جو آمدنی خادموں کو ہوتی ہے اس سے بھی سروکار نہیں رکھا۔ غرض خادمانِ آثار شریف مسجد کے

متعلقین میں سمجھے جاتے ہیں مگر اس کی آمدنی سے ان کو کچھ نہیں ملتا ہے نہ وہ اپنے تبرکات کی آمدنی میں سے کسی اَور کو کچھ دیتے ہیں۔ خادمان ان تبرکات کو ساتھ لیکر کبھی کبھی اَور شہروں کا بھی دَورہ کرتے ہیں جن سے ان کو منفعت ہو جاتی ہے۔ آثار شریف کی روشنی اور نذر نیاز کے لئے بھی انکو ریاست رامپور سے تیس روپیہ ماہوار ملتا ہے غرض ان کی حالت آمدنی کے اعتبار سے پہلے کی نسبت اچھی ہے۔

جامع مسجد کے گرداگرد کے حالات جو غدر سے پہلے تھے اور اب ہیں

شاہجہان نے اکبرآباد کے قلعہ کا یہ حال دیکھ کر کہ اس کے پاس جامع مسجد بنانے سے اس کے باہر بادشاہ کی سواری اور اُمرا کی سواریوں کے جلوسوں کے کھڑے رہنے کے لئے جگہ بہت تھوڑی باقی رہی تھی جس کے سبب سے بڑی چپقلش ہوتی تھی۔ اس لئے اس نے دہلی میں قلعہ سے ہزار گز کے فاصلے پر جامع مسجد بنوائی اور قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان بڑے بڑے میدان رکھے جن میں قلعہ سے باہر بادشاہ اور امرا کی سواریوں کے جلوس بافراغت کھڑے رہیں۔ مسجد کے گرد بہت چوڑے رستے چھوڑ کر مشرقی دو کونوں میں بہت بڑے بڑے دو حوض بنوائے تھے مگر وہ بند ہو گئے اور ان پر مکانات بن گئے اور ~~۱۹۰۵~~ میں مسجد کے عقب میں شمالی مغربی کونے میں ایک دارالشفا اور مغربی جنوبی کونے میں دارالبقا تھی۔ دارالشفا میں طبیب مفت علاج کرتے اور دوائی خانہ سے بیماروں کو دوا بے قیمت دیتے۔ مگر غدر سے پہلے دارالشفا کا یہ حال نہیں رہا تھا۔ شہزادوں نے اس پر قبضہ کر کے اپنے مکانات بنائے تھے۔ ان ہی سے شیش محل اب تک موجود ہے۔ دارالبقا میں پہلے شاہی مدرسہ تھا اس میں معقول و منقول کا درس جاری تھا مگر وہ بھی بالکل ویران ہو گیا تھا۔ اس کی عمارت بھی جا بجا سے شکستہ ہو گئی تھی کہ ۱۸۴۰ء میں مولوی محمد صدرالدین خان صدرالصدور شاہجہان آباد

نے دارالبقا کو بادشاہ سے لیکر اس کی مرمت میں بہت روپیہ خرچ کیا اور معلم اپنے پاس سے تنخواہ دیکر نوکر رکھے اور بہت طلبہ مستعد جمع کیے جنکو کھانا وہ اپنے پاس سے دیتے تھے ۔ نان بائی کی دوکان دارالبقا کے دروازہ پر تھی - دارالبقا کے صحن کے بیچ بیچ میں ایک کنواں پہاڑی کو کاٹ کر منشی آغا جان میر منشی رزیڈنسی راجپوتانہ نے بنوایا تھا۔ اس میں بہت روپیہ خرچ ہوا تھا کہ مسجد کے گرد نہایت ہی چھوٹے رستے اور میدان باقی نہیں رہے تھے - محمد شاہ کے عہد میں جامع مسجد کے جنوب کی دیوار سے حبش دال والوں کی دکانیں پیوستہ تھیں - جو مسجد کے ساتھ ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ زربفت میں ٹاٹ کا پیوند لگا ہے اور مسجد کے شمالی مغربی گوشہ کا چبوترہ قبرستان بنا اور چبوترہ کے سرے پر ایک چھوٹی سی مسجد بنانے میں مسجد کے رخ زیبا پر چیچک کے داغ معلوم ہوتے تھے مسجد کے گرد اور لوگوں کے اپنے مکانات بنالئے تھے جنہوں نے جامع مسجد کو گھیر لیا تھا اور وہ ان کے اندر ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کوئی حسین عروس چیتھڑے لگا کے ایوں کی کوٹھڑی میں بند ہو - عالیشان عمارتوں کی حسانت کی شوکت جب ہی نمایاں ہوتی ہے کہ وہ چاروں طرف سے کھلے میدانوں میں ہوں نہ یہ کہ برے بھلے نیچے اونچے مکانات ان کے گرد و پیش ہوں - انگریز کہا کرتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی وہ حس جو حسانت کا ادراک کرتی ہے مردہ ہے - اس لئے مسلمان سمجھتے ہی نہ تھے کہ ان مکانات کا مسجد کی گردن پر سوار کرنا اس کے حسن کی نمائش کو خاک میں ملانا ہے مگر غدر کے بعد حکام انگریزی کو یہ خیال آیا کہ اس مسجد کی چاروں طرف میدان کر کے اس کی حسانت کو نمایاں کرنا چاہیئے - چنانچہ انہوں نے اس کے گرد ان محلوں و بازاروں و عمارتوں کو صاف کیا - دارالشفا و دارالبقا - چاوڑی کے بازار کا رستہ کے کنوئے کے محلہ کا گلیوں کے بازار کا رامام کی گلی کا کچھ کچھ حصہ مسمار کیا خاص بازار کو بالکل اڑا دیا اور اور محلے بھی بالکل بے نام ونشان کئے - اور یہ تجویز کی کہ اس کے گرد چمن اور

باغ لگائے جائیں جس سے اور بھی مسجد کے حسن پر بہار آجائے۔ چمنوں کے لئے عقب میں دو سنگھاڑے بنائے اور ان میں درخت لگائے گر زمین ایسی سنگلاخ تھی کہ اس نے پودوں کی جڑوں کو جگہ نہ دی۔ ناچار سنگھاڑے توڑ دیئے گئے اور چمنوں کے لگانے کی تجویز کو ملتوی کردیا۔

اس مسجد کا پیچھا دال والوں کی دوکانوں کے الحاق سے نہیں چھوٹا تھا کہ مسجد کی کمیٹی منتظم نے جنوبی جانب میں چوبی دوکانوں کی قطاریں بنوائیں۔ جس سے مسجد کے مغربی جانب میں ذات الجنب کا مرض اور بڑھا۔ جو کہ عمارت کے حسن پرست ہیں وہ ان دونوں طرف کی دوکانوں کو مسجد کے حسن پر ایسا داغ لگا ہوا جانتے ہیں کہ ان کا بس چلے تو وہ اس کو اڑا دیں۔ مگر یہ داغ مسجد کو درم دیتے ہیں اس لئے وہ مٹنے کے نہیں

دوکانوں کا نام غدر سے پہلے دال والی دوکانیں تھا اور ان میں پہلے نری دالیں ہی بکا کرتی تھیں مگر اب وہ اناج کی بڑی منڈی ہوگئی ہیں۔ جس کے آگے اناج کے انبار لگے رہتے ہیں اور چھکڑوں کی قطاریں کھڑی رہتی ہیں +

(باقی دارد)

بعد قتل الفت کا اب اظہار رہنے دیجئے
آپ لپٹا کر گلے سے پیار رہنے دیجئے

دل سے یوں ہی دونوں آنکھیں چار رہنے دیجئے
آنکھ کے بیمار کو بیمار رہنے دیجئے

ذبح کرنا ہے کسی حسرت بھرے کا کیا ضرور
رک رہی جب حلق پر تلوار رہنے دیجئے

حضرت دل زیست کے لوٹیں مزے الفت میں آپ
خیر ہم کو جان سے بیزار رہنے دیجئے

رفتہ رفتہ قید کی زلف دوتا آزاد ہوں
چھوڑیئے دو چار دل دو چار رہنے دیجئے

اٹھتے جوبن کے اشارے ہیں یہ ہم سے وصل میں
ہاتھ چلتے ہیں تو کیوں بیکار رہنے دیجئے

پردے آنکھوں کے اٹھیں بے پردہ دیکھوں آپ کو
رہ چکا ہیں غافل اب ہشیار رہنے دیجئے

گھر میں آنا اک طرف ہم دل میں گھر کرتے ہیں
اور اُفتادہ پس دیوار رہنے دیجئے

اس ستمگر سے جفا کا شکوہ کیا کم ہے جلال
بس وفا کا بے محل اظہار رہنے دیجئے

ہار میں جیت

حُسن کچھ کسی کی میراث تو ہے نہیں۔ خدا کی دین ہے۔ جسے چاہے دے۔ اکثر غریب گھروں کے حصّے میں بھی آ جاتا ہے۔ فرانس کے ایک شہر میں ایک غریب لڑکی تھی جسن و جمال کی پُتلی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہیں ایسی جگہ بیاہی جائے جہاں خوشحالی برستی ہو۔ آسودگی ہر وقت موجود ہو۔ مگر یورپ میں بھی امیر امیروں ہی سے شادی کرتے ہیں۔ اسے آخر ایک متوسط درجے کے نوجوان سے جو محکمہ تعلیم میں ملازم تھا شادی کرنی پڑی جس کے ہاں کھانے کو روٹی تو تھی مگر پہننے کو کپڑا نہ تھا۔

غریب لڑکی سیدھے سادے کپڑے پہن کر گذارہ کر لیتی۔ لیکن ایک غم اس کا رفیق تھا جو ہر وقت اسکے دل کو کھائے جاتا تھا۔ جب کبھی بھی وُہ تخلیہ میں بیٹھتی یہ خیال فوراً اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا کہ مَیں اس سے بہتر حالت کے لئے بنائی گئی ہوں۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اگر وُہ کسی بات پر خوش ہوتی تو اپنی موجودہ حالت کا احساس اسے فوراً افسردہ کر دیتا۔ کبھی وہ یہ خیال کرتی کہ فلاں عورت دیکھو مجھ سے زیادہ حسین نہیں۔ مجھ سے زیادہ سلیقہ شعار نہیں پھر کیوں اسے عیش کے تمام سامان مہیا ہیں اور مجھے نہیں۔ جب وُہ اپنے سربیانہ گھر کی طرف دیکھتی اور اس کے در و دیوار پر نظر ڈالتی تو دل پر ایک چوٹ سی لگتی۔ اور جب وہ اپنے گھر کے اثاثے کا خیال کرتی تو وہ ٹوٹی پھوٹی کرسیوں اور بدنما بوسیدہ پردوں کے سوا کچھ نہ پا کر اور زیادہ کُڑھتی۔ اور جب وہ دیکھتی کہ میرے گھر میں سوائے ایک غریب دیہاتی لڑکی کے گھر بار کا کام کرنے کے لئے اور کوئی نہیں تو بہت مایوس ہوتی۔

وہ ہر وقت بڑے بڑے عالیشان محلوں اور شاندار مکلف کمروں کا خواب دیکھتی۔ وُہ چاہتی تھی کہ ایک بڑا عالیشان مکان ہو اور تمام قسم کی آرائش کے تکلفات سے آراستہ ہو۔

نوکر وردیاں پہنے دروازے پر ہر وقت دست بستہ حاضر ہوں۔ گھر میں نوکر چاکر بافراط ہوں۔ گھر ایسے بھرا ہو جیسے عجایب خانہ جس میں دنیا کے تمام عجائبات جمع ہوں۔ ہائے یہ آرزو کس قدر اس کے دل میں آگ سی لگا جاتی تھی۔ جب وہ میز پر کھانا کھانے بیٹھتی تو وہی پرانا میلا دسترخوان اور معمولی کھانا دیکھ کر مایوس ہو کر رہجاتی۔ اس کا غریب خاوند تو جو میسر آتا خدا کا شکر کر کے پیٹ بھر لیتا۔ اور اپنے کام پر چلا جاتا۔ اور وہ آرزوئیں کیا کرتی کہ لذیذ کھانے ہوں چاندی کے چمکدار برتنوں میں چنے ہوں اس کے پاس نہ تو کوئی عمدہ پوشاک تھی اور نہ زیور مگر اس کی ایک سہیلی جو کسی بڑے مالدار کی لڑکی تھی۔ طرح طرح کے زیور و جواہرات سے مالا مال تھی۔ جب کبھی دونوں ملتیں تو مسز لائل (یعنی ہمارے متوسط الحال دوست مسٹر لائل کی بیوی) اپنی سہیلی کی اس حالت پر بہت رشک کرتی۔ گو یہ دونوں ہمسبق رہ چکی تھیں اور دونوں میں پیار بھی بہت تھا۔ تاہم مسز لائل نے اپنی سہیلی کے ہاں جانا چھوڑ رکھا تھا۔ کیونکہ اس کی ملاقات کے بعد جب وہ واپس آتی تو نہایت افسردہ خاطر ہوتی تھی۔

ایک دن شام کے وقت مسٹر لائل بڑی خوشی خوشی اپنے گھر واپس آیا تو ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ تھا۔ اور کہنے لگا یہ لو تمہارے واسطے ایک چیز لایا ہوں۔ بیوی نے جلدی سے لفافے کو کھولا تو ایک چھپا ہوا کارڈ نکلا۔ پڑھا تو معلوم ہوا کہ ایک بڑے جلسے میں شرکت کی دعوت ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اس دعوت کو دیکھ کر خوش ہوتی اس کے خاوند کو بھی یہی توقع تھی۔ لیکن اس نے کارڈ کو نہایت حقارت سے میز پر پھینک کر کہا "میں اسے کیا کروں"۔

خاوند۔ میری جان مجھے تو خیال تھا کہ تم اسے دیکھ کر خوش ہوگی۔ تمہیں اس سے پیشتر کہیں باہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اور یہ ایک اچھی تقریب ہے۔ میں نے بڑی دقت سے یہ کارڈ حاصل کیا ہے۔ ہمارے دفتر کا ہر شخص وہاں جانا چاہتا تھا کیونکہ وہاں صرف چیدہ چیدہ اشخاص جمع ہونگے۔ اور بڑی رونق کا جلسہ ہوگا۔

بیوی۔ (نہایت غضب آلود نگاہوں سے) تو تم اس جلسے پر مجھے پہناؤ گے کیا؟

خاوند۔ وہی پوشاک پہن لینا جو تم رات کو تھیٹر جانے وقت پہنا کرتی ہو۔ مجھے تو وہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔

یہ کہکر بیچارہ چپکا سا رہ گیا۔ اتنے میں اس کی بیوی کی آنکھوں سے دو آنسو گوہر آبدار کی طرح ڈھلکتے ہوئے گر پڑے۔ یہ دیکھ کر اس کے خاوند سے نہ رہا گیا۔ پوچھنے لگا کہ آخر اتنے ملال کا کیا باعث ہے"۔

بیوی (اپنے غم کو ضبط کرنے کی کوشش کر کے اور اپنے آنسوؤں کو پونچھ کر)۔ "کچھ نہیں۔ صرف یہ خیال ہے کہ میرے پاس کوئی پوشاک ایسی نہیں جو پہن کر اس جلسے میں شریک ہونے کے قابل ہو۔ اس لئے میں نہیں جا سکتی۔ یہ کارڈ اپنے کسی اور دوست کو دیدو جو تم سے زیادہ آسودہ حال ہو۔

خاوند۔ اچھا پیاری یہ تو بتاؤ کہ ایک عمدہ پوشاک پر جو تم ایسے موقعوں پر پہننا چاہتی ہو کیا صرف ہوگا۔

بیوی کئی لمحہ تک تو سوچتی رہی اور دل ہی دل میں تخمینہ بھی لگایا۔ لیکن کہتے ہوئے ڈرتی تھی کہ کہیں منہہ سے اتنی رقم نہ نکل جائے جو میرے کفایت شعار خاوند کو بہت ناگوار ہو اور وہ انکار کر دے۔ آخر سوچ سوچ کر کہا کہ ٹھیک تو میں کہہ نہیں سکتی۔ لیکن کم از کم چار سو فرانک[1] میں تیار کرانے کا انتظام کر لونگی۔

یہ سنکر خاوند حیران سا رہ گیا۔ کیونکہ وہ عرصہ مدت سے تھوڑا تھوڑا پس انداز کر رہا تھا اور اس وقت اس کے پاس مشکل تمام اسی قدر رقم تھی۔ اور اس رقم سے وہ ایک بندوق خریدنا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اپنے دوستوں کے ساتھ وہ بھی اتوار کے روز شکار کو جایا کرے۔

---

[1] فرانک۔ چاندی کا سکہ جس کی قیمت ہندوستان میں ۱۰ آنے کے برابر ہے ۱۲

خاوند۔ اچھا میں تمہیں چار سو فرانک کا بندوبست تو کر دونگا۔ اپنی پسند کی پوشاک بنوالو۔
جلسے کی تاریخ نزدیک آگئی۔ پوشاک بن کر تیار ہوگئی مگر مسز لائل بدستور غمگین اور افسردہ نظر آتی تھی۔ ایک شام کو اس کے خاوند نے کہا یہ معاملہ کیا ہے پھر تم مجھ سے تین دن سے ویسی ہی پریشان نظر آتی ہو۔

بیوی۔ میرے پاس کوئی زیور نہیں۔ کوئی زیور یا قیمتی جواہرات ہوتے تو بات بنتی۔ میں تو وہاں جلسے میں افلاس کی مجسم صورت نظر آؤنگی۔ اس سے بہتر ہے کہ میں نہ جاؤں۔

خاوند۔ تم قدرتی خوبصورتی پھول پہن لینا۔ یہ تمہیں نہایت خوشنما معلوم ہونگے۔ اور آجکل رواج بھی ہے۔ دس فرانک میں دو تین نہایت عمدہ گلاب کے پھول تمہیں مل جائیں گے۔

بیوی۔ اس سے ذلت اور کیا ہوگی کہ تمام متمول عورتوں میں سے سب سے غریب میں ہی نظر آؤں۔

خاوند۔ تم کس قدر بیوقوف ہو اپنی دوست مس فارسٹر کے ہاں چلی جاؤ اور اس کا کوئی زیور مانگ لاؤ۔ تمہاری اسکی ملاقات تو خاصی ہے۔

یہ سنکر بیوی کی جان میں جان آئی۔

بیوی۔ خوب سوجھی۔ مجھے اس کا خیال بھی نہ تھا۔

دوسرے دن وہ اپنی سہیلی کے ہاں گئی اور اس سے اپنا مدعا بیان کیا وہ جھٹ اپنے کمرے سے زیورات کی صندوقچی لے آئی اور لاکر اس کے سامنے رکھدی اور کہا جو چیز تمہیں پسند ہو اس میں سے لے لو۔ مسز لائل اس صندوقچی میں سے ہر ایک چیز نکالتی تھی اور پہن کر آئینہ دیکھتی تھی۔ ان میں سے کوئی چیز پسند نہ آئی۔ پھر کہا کوئی اور چیز نہیں سہیلی کچھ اور چیزیں لے آئی۔

اتنے میں ایک سادہ مخمل کے کیس میں سے نہایت چمکدار ہیروں سے مرصع چندن ہار نکلا جس کو دیکھ کر اس کا دل مارے خوشی کے اچھل پڑا۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر زیبِ گلو کیا اور اپنے آپ کو دیکھ دیکھ کر فرطِ انبساط میں ایسی محو ہوئی کہ دیر تک وہیں کھڑی رہی پھر اپنی دوست سے پوچھا کہ کیا یہ تم مجھے مستعار دے سکتی ہو۔ اس نے کہا بیشک لے جاؤ۔ اپنی دوست کا شکریہ ادا کر کے خوشی خوشی اپنے گھر واپس آئی۔

جلسے کا دن آپہنچا۔ مسز لائل شریک ہوئی۔ حُسنِ قدرتی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ سب نظریں اسکی طرف جھکیں۔ سب بڑے بڑے آدمی اس سے تعارف کے آرزومند ہوئے۔ صاحبِ خانہ نے آکر اس کے حُسن اور آرائشگی کی داد دی۔ کمرے میں ہر طرف اسی کے جمال خوبی کے چرچے تھے۔

وُہ خود بھی اپنے تسخیر سے بے خبر نہ تھی اور جس قدر اس کے مداحوں کی نگاہیں اس پر پڑتی تھیں اسی قدر وُہ اپنی عشوہ گری پر زیادہ نازاں نظر آتی تھی۔ تمام شب رنگ رلیوں میں کٹی صبح چار بجے کے قریب جلسہ برخاست ہوا۔ اس کا خاوند تو تھک کر ایک کمرے میں سو گیا تھا اب جاگ اٹھا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ سردی کا وقت تھا اور اس کے پاس صرف ایک کمبل تھا وہی اپنی بیوی پر ڈالا یا وُہ گھبرائی کہ ایسی شاندار پوشاک پر ایسا بھدا کمبل۔ دوسری عورتوں میں تخفیف ہونے کے ڈر سے جلدی جلدی وہاں سے چلی اور کمبل نہ اوڑھا۔

ہر چند اس کے خاوند نے چاہا کہ وُہ کمبل اوڑھ لے لیکن کہا نہ مانا اور برابر سردی میں ٹھٹھکتی رہی۔ گاڑی کی تلاش کی تو نہ ملی۔ اسی تلاش میں بہت دُور تک نکل گئے۔ آخر ایک ذلیل سی گاڑی میں بیٹھ کر گھر پہنچے۔ مسز لائل گاڑی سے اُترتے ہی اپنے کمرے کے آئینہ کی طرف گئی کہ ایک دفعہ تو پھر اپنے بناؤ کو

دیکھ لے۔ دیکھا تو چندن ہار گلے میں نہ پایا۔ بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ اس کے خاوند نے ابھی کپڑے بھی نہ اُتارے تھے گھبرا کر دوڑا آیا اور پُوچھنے لگا خیر تو ہو۔ کیا ہُوا۔

بیوی۔ نہایت اضطراب کی حالت میں مس فارسٹر کا ہار کہیں ... کہیں کھو گیا۔ مارے گھبراہٹ کے مُنہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

خاوند۔ (ہکا بکا رہگیا) کیونکر؟

بیوی حیران تھی کہ کیا ستم ہوا۔

خاوند۔ تم وہاں سے باہر نکلی تو کیا اسوقت تمہارے پاس تھا۔

بیوی۔ ہاں اسوقت تو تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

غرض خاوند ہار کی تلاش میں باہر نکلا اور بیوی کُرسی پہ انتظار کرنے لگی۔ اب اتنی سکت بھی نہ تھی کہ اُٹھ کر بستر تک جا سکے۔ ہار کے جانے کا غم جان کھا رہا تھا۔ خاوند سات بجے واپس آیا مگر ناکام۔ ہار کا کہیں پتہ نہ ملا۔ ادھر اُدھر بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر کچھ نہ ہوا۔

لائل۔ تم اپنی سہیلی کو کہہ بھیجو کہ ہار کسی قدر ٹوٹ گیا ہے اُسکی میں مرمت کرا کے عنقریب بھیجدونگی۔ اتنے میں ہم اَور تلاش کرینگے۔ دیکھو شاید کہیں پتہ مل جائے۔ ہفتہ کامل گذر گیا۔ لیکن ہار نہ ملا۔

اب بیچارے بہت پریشان ہُوئے کہ کریں تو کیا کریں۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ مگر تھے دونو مجبور۔ حوصلہ کرکے یہ ارادہ کیا کہ جس طرح ہو سکے ہار کے عوض ویسا ہی ہار پیدا کرکے مس فارسٹر کو پہنچایا جائے۔

دونوں غریب کئی دن تک اس ہار کی تلاش میں بازار کی تمام دوکانیں پھرے۔ بالآخر ایک دکان میں ویسا ہی چندن ہار نظر پڑا۔ اس کے ہیرے

بالکل ویسے ہی تھے ۔ قیمت چالیس ہزار فرانک اور اسوقت انہیں ۳۶ ہزار کو ملتا تھا ۔ انہوں نے دکاندار سے بصد سماجت کہا کہ تین دن تک اسے کسی اَور کے پاس فروخت نہ کرے ۔

اٹھارہ ہزار فرانک مسٹر لائل کو اپنے باپ کے ورثے میں پہنچے تھے جنہیں وہ ہاتھ نہیں لگانا چاہتا تھا ۔ اور جن کی بابت اس کا ارادہ تھا کہ اولاد کے لیے رکھے رہیں انکو بنک سے نکالا ۔ اور باقی ۱۸ ہزار مختلف لوگوں سے قرض لئے ۔ ہار خریدا اور بیوی کو دیا کہ جاکر مس فارسٹر کے ہاں دے آئے ۔ جب مسز لائل ہار لیکر گئی تو سہیلی نے لیکر اسی طرح رکھ لیا ۔ وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ کہیں دیکھ کر تاڑ نہ جائے کہ ہار دوسرا ہے ۔

اس ہار کی بدولت جو قرض زیر باری کی میاں بیوی کو اٹھانی پڑی وہی انکی بدقسمتی بنگئی ۔ اس مصیبت نے اُن کے خیالات ایک سے کر دیئے دونوں نے کمر ہمت باندھ لی کہ جس طرح بھی ہو قرض ضرور اتارنا ہے ۔ بیوی شکوہ شکایت چھوڑ کر کفایت کی تدبیریں کرنے لگی ۔ جو حالت اسے پہلے تنگی کی نظر آتی تھی اس میں گنجائش نظر آنے لگی ۔ پہلے تو نوکر کو برطرف کر دیا ۔ مکان تبدیل کرکے ایک نہایت مختصر سی کوٹھری کرایہ پر لے لی ۔ اب اس سے معلوم ہوا کہ انتظام خانہ داری کیا چیز ہے ۔ اب خود پیارے پیارے ننھے ننھے ہاتھوں سے برتنوں کو دھوتی اور گلابی خوبصورت ناخنوں سے برتنوں کی چکنائی کو دور کرتی تھی ہر صبح بازار سے سودا بھی خود خرید کر لاتی ۔ نہایت ہی غریبانہ پوشاک اب اس کے لئے کافی تھی اور ٹوکری اٹھا کر قصاب کنجڑے کی دوکان پر جانے میں اب اسے عار نہ تھی ۔

ادھر خاوند شام تک دفتر کا کام کرتا تھا اور پھر کسی سوداگر کی دوکان میں

رات کو دیر تک کچھ حساب وغیرہ میں مدد دیتا تھا کہ چار پیسے زیادہ آئیں تو قرض ہلکا ہو۔
دس سال تک برابر یہی صورت رہی۔ دس سال کے گذرنے پر اُنھوں نے کوڑی کوڑی ادا
کردی گو سود اور سود در سود ملا کر انہیں بہت کچھ زاید دینا پڑ گیا۔

مسز لائل کا زمانہ شباب گذر چکا تھا اور اُس کے چہرے سے افلاس کے آثار نظر آتے تھے
تاہم اب وہ بڑی منضبط اور جفاکش بنگئی تھی۔

اف ہماری زندگی دنیا کے نشیب و فراز کا کس قدر حیرت انگیز آئینہ ہے۔ ایک ذرا سی
بات پر زمانہ کیا سے کیا ہو گیا۔ ایک ہار کے گم ہو جانے نے دونو کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔
ممکن تھا کہ وہ اب سے زیادہ کسی وقت خوشحال ہو جاتے مگر یہ ممکن نہ تھا کہ اس سے زیادہ
باہمت مستقل مزاج اور اس سے بڑھ کر محبت کرنے والے میاں بیوی ہوتے۔

مسز لائل ایک دن اتوار کی شام کو ہفتہ بھر کی محنت و مشقت کے بعد باغ میں تفریح
کے لئے گئی۔ تو اتفاق سے اُسے وہی اپنی سہیلی (مس فارسٹر جو اسوقت ایک بچے کی
ماں ہو گئی تھی) باغ میں ٹہلتی نظر آئی۔ اس کی صورت ابھی تک ویسی ہی دلفریب و دلربا تھی
اور ابھی تک ویسی ہی کمسن نظر آتی تھی۔ مسز لائل اسکو دیکھ کر بہت متاثر ہوئی۔ دل
بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسو اُتر آئے۔ بے اختیار اس سے بات چیت کرنے کو جی چاہا۔
قریب ہوئی اور سلام کیا۔

اب وہ بھلا کہاں پہچان سکتی تھی۔ حیران ہو کر کہنے لگی آپ نے مجھے پہچاننے میں
غلطی تو نہیں کی۔

مسز لائل نے اپنا نام وغیرہ بتایا۔ نام کے سنتے ہی اسکی سہیلی نے ایک چیخ ماری
اور کہا۔ ایں؟ تم وہی میری پیاری روزا ہو۔

مسز لائل۔ ہاں بہن میں وہی بدنصیب روزا ہوں۔ گذشتہ دس سال کے عرصے میں مجھے بہت
سی محنت کرنی پڑی اور نہایت تنگدستی سے دن کاٹنے پڑے۔ مگر یہ سب مصیبتیں تمہارے

اس ہار کے بدولت ہے مجھے جھیلنی پڑیں۔ اس وقت تو مارے شرم کے تمہیں بتایا نہیں۔

سہیلی۔ حیران ہو کر وہ کیسے؟

مسز لائل۔ تمہیں یاد ہو گا کہ میں ایک دفعہ تم سے چندن ہار مانگ کر لائی تھی اور اسے پہنکر اس دن بڑے جلسے میں گئی تھی۔

سہیلی۔ ہاں تو پھر؟

مسز لائل۔ وہ دراصل کھو یا گیا تھا۔

سہیلی۔ کیا کہہ رہی ہو وہ تو تم نے مجھے واپس بھی لاکر دیدیا تھا۔

مسز لائل۔ میں اس کے بدلے میں دوسرا ہار دیگئی تھی اور ہم برابر دس برس تک اس کی قیمت ادا کرتے رہے۔ تم جانتی ہو کہ ہمارے پاس روپیہ تو تھا نہیں اس لئے بہت سا روپیہ ہمیں قرض لینا پڑا شکر ہے خدا کا کہ وہ قرض بھی اتر گیا ہے اور ہماری حالت اب بہت اچھی ہو چلی ہے۔

سہیلی۔ تعجب سے۔ تو کیا میرے ہار کے بجائے تم نے ہیروں کا ہار اور خرید کر مجھے دیا تھا۔ ہائے میں نے کیوں نہ پہچانا۔

مسز لائل۔ تم نے خیال نہ کیا ہو گا۔ وہ بالکل ویسا ہی تھا۔

سہیلی۔ بہین میرا ہار جھوٹا تھا جو مشکل سے پانچسو فرانک کا بھی نہ ہو گا +

دوار کا ناتھ

آج ہم وہ تصویر ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جس کے لئے ہمارے ناظرین مدت سے منتظر تھے۔ خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج کا کلام مخزن میں اکثر چھپتا ہے اور ان کا نام نامی اب کسی مزید تعریف کا محتاج نہیں +

آنریبل مسٹر گوکھلے

کچھ عرصہ ہوا کہ مخزن میں آنریبل مسٹر گوکھلے کی تصویر ایک تمہیدی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مخزن اپنے مرقع تصاویر کی حدود کو علما ادب اُردو کے محسنوں تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ دیگر مشاہیر سے بھی اپنے ناظرین کو صُورت آشنا کرنا چاہتا ہے اِس لئے مَیں یہ مختصر سا مضمون آنریبل مسٹر گوکھلے کی ایثار سے بھری ہوئی سوانح کے متعلق بھیجتا ہُوں ۔

ہندوستان میں سیاسیات کا علم ابھی نیا علم ہے ۔ جن لوگوں کو کچھ بھی اس علم میں دخل ہے اُنکے نام اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں ۔ اور اسی لئے ابھی ہمارے ہاں اس میں امتیاز پیدا کرنا اس قدر مشکل نہیں جس قدر زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں ۔ لیکن جو اصحاب سیاسیات میں دخیل ہونے کے دعویدار ہیں ۔ اور اس بنا پر ملک کے مختلف حصّوں میں کم و بیش عزت حاصل کر رہے ہیں ۔ اُن میں بہت کم ایسے ہونگے جن کی پولیٹکل معلومات اتنی وسیع ہوں اور جنہیں پولٹیکل گروہ میں اتنی وقعت اور اعتبار حاصل ہو ۔ جو آنریبل مسٹر گوکھلے کو اس وقت میسّر ہے ۔ اور یہ اعتبار اُنہوں نے نسبتاً قلیل عرصے میں پیدا کیا ہے ۔ حال میں اُن کا اثر اور اقتدار اَور بھی بڑھ گیا ہے ۔ کیونکہ اُنہیں متواتر چند نمایاں کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے اور اُنہوں نے اپنی قابلیت کے جوہر بہت اچھی طرح دکھائے ہیں ۔ جب سے وُہ وائسرائے بہادر کی مجلس شوریٰ کے رُکن مقرر ہُوئے ہیں ۔ اُنہوں نے متعدد مشہور تقریروں سے ملک اور اہلِ ملک کی وکالت کا حق ادا کیا ہے ۔ جو کچھ اُنہوں نے اپنی تقریروں میں بیان کیا ۔ اُس سے خواہ کسی کو موافقت ہو یا مخالفت ۔ اتنی بات کو دشمن دوست سب تسلیم کرتے

ہیں کہ مسٹر گوکھلے کو بیان پر قدرت ہے۔ اُن کے بیان میں متانت اور میانہ روی موجود ہے اور وہ سچے دل سے خیرخواہ ہیں۔ اُن کی صفات کی داد نہ صرف اہلِ ملک نے دی ہے۔ بلکہ خود وایسرائے نے بھی کئی دفعہ بھری مجلس میں اُن کی تقریروں کی تعریف کی۔ ان تقریروں سے جو اثر ملک پر پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۵ء میں جو ڈپوٹیشن ہندوستان کی اغراض اہلِ انگلستان کے روبرو پیش کرنے کے لیے کانگرس کی جانب سے بھیجا گیا۔ مسٹر گوکھلے اُس میں شریکِ غالب قرار پائے۔ اور جب اتفاق سے بجائے پانچ چھ صاحبان کے اس موقعہ پر صرف مسٹر گوکھلے اور لالہ لاجپت رائے ہی تشریف لیجا سکے۔ تو مسٹر گوکھلے نے اکیلے ہی کئی آدمیوں کا کام کیا۔ باوجودیکہ مہینے بھر کے قریب ہی اُن کا قیام انگلستان میں رہا۔ چالیس پچاس تقریریں کر گئے۔ اور اس کے علاوہ بہت سے ذی اقتدار انگریزوں سے ملاقات کر کے معاملاتِ ہند کے متعلق معقول وکالت کر گئے۔ جاتے ہی اُنہوں نے نہ صرف دسمبر ۱۹۰۵ء میں بنارس کے جلسۂ کانگرس کی صدارت کا فرض ایک نہایت نازک زمانے میں ہوشمندی اور تدبر کے ساتھ ادا کیا۔ بلکہ اس کے بعد نئے سال کے بجٹ کے پیش ہونے پر وائسرائے کی کونسل میں ایک پرزور تقریر کی جس پر انگلستان کے کئی اخبارات نے معقول رائے زنی کی۔ اس ضروری فرض سے فارغ ہوتے ہی مسٹر گوکھلے نے اپریل ۱۹۰۶ء میں پھر انگلستان کے دُور دراز سفر کا تہیہ کیا اور ۲۹۔ اپریل کو لندن پہنچ گئے۔ اُن کا اتنی جلدی انگلستان پھر آنا اس نظر سے ہے کہ نئی پارلیمنٹ کے سامنے پرانی درخواستیں پھر دُہرائیں۔ اور دیکھیں کہ اب کے کیا اثر ہوتا ہے۔

پچھلے سال جب یہاں تشریف فرما تھے تو ایک دن مرحوم مسٹر کین ممبر کے ہاں مسز کین نے انہیں چاء پر بلایا۔ اُنکی ملاقات کے لیے اور بھی دس بارہ اصحاب مدعو ہوئے۔ مجھے بھی مسز کین نے اُس زمرے میں یاد فرمایا جب سب احباب آچکے تو مسٹر رابرٹ ممبر پارلیمنٹ نے پسندیدہ

الفاظ میں مسٹر گوکھلے کی خدمات کا ذکر کیا مسٹر ولیم ویڈربرن بہادر نے مسٹر رابرٹ کی تائید کی مسٹر دادا بھائی نوروجی نے بحیثیت کانگرس کے بزرگ ترین رکن ہونے کے اپنے نوجوان قوت بازو کی ہمت کی داد دی۔ صدر مجلس نے مجھے اشارہ کیا۔ کہ "تم بھی کچھ کہو"۔ میں نے کہا۔ مَیں خوشی سے اُن اصحاب کے ساتھ جنہوں نے مسٹر گوکھلے کی صفات کا بیان کیا ہے۔ شریک ہوتا ہوں۔ مگر یہ بات جتا دینا چاہتا ہوں۔ کہ مَیں جو تعریف کرتا ہوں۔ وُہ ایک خصوصیت رکھتی ہے۔ مسٹر گوکھلے دو حیثیتیں رکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ کانگرس کے رکنِ اعلیٰ ہیں۔ دُوسرے یہ کہ ہندوستان کے لائق سپوت ہیں۔ مَیں دوسری حیثیت کو پہلی سے بڑھ کر سمجھتا ہوں۔ اب تک جو داد ملی ہے وُہ پہلی حیثیت کے متعلق تھی مَیں اُن کی تعریف خود شریکِ کانگریس نہ ہونے کے باوجُود اس لئے کرتا ہوں۔ کہ مَیں انکی لیاقت۔ اُنکی معقولیت اور حبِ وطن کا معترف ہُوں"۔ جن کی طرف مَیں نے مسز کین کے جلسے میں اشارہ کیا تھا۔ کیونکہ ممتاز ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے اُن کا تعلق سب ہندوستانیوں سے یکساں ہونا چاہیئے۔ اور اگر ہم چاہیں کہ ہمارے ملک کے نوجوانوں میں سے نامور لوگ پیدا ہوں۔ تو اُن کی ہمت بڑھانے کا بہترین طریقہ یہی ہے۔ کہ جو جو امتیاز حاصل کرتا جائے۔ اُس کی ملک اور قوم کی طرف سے خاطر خواہ حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔

مسٹر گوکھلے کے حالاتِ زندگی بتفصیل لکھے جانے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ ابھی انہیں بہت کچھ کرنا ہے۔ سچ پُوچھو تو اُن کے کام کا زمانہ یہی دو تین سال سے شروع ہُوا ہے۔ گو اس سے پہلے بھی وُہ کئی طرح سے مُلکی اور قومی خدمت کرتے رہے ہیں۔ مگر اصل میں وُہ زمانہ تیاری کا تھا۔ اب وہ ہر طرح سے ملکی خدمات کے قابل ہیں اور ملک اُن سے بڑی بڑی توقعات رکھتا ہے۔ اس لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اگر یہاں مختصرا اُن کے حالات لکھ دیئے جائیں۔

آپ کا مولد کولا پور ہے - اور آپ کا پورا نام گوپال کرشن گوکھلے ہے - آپ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے - گویا اسوقت چالیس برس کا سن ہے - اٹھارہ برس پڑھنے میں صرف ہوئے - اور بعد میں اٹھارہ برس پڑھانے کی نذر - پونا میں فرگسن کالج ہمیشہ مسٹر گوکھلے اور انکے ہمراہیوں کا جنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر بہا حصہ اس کی خدمت میں نہائیت قلیل معاوضے پر صرف کر دیا شرمندۂ احسان رہیگا اور یہ مبارک مثالیں ہمیشہ اوروں کے لئے ترغیب و تحریص کا باعث ہونگی -

گوپال کرشن کی ابتدائی زندگی بہت سے اور ناموروں کی طرح غریبی کے گہوارے میں گذری - والدین مالِ دنیا کے بوجھ سے قریب قریب سبکدوش تھے - مگر معلوم ہوتا ہے کہ نیکی اور فراست کی دولت سے مالامال تھے - اور انہوں نے اس دولت سے بیٹے کو بھی دل کھول کر حصہ دیا - قدرت کی داد پر اچھی تربیت سونے پر سہاگہ ہوتی تربیت کے ساتھ تعلیم اعلیٰ تو سونا کندن ہوگیا - کولاپور میں ایف - اے تک کی پڑھائی تھی - گوپال اس سے گھر بیٹھے بیٹھے فراغت پا کر بمبئی کے الفنسٹن کالج میں آ داخل ہوا ۱۸۸۴ء میں بی - اے پاس ہوگیا - ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات تعلیم سے فارغ ہوتے ہی یہ سوجھی کہ جو نعمتِ علم حاصل ہوئی ہے اس سے دوسروں کو بھی حصہ دے - پونا کالج میں جا پڑھانے لگا - اتنے میں مسٹر رانا ڈے مرحوم کی نظر کیمیا اثر اس کندن پر پڑی - رانا ڈے کو جنھوں نے دیکھا ہے جانتے ہیں کہ کس دل و دماغ کا شخص تھا - اس کی صحبت نوجوان کے لئے پارس ثابت ہوئی - پارس تانبے کو سونا کر دیتا ہے - تو زرِ خالص کو جو بنا دیتا سو کم تھا -

۱۸۸۷ء میں مسٹر گوکھلے کو علاوہ پروفیسری کے اُس فن سے سابقہ پڑا جو سیاسیات کی تعلیم کا ایک ضروری زینہ اور تجربہ کی گوناگونی کے لحاظ سے اکسیر ہے - یعنی اخبار نویسی - پونا میں ایک مجلس تھی سروجینک سبھا - اس کا ایک سہ ماہی رسالہ

نکلتا تھا۔ اُس کی ایڈیٹری مسٹر راناڈے نے مسٹر گوکھلے کے سپرد کی۔ جب اُنہوں نے اس رسالے کو سنبھال لیا۔ تو اخبار سدھارک کی ایڈیٹری میں انہیں شریک کیا گیا۔ یہ اخبار ہفتہ وار انگریزی اور مرہٹی دونوں زبانوں کا جامع تھا اور اس میں مسٹر گوکھلے کو دونوں زبانوں کی تحریر کی مشق کا خوب موقعہ ملا۔ بس اب کیا تھا۔ قابلیت پہلے سے موجود تھی۔ کالج میں پڑھانے اور اخبار نویسی کی مہارت سے اور منجھ گئی۔ اس کے ساتھ قومی جوش شامل تھا۔ اس کے سبب بمبئی کی پراونشل کانفرنس کے سکرٹری ہو گئے۔ اور جب ۱۸۹۵ء میں پونا میں کانفرنس ہوئی تو اس کے بھی سکرٹری قرار پائے۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں انہیں پہلی دفعہ انگلستان آنے کا موقعہ ہوا۔ لارڈ ویلبی کی صدارت سے اُن دنوں اخراجاتِ ہند کی تحقیقات کے لئے کمیشن مقرر ہوا تھا۔ اس کے روبرو گواہی دینے کے لئے مسٹر گوکھلے بھیجے گئے۔ اپنے قیامِ انگلستان کی اثنا میں اُنہوں نے طاعون کے انتظام کے متعلق بعض بیانات ایسے کئے جن پر ہندوستان میں انکی بڑا جست کے وقت گرفت ہوئی۔ اور چونکہ اُن سے ثبوت بہم نہ پہنچ سکا۔ اس لئے اُنہوں نے مجبوراً سرکار سے معافی مانگی۔ یہ سال اُنکی زندگی میں مشکلات کا سال تھا۔ اس معافی کا فوری نتیجہ تو یہ ہوا۔ کہ ملک بھر میں بدنامی ہو گئی۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ جو کچھ اُنہوں نے بیان کیا تھا وہ بعض خطوط کی بنا پر تھا جو انہیں ہندوستان سے بھیجے گئے تھے۔ اور اس میں اُن کا قصور تھا تو فقط اتنا کہ اُنہوں نے بلا مزید تحقیقات کے یا ثبوت تیار موجود ہونے کے اُن خطوط پر اعتبار کر لیا۔ تو عام رائے اُن کے مخالف نہ رہی۔ اور جو ذرا مخالف رہی بھی۔ وہ کچھ امتدادِ زمانہ سے اور کچھ مسٹر گوکھلے کے بعد کی کارگذاریوں سے اُن کے حق میں ہو گئی۔ اور آج وہ سرکردہ پولیٹکل اراکین میں شمار ہوتے ہیں اور اُن کی ہردلعزیزی کا حلقہ نہایت وسیع ہے +

ایک مدّاح

ریشم کا کیڑا

ریشم کا کیڑا اصل میں چین کا رہنے والا ہے۔ چینی زبان میں اس کو سی کہتے ہیں چین سے پہلے یہ ہندوستان میں لایا گیا۔ اس کے بعد ریشم کی تجارت کرنے والے اسکو رُوم یونان اٹلی اسپین اور فرانس وغیرہ میں لے گئے اوسط درجہ کی حرارت میں یہ بہت اچھا پرورشس پاتا ہے اور خوب پھلتا ہے۔ یورپ کی سخت سردی اور ہندوستان کی کڑی گرمی اس کی صحت کو خراب کرتی ہے۔ یہاں کی آب و ہوا میں اس کی عمدہ قسم ترقی نہیں کر سکتی۔ یونانی اس کیڑے کو سیر کہتے تھے۔ اور اس کے کاتے ہوئے تاگے کا نام سیرک تھا۔ انگریزی زبان میں ریشم کو سلک کہتے ہیں آجکل ان حیرت انگیز کیڑوں کا پالنا اور اُن سے قیمتی ریشم کا حاصل کرنا بہترین صنعت اور زرخیز تجارت میں داخل ہے۔

ریشم کا کیڑا اِک قسم کا پلو ہے جو سفید سفید تتلیوں کے انڈے سے پیدا ہوتا ہے اسکی لمبائی دو سے تین انچ ہوتی ہے۔ کیڑے مکوڑوں کی حالت پر غور کرتے وقت اُنکے بچوں کے حال سے قطع نظر کر کے جو محض رینگتے ہوئے پلو ہوتے ہیں ہم لوگوں کا خیال زیادہ تر اُس طرف جاتا ہے۔ جب یہ بچے بڑھ کر خوشنما مکھی پروانے اور تتلی بنجاتے ہیں۔ فضائے ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں۔ انڈے دیتے ہیں اور اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ مثال کے لئے شہد کی مکھیوں کو دیکھو۔ جب اُس کے بچے انڈے سے باہر نکلتے ہیں اُس وقت محض بے بال و پر کے سفید پلو ہوتے ہیں لیکن یہی پلو جنکو دیکھ کر اِک گھن سی آتی ہے۔ بڑھ کر جب اپنے پر و پرزے نکالتے ہیں اور مکھی بن کر پھولوں کے رس سے شہد بنانے لگتے ہیں تو اُن کی تعجب خیز زندگی

ہم کو حیرت میں ڈالدیتی ہے۔ اور ہم اُن کی نسبت بہت کچھ سوچا کرتے ہیں۔ ریشم کے
کیڑوں کی داستان اس کے خلاف ہو۔ ریشم کا تنا چھوٹے پلوؤں کا کام ہے جو اپنی بیمثل
صنعت کا ہم کو تماشائی بنا لیتے ہیں۔ ناظرین کو سُنکر حیرت ہوگی تبدیل اشکال سے جب یہ پلو
تتلی بنجاتا ہے اور اس کے خوشنما سفید مخمل کے سے بال و پر نکل آتے ہیں تو وہ ریشم
کاتنا بھول جاتا ہے اور اس کی طبیعت بدل جاتی ہے۔ اپنی تھوڑی سی باقی زندگی
تتلی ہوا میں اُڑنے اور انڈے دینے میں بسر کرتی ہے۔

ہر ایک تتلی تخمیناً دو سو انڈے دیتی ہے اور انکو اپنے پروں سے چھپا کر سینے
بیٹھتی ہے۔ دُوسرے یا تیسرے روز ان انڈوں سے چھوٹے چھوٹے کالے
رنگ کے پلو پیدا ہوتے ہیں۔ ہر ایک پلو کے سولہ سولہ پیر اور چودہ چودہ آنکھیں ہوتی ہیں
انڈے سے نکلتے ہی یہ پلو اندھا دھن نرم پتیوں کو کھانا شروع کرتے ہیں اور جلد جلد
بڑھتے جاتے ہیں۔ جوان ہونے تک اُن کے بدن کی کھال چار مرتبہ گرتی ہے۔
پہلی کھال چھٹے روز اور دوسری دسویں روز تیسری پندرھویں روز اور چوتھی تیسویں
روز سانپ کی کینچلی کی طرح گر جاتی ہے۔ آخری کھال کے جب گرنے کا زمانہ آتا ہو
تو دس روز تک اس پلو کے کھانے کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ دن رات بے ٹھکانے
کھائے چلا جاتا ہے اس کے بعد اس کی بھوک مر جاتی ہے اور اس کا بڑھنا موقوف ہوجاتا ہے
اتنے زمانہ میں پلو اچھا خاصہ بڑھ کر تین انچ لمبا ہو جاتا ہے۔

جن پتوں کو کھا کر یہ پلو پرورش پاتا ہے۔ وہ شہتوت کا پتہ ہے شہتوت کے
درخت اور ریشم کے کیڑوں کو قدرت نے ایک دُوسرے کے لئے موزون پیدا کیا ہو۔
یہی وجہ ہے کہ علمی تذکروں میں اس کیڑے کو شہتوت کا جولاہا کہتے ہیں ان
پلوؤں کے کھانے کی مقدار کو سُنکر یہ ایک اچنبھا سا ہوتا ہے جوں جوں یہ پلو بڑھتا ہے
اس کی بھوک بلا کی تیز ہوتی جاتی ہے اوّل اوّل ایّام میں جو زمانہ اس کے پہلی کھال

کے گرنے کا ہوتا ہے ۳ سیر دوسرے ایام میں ۹ سیر تیسرے میں ۳۰ سیر چوتھے میں ۹۰ سیر اور آخر میں ۵۴۹ سیر غرض بچپن سے جوان ہونے تک جو ایک مہینہ کے زمانے سے زیادہ نہیں ہوتا ایک ایک پلو ۶۸۱ سیر شہتوت کی نرم بندھی ہوئی پتیوں کو نوش جان کر جاتا ہے۔

جب کھا پی کر سیر ہو جاتے ہیں تو موٹے موٹے پھولے ہوئے پلوؤں میں بے چینی پیدا ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ اپنے رہنے کو کوئی گوشہ ڈھونڈھتا ہے۔ اس کے پالنے والے اسی کے تاک میں رہتے ہیں اور جو وہ چاہتا ہے اس کو وہ پورا کر دیتے ہیں۔ پلو تخلیہ پا کر ریشم کاتنے کی تیاری کرتا ہے۔

کچے ریشم کی گیند جسکو کیڑا اپنے بدن کے چاروں طرف کات کات کر بناتا ہے بیضاوی شکل کی ہوتی ہے اسکو کویا کہتے ہیں اوپر کا ریشم جسکو کیڑا پہلے نکالتا ہے موٹا اور ادنیٰ قسم کا ہوتا ہے اس کے اندر عمدہ باریک تاگا رہتا ہے جس کو کیڑا چاروں طرف لپیٹ لپیٹ کر کاتتا جاتا ہے۔ کیڑے کے نچلے جبڑوں میں دو چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے ہیں جن سے وہ مکڑیوں کی طرح لگاتار قیمتی سوت نکالتا جاتا ہے۔

پلو جب اپنے کل ریشم کو کات چکتا ہے تو اس وقت اس کے اوپر کی کھال گر پڑتی ہے۔ اس کی شکل بدل جاتی ہے اور دو تین ہفتہ میں پلو سے ایک خوشنما تتلی بنجاتا ہے۔ اس زمانہ میں وہ اپنے کوئے میں بند بے حِس غش میں پڑا رہتا ہے۔

عرصہ کے بعد جب پلو فطرت کے حیرت انگیز کرشموں سے پوری تتلی بنجاتا ہے تو اس کو ہوش آتا ہے اس وقت اگر موقعہ دیا جائے تو تتلی اپنے قدرتی چمکیلے لباس میں باہر نکلتی ہے۔ تھوڑے زمانہ تک ہوا میں خوش خوش اڑتی پھرتی ہے۔ انڈے دیتی ہے اور مر جاتی ہے۔ لیکن غریب کیڑوں کو اس مزے دار زندگی کے لطف

اُڑنے کا موقعہ بہت کم دیا جاتا ہے۔ جب کویا پورا ہو جاتا ہے تو ریشم کی تجارت کرنے والے اُس کو گرم کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دیتے ہیں جس کی وجہ سے تتلی بننے والے پلو کوسئے میں بند مرکر رہ جاتے ہیں اور اُن کے سنہری ریشم کا کارگاہ آخر کو اُنکی قبر بنجاتا ہے۔ اگر کیڑے اس طرح نہیں مار ڈالے جائیں تو وہ اپنے لعاب دہن سے ریشم کو خراب کر دیں اور کوسئے میں سوراخ کر کے باہر نکل جائیں +

سید راحت حسین بی۔ اے

میری بربادی کا باعث

کبھی اے دوستو میں بھی غنی تھا میں تونگر تھا
زمانے میں ہوا کوئی نہ ہم پلہ مرا ہوگا

کھڑی رہتی تھی دولت دست بستہ میرے در پر یوں
کہ وہ لونڈی ہو میری اور آقا اُسکا میں گویا

خسارہ نام کو ہوتا نہ تھا مجھ کو تجارت میں
کیا میں نے کوئی سا کام اس میں نفع ہی پایا

مرے اقبال و دولت کو تو روز افزوں ترقی تھی
رقیبوں کے لئے لیکن خسارہ تھا تنزل تھا

شدیشی کارخانے میں مرے وہ آئی تھی رونق
اگر کچھ روز اور ایسا ہی رہ جاتا تو کیا ہوتا

مجھے برباد لیکن کر دیا ہے میری بیوی نے
مجھے افسوس ظالم نے کہیں کا بھی نہیں رکھا

غضب ہے ہے مری لاکھوں کروڑوں ایک پل بھر میں
فنا ہی کر دیئے ظالم نے اک حبہ نہیں چھوڑا

بتاؤں ؟ کس طرح یہ معجزہ دکھلا دیا اس نے ؟
کہا کمبخت نے اُٹھو ! چھ بجے ہیں اور دن نکلا

(میگزین آف فن امریکہ)

(عباس ۔ افریقہ)

اخلاقی جُرأت

جرأت جرأت یا دلیری کا بڑا تعلق دل سے ہے۔ اور جرأت یا دلیری کا وجود اُس خیال پر منحصر ہے جو ہمیں اپنا کام بے کھٹکے جاری رکھنے کی تحریک دیتا ہے۔ جُرأت دو اقسام پر منقسم ہو سکتی ہے۔

جسمانی جرأت (۱) جسمانی یا قدرتی جرأت۔ یہ وُہ جُرأت ہے جس کے بغیر سپاہی میدانِ جنگ میں اپنے کرتب اور فن نہیں دکھا سکتا۔ مثال کے طور پر ہم اس جگہ پومپی آئی کے سنتری کا ذکر کرتے ہیں۔ جبکہ کوہ آتش خیز وسوویس انگارے اور پگھلنے والا لاوا اپنے رہ عدم کے ناکوں سے باہر پھینک رہا تھا۔ لوگ اس آفتِ ناگہانی سے پناہ حاصل کرنے کے لئے ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر نہایت ہی سراسیمگی اور خوف و ہراس کی حالت میں بھاگے پھرتے تھے۔ اور تمام کوششوں کے باوجود اس بلائے آسمانی سے چھٹکارا نہ ملتا تھا۔ لیکن واہ رے سنتری! تیری ماں نے تجھ ہی کو جنا تھا! تو اپنی جان کا خوف نہ کھا کر لوگوں کو بچانے میں نہایت ہی سرگرمی سے کام لے رہا ہے۔ اور اپنے فرائضِ منصبی نہایت ہی مستعدی سے ادا کر رہا ہے۔ افسوس! اس جواں مرد اور جری سپاہی نے سینکڑوں مرد و زن کے اُوپر سے اپنی جان تصدق کی۔ اور اسی کھینچا تانی کی حالت میں اپنی پیاری جان نہایت ہی جوانمردی سے لاوا کے نذر کی۔ اب احمد نگر کی چاند بی بی کی دلیری کو ملاحظہ فرمائیں جس وقت مغلوں نے شہر کی چار دیواری پر دہشت میں پیس کر حملہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور قریب تھا کہ احمد نگر کی فوج اس حملے کی تاب نہ لا کر ہتھیار ڈال دے۔ ٹھیک اُس دم یہ نیک اور چاند سی بی بی زرہ بکتر پہن آلاتِ حرب سے جسم کو مزین کر ہاتھ میں تلوار پکڑے شگاف پر آ موجود ہوئی۔ اور اپنے سپاہیوں کو جوشیلے الفاظ سے بڑھاوے دینے لگی۔ اور مغلوں سے ایسی جان توڑ کر لڑی کہ اُن کے

چھکے چھوٹ گئے۔ لاچار مغلوں کی سپاہ کو منہہ کی کھاکر واپس بھاگنا پڑا۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس نیک اور پارسا بی بی نے اپنی جسمانی یا قدرتی جرأت کی وجہ سے ایسی لازوال شہرت حاصل کرلی ہے کہ چار دانگ عالم میں اس کا نام گونج رہا ہے۔ اور لوگ اس کو بڑی عزت اور توقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اخلاقی جرأت (۲) اخلاقی جرأت کو ہماری عادات سے خاص تعلق ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو لوگ جسمانی جرأت کے مالک ہیں وہ اخلاقی جرأت سے بھی غلامی کا پٹہ لکھوالیں۔ بہت سے سپاہی لڑنے میں بیباک ہوتے ہیں لیکن اتنی تاب نہیں لاتے کہ اپنے ہمچشموں کے مزاج اور دل لگی اور ہنسی کا مقابلہ کرسکیں۔ برعکس اس کے ایسی نازک بدن گل اندام بیبیاں بھی ہیں جن میں انتہا درجے کی اخلاقی جرأت پائی جاتی ہے۔ اس سے وُہ بہادری مراد ہے جو انسان کو ایماندار اور راست گفتار اور قرض سے محترز اور ہوائے نفسانی کا دشمن ہونے اور اپنے فرائض کو باحسن الوجوہ انجام دینے کی تحریک دیتی ہے۔

اخلاقی کم ہمتی اخلاقی جرأت کے نہ ہونے کی وجہ سے انسان کے چال چلن میں بڑا بھاری نقص واقع ہوجاتا ہے۔ اور طاقتِ ارادی کچھ ایسی کمزور اور قریب قریب باطل پڑجاتی ہے کہ حالانکہ وُہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ درست راستہ ہے اور دل سے چاہتا بھی ہے کہ مَیں ایسی راہ مستقیم کا رہرو ہوں اور ٹیڑھے رستے کو بُرا سمجھتا ہے اور اُس سے پرہیز کرنا چاہتا ہے لیکن پھر بھی وُہی ٹیڑھا رستہ بصد ناز و ادا اسکو اپنی طرف کشاں کشاں لئے آتا ہے۔ اور اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی کہ اُس بیجا طریق سے نہایت ہی بہادری کے ساتھ پرے ہٹ جائے۔ یہاں ہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم چند دو نظیریں اخلاقی جرأت اور اخلاقی کم ہمتی یا بزدلی کی ہدیہ ناظرین کریں:-

اخلاقی جرأت کی مثال پہلے پہل اخلاقی جرأت کا ظہور یقیناً راست گفتاری میں ہوتا ہو۔ اگر ہم نے کوئی قصور کیا ہو لیکن بغیر کسی شرم یا حجاب کے اُس قصور کا نہایت ہی پاک باطنی سے اعتراف کریں تو یہ اخلاقی جرأت کی ایک بڑی مثال ہو۔ دروغ گوئی اور فریب عموماً نتیجے ہیں

بزدلی ہے۔

اخلاقی کم ہمتی کی مثال | مندرجۂ ذیل مثال اخلاقی کم ہمتی کی ایسی مثال ہے جو عموماً ہندوستان کے ہر قبیلے اور ہر فرقے کی طرزِ معاشرت پر عاید ہوسکتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگر قبیلوں کے سرپرست اور بزرگ اخلاقی کم ہمتی کے ہاتھ نہ بک جائیں تو قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی حالت میں ایک عظیم اصلاح ہو جائے۔ مثال اخلاقی کم ہمتی کی یہ ہے کہ ایک باپ کو اپنی لڑکی کی شادی عنقریب کرنی ہے اور اس کی ماہواری آمدنی صرف پچاس روپے ہے اور بدقسمتی سے وُہ اب تک ایک پائی بھی شادی کے لئے نہیں جمع کر سکا۔ لیکن اُس کی ظاہری حیثیت اِس بات کی مقتضی ہے کہ وُہ شادی میں پانسو روپیہ صرف کرے۔ تو پھر اُسے کیا کرنا چاہئے؟ کیا وہ نہایت ہی دلیری سے یہ کہدیتا ہے کہ میرے پاس شادی میں اتنا روپیہ لگانے کو نہیں دھرا ہے اور یہ عین حماقت ہے کہ شادی کے لئے قرض دام لیکر رات دن کی فکر کا شکار رہوں؟ نہیں ملکا ایسے اعلیٰ خیالات والے چند ہی بندے خدا کے ہیں ورنہ ایک بڑی تعداد لوگوں کی ایسے موقع پر اپنی ناک ساک کی خاطر بید ھڑک روپیہ قرض لے لیتی ہے۔ اور انجام پر ذرا غور نہیں کی جاتی۔ اور ایسے لوگ نہایت ہی بُزدلی اور جہالت سے اپنی گردن قرض کے جوئے کے نیچے دبا لیتے ہیں۔ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

برخلاف اِس کے جس شخص میں اخلاقی جرأت ہوتی ہے وُہ اپنی بساط سے زیادہ خرچ ہرگز نہیں کرتا اور وُہ قرض کے وبال سے خود ہی نہیں بچا رہتا۔ بلکہ وُہ اپنے ملکی بھائیوں کے لئے خود ایک زندہ مثال بنتا ہے اور اِس طرح اُن کو اخلاقی جُرأت کا سبق سکھاتا ہے۔

ریفارمر اور اخلاقی جرأت | ہر زمانے اور ہر وقت میں ریفارمروں کو اخلاقی جرأت کی انتہا درجے کی ضرورت پڑتی رہی ہے۔ بہت دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ ان کو تمام عمر

ملزم قرار دیا گیا ہے بعض کو جلیخانوں کی کڑیاں اور مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں۔ اور بہت سے رفارمروں نے اپنے ایمان اور عقیدے پر اپنی جانیں نثار کر دی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو دنیا کی بہبودی کی مشین کے پہیے ہیں اور دنیا کی تاریخ میں اِن کے نام نہایت ہی عزت کے ساتھ ابد الاباد تک قائم رہینگے اور سخت سے سخت مصیبت اور دشوار سے دشوار مہم میں لوگوں کی دستگیری اور رہبری کرینگے۔

مارٹن لوتھر اخلاقی جُرات کے کرشموں کا اثر ناظرین کے دل پر قرار واقعی طور پر جمنے کے لئے ہم انکو مارٹن لوتھر کے زمانے کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ پراٹسٹنٹ مذہب کا وہ چوٹی کا رفارمر ہے جس کی عظمت کا سکہ یورپ کے ہر گوشے اور ہر طبقے میں بیٹھ گیا ہے۔ لوتھر ۱۰ نومبر سنہ ۱۴۸۳ء میں بمقام آئسلبن (واقع سیکسنی) پیدا ہوا۔ جب بڑا ہوا تو باپ کے حکم کے موافق قانون کے مطالعہ کی جانب رجوع کیا۔ لیکن جب اُسی کا ایک عزیز دوست بجلی کے گرنے سے اس کی آنکھوں کے سامنے مرا تو اُس کا دل دُنیا کی تمام دلچسپیوں سے اُچاٹ ہو گیا۔ اور اُس نے بمقام ارفرٹ ایک خانقاہ میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ یہاں رہتے ہوئے لوتھر کو بہت عرصہ نہ ہوا تھا کہ ایک دن حسن اتفاق سے ارفرٹ کے کتبخانے سے ایک پُرانی بائبل لاطینی زبان کی اس کے ہاتھ لگی۔ اور اِس بائبل کے پڑھنے سے لوتھر کو یہ واضح ہوا کہ رومن کیتھلک مذہب کے تمام طریقے بالکل لغو ہیں اور پوپ کی حد سے زیادہ عظمت اس کی نگاہ میں بیجا معلوم ہوئی۔ چنانچہ اب وہ پوپ کی شان و شوکت اور جبروت کے مٹانے پر تل گیا۔ پوپ نے کئی مرتبہ اس کو کبھی نرمی سے اور کبھی غیظ و غضب سے یہ کہا کہ تو ان حرکات سے باز آ اور پھر یہ دھمکی بھی دی کہ میں تجھ کو زندہ جلا کر خاک سیاہ کر ڈالونگا۔ آخر لوتھر نے سنہ ۱۵۲۱ء میں ورمز کے مذہبی مجمع کے روبرو ایک لیکچر نہایت ہی جوشیلے الفاظ میں دیا اور اِس عام جلسے میں اپنے نئے مذہب کے اصول حاضرین کو سمجھائے۔ اور

آخر میں کہا کہ جن مذہبی اصُول کی میں تلقین کرتا ہُوں - اُن کا اقتباس میں نے خدا کے پاک کلام یعنی بائبل سے کیا ہے اب میں اپنے ایمان سے ہرگز دست بردار نہیں ہو سکتا - چاہے پوپ اور دُنیا کے بادشاہ مجھ کو پابزنجیر زمین دوز جیلخانوں میں مقید رکھیں خواہ زندہ گاڑیں اور چاہے وُہ جیتے جی جلا کر میرا نام و نشان تک باقی نہ رکھیں"۔

ذرا ایک لمحے کے لئے خیال کرو کہ لوتھر کے گرد مخالفین کا ایک انبوہ کثیر جمع ہے جس میں ہر طبقے کے لوگ موجود ہیں شہنشاہ چارلس پنجم بھی وہاں ہے اور جرمنی کے تمام شہزادے اور پوپ کے قاصد اور بڑے بڑے حکام وقت کی نگاہیں بھی لوتھر کے چہرے پر پڑ رہی ہیں - ایسے ذی اقتدار لوگوں کے سامنے مندرجہ بالا کلمات کا لوتھر کی زبان سے نکلنا اُس کی اخلاقی جرأت کا بڑا بھاری ثبوت ہے -

سائنس اور اخلاقی جرأت سمائلز لکھتا ہے کہ دُنیا کی تمام بڑی بڑی مہمیں اخلاقی جرأت نے ہی سر کی ہیں - ہر قوم کی تاریخ کے پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ کوشش کے میدان میں ترقی کے قدم اُن لوگوں نے ہی بڑھائے ہیں جو دل کے دلیر تھے اور اخلاقی جرأت اپنے حصے میں رکھتے تھے"۔ سُقراط نے نیکی اور حیاتِ جاودانی کی نسبت اپنے شاگردوں اور عوام الناس کو اعلیٰ درجے کی تعلیم دی تھی - لیکن یہ تعلیم اس زمانے کے لوگوں کے خیالات کے خلاف تھی۔ گورنمنٹ نے اُس کو متنبہ کیا کہ اس قسم کی تعلیم سے باز آئے سُقراط نے انواع و اقسام کی سختیاں جھیلیں لیکن اپنے اصُول کی تلقین سے نہ پھرا - آخر حسب الحکم گورنمنٹ اس دلیر شخص نے زہر ہلاہل کا پیالہ پیکر اپنی جانِ شیریں کو خیرباد کہا - لیکن مرتے دم تک شاگردوں سے اپنے عقیدوں اور اصُولوں کا تذکرہ کرتا رہا - گلیلیو نے جو اطالیہ کا ایک بلند پایہ منجم گذرا ہے - لوگوں میں عام طور پر یہ مشتہر کیا تھا کہ زمین سُورج کے گرد پھرتی ہے - اِن الفاظ کے عوض جو مظالم اس کو سہنے پڑے تھے اُن سے وُہ قریب قریب نیم مُردہ ہو گیا تھا - غرض اسی طرح نیوٹن کو بھی جر ثقیل کی

دریافت پر کافر قرار دیکر مجرم تصور کیا تھا۔ حالانکہ نیوٹن صاف دلی اور پاک باطنی کے لحاظ سے تمام دنیا میں مشہور ہے۔ لیکن غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر یہ سائنس دان حضرات سائنس کی معلومات کو اپنے سینوں میں دفن کئے ہوئے دفن ہو جاتے تو پھر ہمیں ان نئی معلومات سے محروم رہنا ہوتا۔ اور سائنس کی ایک بڑی شاخ معرض ظلمت میں رہجاتی۔

ہم اور اخلاقی جرأت اپنے طریق و اطوار اور ڈھنگوں کو درست کرنے کے لئے ہمیں اخلاقی جرأت کی سخت ضرورت رہتی ہے۔ نفسانی خواہشیں انسان کی جانی دشمن ہیں۔ مرتے دم تک ہم اپنی خواہشوں کی کشمکش اور الجھنوں میں گرفتار رہتے ہیں اور اگر ہم میں اخلاقی جرأت موجود ہے تو ضرور ان نفسانی خواہشوں کو نیچا دکھاتے ہیں۔ اور اسطرح سے اپنی تمام زندگی کو اخلاقی عیوب سے مبرا کر لیتے ہیں۔

اخلاقی جرأت کے حاصل کرنے کا وسیلہ اس وقت بار بار جو سوال ہمارے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "ہم اخلاقی جرأت کو کیونکر حاصل کر سکتے ہیں"؟ اگر نفس کا شیطان تمہیں دھوکا دیکر اپنے دام گلو گیر میں پھنسانا چاہے۔ اور تم اس کے دھوکے میں نہ آؤ بلکہ "نہیں" کہکر اس کا دل جلاؤ تو یہ اخلاقی جرأت کا پہلا کرشمہ ہوگا جو تمہاری جانب سے ظہور میں آئیگا۔ اب جتنی مرتبہ تم نفس کشی سے اپنے فرائض کے سرانجام دینے کی طرف متوجہ ہوگے اسی قدر اخلاقی جرأت تمہارے دل و دماغ میں طاقت پکڑتی جائیگی لیکن نفس کی شرارتوں کو سہنے سے نتیجہ برعکس پیدا ہوگا۔

ایک مفید نصیحت ہر کام کے کرتے وقت اور ہر بات کے کہتے وقت اگر ہر شخص مندرجہ ذیل نصیحت کو اپنے خیال میں رکھے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو۔ وھو ہذا:-

"جوانمرد اور مستقل مزاج بنو اور ہر کام صرف خدا سے ڈر کر کرو۔ جو کام تم کرو اور جو بات تم کہو اس کے کرتے اور اس کے کہتے وقت اپنے دل سے یہ سوال کرو۔

گیا جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں یا کہنا چاہتا ہوں درست ہے"؟ اگر تمہارا دل جواب میں "ہاں" کہے تو پھر بہر صورت لوگوں کی مخالفت کے باوجود وہ کام کرو اور وہ بات کہو۔ ممکن ہے کہ تمہارے بعض رفقا تمہارے مخالف ہو جائیں۔ ممکن ہے کہ لوگ تمہیں حسبِ دستور عزت کی نگاہ سے نہ دیکھیں لیکن تم ان سب باتوں کی کچھ پروا نہ کرو۔ مستقل مزاج رہو اور مرد بنو۔ خدا تمہاری مدد پر ہے۔ تمہیں اس بات کا ذرا خیال نہ کرنا چاہئے کہ لوگوں کا تمہاری نسبت کیا گمان ہے۔ صرف یہ خیال ہمیشہ رکھو کہ تمہارا مدعا ایمانداری پر مبنی ہو۔ اور اپنے ضمیر کے احکام کی پابندی کو اپنا فرض سمجھو۔ جو دل دنیاوی آلائشوں سے پاک ہے وہ جرأت بھی ضرور رکھتا ہوگا۔ کیونکہ بھرا سے ڈر کس بات کا ہے؟ اخلاقی جرأت سے ایسا طریقہ اختیار کرو کہ زندگی کا دشوار گذار سفر آسان ہو جائے"۔

خاتمہ | بقول سمائلز بات ساری یہ ہے کہ جواں مرد اور دلیر لوگ ہی خدا کے ایسے بندے ہیں جو انسانی زندگی میں جان ڈال دیتے ہیں اور وہ ہی دُنیا کی حکومت اور رہبری کے قابل ہیں۔ مرنے کے بعد کمزوروں اور ڈرپوکوں کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ لیکن ایک راست گفتار سچے اور صاحبِ جرأت شخص کی زندگی اس کے مرنے کے بعد بھی ایک ایسا روشن رستہ ہے جو دُنیا کے بُھولے بھٹکے مسافروں کی رہبری کریگا اور اُس دلاور شخص کی سوانح عمری ایک ایسا دلچسپ سبق ہے جس کو دُنیا کے سب لوگ شوق سے پڑھینگے۔ اور اُس کے خیالات اور اُس کے جوش اور ولولے اور اس کی اخلاقی جرأت اپنے فائدہ بخش اثر سے نسلاً بعد نسلٍ لوگوں کے دلوں کو متاثر کرتی رہیگی ؎

زندہ است نامِ فرخِ نوشیرواں بعدل　　　گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماند

ڈپٹی لال نگم

کلامِ اکبر

یہ دربار ہے خالقِ دوجہاں کا　اوب اپنا سکہ بٹھائے ہوئے ہے
نہ سمجھو کہ حاضر نہیں حق تعالیٰ　یہ عالم خود آنکھیں جھکائے ہوئے ہے

جس کو خدا سے شرم ہو وُہ ہے بزرگِ دیں　دُنیا کی جس کو شرم ہو۔ مردِ شریف ہے
جس کو کسی کی شرم نہیں اس کو کیا کہوں　فطرت میں وہ رذیل ہو۔ دل کا کثیف ہے

سب ہو چلے ہیں اُس بُتِ کافر ادا کے ساتھ　رہجائینگے رسُول ہی بس اب خدا کے ساتھ
واعظ کے اعتراض سے تنگ آگیا ہوں میں　اُس کو بھی دیکھ لو کبھی تم اِک ادا کے ساتھ
اکبر دُعا کا ذوق ہو کیونکر نصیبِ دل　اُٹھے نہ دردِ دل بھی جو دستِ دُعا کے ساتھ

وزن اب ان کا معین نہیں ہو سکتا کچھ　برف کی طرح مسلمان گھُلے جاتے ہیں
داغ اب انکی نظر میں ہیں شرافت کے نشاں　نئی تہذیب کی موجوں سے دُھلے جاتے ہیں
علم نے۔رسم نے۔مذہب نے۔جو کی تھی بندش　ٹوٹی جاتی ہو وُہ۔سب بند کھُلے جاتے ہیں
شیخ کو وجد میں لائی ہیں پیانو کی گتیں　پیچ دستارِ فضیلت کے کھُلے جاتے ہیں

جنابِ شیخ سے جاکر ذرا یہ للہ کہدینا　کہ گمراہی تھی مجھ سے رند کو گمراہ کہدینا
بہت مشکل ہی بچنا بادہ گلگوں سے خلوت میں　بہت آسان ہو یاروں میں معاذ اللہ کہدینا۔

تضمین زمیندار بر غزل حافظ

(از منشی سراج الدین احمد ایڈیٹر اخبار زمیندار کرم آباد)

سرمی ہیں رات کاٹی گرمی میں دن گذارا　خشکی نے گاہ لُوٹا پانی نے گاہ مارا

ابرِ سیہ نے گاہے برسائے سنگِ خارا بجلی نے گاہ جلایا کشتِ امید ہارا
چور و ملخ نے گاہے یہاں آ کے منہ پسارا تحصیلدار گاہے کیمپ آ گیا قضا را
کچھ سود خوار کو پھر دینا پڑا سہارا روٹی بچی نہ کپڑا دانہ بچا نہ چارا
آخر کو ہار تھک کر چلا اٹھا بیچارا دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدا را
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

آنکھوں میں ہیں آنسو دل میں رہا نہیں خوں ہر لحظہ ہو رہی ہے حالت مری دگرگوں
چارہ گروں کو کس سے پوچھوں کہاں سے ڈھونڈوں باقی نہیں رہی ہے گنجائشِ چہ و چوں
جاؤں کدھر کو یارب امداد کس سے مانگوں دل چاہتا ہے اپنا قصہ تمام کر دوں
لا تقنطوا مگر ہے حکمِ خدائے بیچوں اور فطرتاً بھی خوش ہیں کچھ خوگرِ وفا ہوں
رنج و طرب کو آنی جانی میں جانتا ہوں دہ روزہ مہرِ گردوں افسانہ است و افسوں
نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یار

کچھ اپنی وحشتوں سے بد گوہر ہے وحشت انگیز کچھ اپنی آگ ہی سے خرمن ہے یہ شرر ریز
کچھ اپنی تیغیوں سے ساغر ہے زہر آمیز کچھ اپنے گلا پہ ہی کرنے لگے چھری تیز
کچھ اپنوں ہی نے ٹھانی کرنے کی بد پرہیز بیگانے بھی بنے کچھ خونخوار اور خونریز
امید کا مگر ہے اک عشوۂ دل آویز غمخوار فرحت افزا دمساز ولولہ خیز
ہمت کے بادپا کو یارو لگاؤ مہمیز کشتی شکستگانیم اے بادِ شرطہ برخیز
باشد کہ باز بینیم آں یارِ آشنا را

ہیں میرے ہی عرق سے شاداب سنبل و گل ہے میرے ہی لہو سے پر بادۂ گل و مل
ہر پیچ و تاب میرا ہے زیبِ پیچ کاکل میرے ہی خوں سے اٹھا ہے شورِ قلقل
میری فروتنی سے ہے شاہ کا تجمل عمال کا تظلم حکام کا تغافل
پٹوار کا تشدد گرداوری تقاول ان سب پہ عارفانہ سرکار کا تجاہل

آ وہ سا ذرا اُٹھ ہم بھی مچائیں کچھ غل | در حلقۂ گل و مل خوش خواند دوش بلبل
ہاتِ الصّبوح ہبّوا یا ایّہا السّکارا

ہے ایڈورڈ ہفتم کی اندنوں حکومت | ہیں گرگ و میش جس میں یکجا شریکِ عشرت
صنعت میں ہے ترقی رونق پہ ہے تجارت | آسودہ ہیں ملازم خوش حال اہلِ حرفت
میرے لئے ولیکن ہے باعثِ مصیبت | اور ونکو ہے جو حاصل سامانِ عیش و عشرت
ریل اور تار برقی ڈاک اور حفظِ صحت | ان کی ہوئی نہ ہوگی مجھ کو کبھی ضرورت
محتاج ہے توجہ کی شاہ کی زراعت | اے صاحب کرامت شکرانۂ سلامت
روزے تفقدے کن درویشِ بینوا را

سارے جہاں کے دانا اور ملک کے ہنرمند | قاضی حکیم ملّا استاد اور آخوند
ایڈیٹر زمیندار اور قوم کے خردمند | کرتا ہے وعظ کوئی دیتا ہے یاں کوئی پند
ارکانِ مملکت کیا کیا ملک کے خداوند | دفتر میں بیٹھے بیٹھے کرتے ہیں کچھ قلم بند
زخمِ جگر کسی سے لیکن ہوا نہ پیوند | زاغ و زغن کا طعمہ دائم رہا جگر بند
اے مدعیِ اصلاح اب سی چپ چند تا چند | در کوئے نیک نامی مارا گذر نہ دادند
گر تو نمے پسندی تغییر کن قضا را

ہوں گرچہ سب جگہ میں سارے جہاں میں موجود | اور محنتیں مری ہیں اہلِ جہاں کا مقصود
یہ قبلہ دار و ڈپٹی جو بن رہے ہیں نمرود | گر میں نہ ہوں تو شیخی ساری ہو انکی مفقود
دیکھا کبھی نہ میں نے پر روئے سود و بہبود | آسودگی کا در ہے مدت سے مجھ پہ مسدود
شاہی خراج پر ہے دوکاندار کا سود | پھر اہلکار کا ہے اس سود پر شد و بود
مجبوریوں نے مجھ کو جبراً کیا ہے مردود | حافظ بہ خود نہ پوشید ایں خرقۂ مے آلود
اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا

سراج الدین احمد

مذہب

بیاباں[1] لق و دق نظر آ رہا ہے　　مسافر[2] بھٹکتا چلا جا رہا ہے
قدم با قدم ٹھوکریں کھا رہا ہے　　پھسلتا۔ سنبھلتا۔ مچلتا رہا ہے
نگوں[3] کی جھلک پر لبھاتی ہیں آنکھیں
چکا چوندھ سے چوندھیاتی ہیں آنکھیں

فلک ماہ۔ خورشید۔ روشن ستارے　　سماں سے سمک تک انوکھے نظارے
سرائے فنا کے طلسمات سارے　　دلا ویزیوں کے ہیں جن کے اشارے
اُدھر دیکھتا ہے۔ اِدھر دیکھتا ہے
ہُوا محوِ حیرت جدھر دیکھتا ہے

پھرا دوڑتا سحرِ باطل کے پیچھے　　بھٹکتا رہا عکسِ باطل کے پیچھے
پڑا ہات دھو کر رذائل کے پیچھے　　رہا راہِ روشن کی منزل کے پیچھے
بہت دیر تک دارِ فانی میں بھٹکا
نہ دشمن کا خطرہ۔ نہ رہزن کا کھٹکا

بغل میں دبائے خدائی نوشتہ[4]　　ملا ناگہاں ایک رہبر فرشتہ
ملا اس فرشتے سے یہ دل برشتہ　　ہُوا خوب دونوں کا آپس میں رشتہ
دیا تب اُسے نورِ وحدت دکھائی
مسافر نے تسکین کی راہ پائی

ہر آئینہ اُس کا تقدس غضب تھا　　انوکھا سراپا۔ ہیولا عجب تھا
ہر انسان سے وُہ نکوئی طلب تھا　　خوش انجام۔ خوش کام۔ مذہب لقب تھا

[1] دنیا [2] انسان [3] شہاب [4] کتب آسمانی ۱۲

ہوئی اُس فرشتے کی جب دستگیری
ملی اُس مسافر کو روشن ضمیری

ہوا قلب روشن - ہوا صاف سینہ   نہ اب دل میں نخوت نہ اب دل میں کینہ
صفا کا نگینہ - صداقت کا زینہ   مگر بے نوا - پارسا کا قرینہ

خودی سے کنارے - خدائی کا بندہ
الگ کبر سے - کبریائی کا بندہ

کھلا نا گہاں باب جنت کا اُس پر   کھلا بوستاں لطف و رحمت کا اُس پر
چڑھا رنگ کشف و کرامت کا اُس پر   ہوا سایہ ابر سعادت کا اُس پر

بشر تھا مگر نام کو شر نہیں تھا
نشان ضلالت ذرا بھر نہیں تھا

نہ دھبہ ریا کا - نہ اب داغ حیل کا   زہے اوج باغ شرافت کے گل کا
پلا نوش اُس کو حقیقت کے مُل کا   فرشتے نے ساغر دیا صلح کُل کا

ہوا بخت روشن اسی کے قدم سے
بشر باخدا ہو گیا اُس کے دم سے

جیمس منٹگمری   طالب بنارسی

مولانا حالی دکن میں

غنیمت تھا تجھے مُلک دکن حالی کا یاں رہنا   تمہارا فخر تھا اہل سخن حالی کا یاں رہنا
کھلاتا تھا معانی کے چمن حالی کا یاں رہنا   مٹاتا تھا غم و رنج و محن حالی کا یاں رہنا

... اک ... پر ... اک شب نظم وہ ہم کو سُناتے تھے

مضامیں کے سمندر۔ جوش کے دریا بہاتے تھے

سعادت جانو اے اہلِ دکن دیدار حالی کا کہ سر سید ہی کا دربار ہے دربار حالی کا
نہ صرف اک ہند ہی میں گرم ہے بازار حالی کا ہے یورپ میں بھی ہر اک ذی ہنر سرشار حالی کا
نہ تنہا ایشیا میں ہے مسلّم انکی اُستادی
ثنا خواں اُن کی نظموں کی ہے یورپ کی بھی آبادی

انہیں کی راہ میں اہلِ نظر پلکیں بچھاتے ہیں انہیں کو ذی بصیرت اپنی آنکھوں پر بٹھاتے ہیں
انہیں کے آگے اہلِ دل اپنا سر جھکاتے ہیں انہیں کی نظم سُننے کو سخن ور سر سے آتے ہیں
بٹھایا ہے انہیں نے مُلک پر سکہ فصاحت کا
بجایا ہے انہیں نے دہر میں ڈنکا بلاغت کا

یہ وہ حالی ہیں جنکی آج شہرت ہے زمانے میں زمانہ ان کا قومی راگ گاتا ہے ترانے میں
انہیں کی کوششیں ہیں قوم مردہ کے جِلانے میں انہیں کی شاعری کی رُوح ہر قومی فسانے میں
ہر اک شعر ان کا قومی سوز کا دمساز ہوتا ہے
ہر اک ساز اُس کا قومی راز کا ہمراز ہوتا ہے

یہ وہ حالی ہیں جو پیدا کریں امرت کو زہروں میں ہیں ان کے نام کے قائم کلب یورپ کے شہروں میں
معانی کی جگہ جادو بھرا ہے ان کی بحروں میں مہذب لیڈیاں گاتی ہیں جنکو اپنی لہروں میں
انہیں کے نام کا حالی کلب قائم ہے لنڈن میں
انہیں کی نظم کے تو ترجمے ہوتے ہیں سبن میں

مسلّم شاعرانِ ہند میں ہے ان کی اُستادی نئی نظموں کا رکھا ہے انہیں نے سنگ بنیادی
انہیں نے شاعری کو قید سے دلوائی آزادی ہیں قدرت کے مناظر شاعری میں انکے ایجادی
موثر نظم دلکش شعر درد انگیز مضموں ہے
زباں میں انکی جادو ہے قلم میں انکے افسوں ہے

جدا ہے بانکپن ان کا ادائیں سب نرالی ہیں   خیالات ان کے شائستہ مضامیں انکی عالی ہیں
خدا قائم رکھے یہ قوم کے محسن ہیں والی ہیں   نہ کیوں واقف ہوں حال قوم سے آخر یہ حالی ہیں

نہ ہوتے یہ تو کیا ہوتا مسلمانوں کا حال ابتک
مسلمانوں میں آتا ہی چلا قحط الرجال ابتک

خدا کی خاص رحمت ہر زمانے میں قیام انکا   کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کے لئے ہے فیض عام ان کا
درستی قوم کی کرنا ہے صبح و شام کام انکا   اسی سے قوم نے رکھا ہے فخر قوم نام ان کا

بہت فیاض ہیں یہ وقت کی دولت لٹانے میں
کیا ہے زندگی کو وقف گمراہی کے مٹانے میں

الٰہی دیر تک انکو مسلمانوں میں زندہ رکھ   یہ قومی باغ کے ہیں باغباں تو انکو اچھا رکھ
نہال قوم کو تو ان کے سایہ میں شگفتہ رکھ   اور انکے سر پہ تو فضل و کرم کا اپنے سایہ رکھ

مہذب طرز کی نظموں کے خلاق المعانی ہیں
یہ ہندوستاں کے ہومر ہیں اور سعدی ثانی ہیں

عبدالعلی آیاؔ ز حیدرآباد دکن

تازہ غزلیں

(از تصنیف جناب سید الشعراء خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی)

کہا لوگوں نے سب کچھ اس طرف رد سخن کرکے   مگر بیٹھے ہیں خاموشی کو ہم قفل دہن کرکے
مشقت کے سوا کیا مل گیا مشق سخن کرکے   عدو چاروں طرف پیدا کئے ہم نے یہ فن کرکے
قفس میں صدمۂ غم سے میں اگر صیاد مرجاؤں   اُڑانا خاک میری گرد دیوار چمن کرکے
کسی پتے کے لب پر بھی اگر نام خزاں آیا   نکالا باغباں نے اسکو رسوائے چمن کرکے
خط اپنے حال کا لکھ کر لفافہ میں نے یوں رکھا   لٹا دیں خاک پر جس طرح میت کو کفن کرکے

ستم کو کیوں ستم سمجھوں جفا کو کیوں جفا جانوں گنہ گاروں میں لکھا جاؤں میں بھی سو ظن کر کے
اگر شک ہو تو پوچھو ان عدم کے آنیوالوں سے کسی کو بھی نہ آسائش ہوئی ترکِ وطن کر کے
جوانی جا چکی مدت ہوئی اب تو بڑھاپا ہے بتا ناصح کروں کیا چارہ زخمِ کہن کر کے
ملے کچھ چین شاید شاد دل کو دشتِ غربت میں
ارادہ ہے کہ چند ے دیکھ لوں ترکِ وطن کر کے

یہ وہ غزل ہے کہ جس کے لئے حال ہی میں سرکار والا مرتبت ہز ہائینس نواب مالیر کوٹلہ نے حضرت آغا صاحب کو بڑے اعزاز سے طلب فرمایا اور بعد عطائے خلعت فاخرہ اور ایک سو روپیہ رخصتانہ رخصت فرمایا ہے۔

چھپیگا نہیں مجھ پہ نقشا تمہارا ہٹا لو کہ خنجر ہے جھوٹا تمہارا
تمہارا ہی بتخانہ کعبہ تمہارا ہے دونوں گھروں میں اُجالا تمہارا
نہ چھوڑو نگا دل دیجے پہونچا تمہارا کہ ہے یہ ہی اقرار میرا تمہارا
نہیں بے سبب اشکِ خوں حضرتِ دل کوئی آبلہ پسکے ٹوٹا تمہارا
منائیں تو اب جان دیکر منائیں قیامت ہے یہ روٹھ جانا تمہارا
کہا جبکہ ہم مرمٹینگے کسی دن تو فرمایا تقدیر۔ لکھا تمہارا
بتاؤ تو نیچی نظر آج کیوں ہے یہ کیوں وار پڑتا ہے اوچھا تمہارا
بڑے سیدھے سادے بڑے بھولے بھالے کوئی دیکھے اس وقت چہرا تمہارا
بچی ہے جو ساغر میں کیوں پھینکتے ہو ہمیں دیدو ہم پی لیں جھوٹا تمہارا
مجھے کانورا کر دیا حسرتوں نے کیا ہائے یہ عشق اچھا تمہارا
یہ کیا ہے سبب آج چپ چپ ہو پیارے بتاؤ تو کیوں جی ہے کیسا تمہارا
ہمیں لیں کفن۔ اب یہ نوبت ہے آئی مگر ہے وہی ہم سے پردا تمہارا

اُٹھانے پڑے خاک سے دل کے ٹکڑے
بڑا پیار تھا - پیار دیکھا تمہارا

اگر یہ ہمارا تو میں بھی نہیں ہوں
مری جان ہے درد گویا تمہارا

خدا کے لئے ہاں نہیں - کچھ تو کہدو
کہ منہہ تک رہی ہے تمنا تمہارا

علاج اس کے بیمار کا تم کروگے؟
کہیں دل چلا ہے مسیحا تمہارا

یہ کیا سایہ بھی ساتھ ہو دشمنوں میں
بٹھایا ہوا ہے یہ پہرا تمہارا

کہا جل کے یہ ذکرِ مرگِ عدو پر
اُٹھانے ہیں چل کر جنازا تمہارا

چلے آئے جنت سے بندہ بشر تھے
کھلا ہے یہاں آکے دھوکا تمہارا

چلا آشاعر زار تسلیم لیجئے
بھلا ہو بھلا میرے داتا تمہارا

حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی

میرے پہلو سے جو نکلے وہ مری جاں ہوکر
رہ گیا شوق دلِ زار میں ارماں ہوکر

زیست دو روزہ ہے ہنس کھیل کے کاٹو اس کو
گل نے یہ راز بتایا مجھے خنداں ہوکر

اشکِ شادی ہے یہ - کچھ مژدہ صبا لائی ہے
شبنم آلودہ ہوا پھول جو خنداں ہوکر

تلخیاں بھی مناسب نہیں شیرینی سے
بدمزہ مجھ سے نہ ہوں آپ مری جاں ہوکر

ذرۂ وادیٔ الفت پہ مناسب ہے نگاہ
فلکِ حسن پہ خورشید درخشاں ہوکر

شوخیاں اس نگہ زیر مژہ کی مت پوچھ
دلِ عاشق میں کھبی جاتی ہے پیکاں ہوکر

شدتِ شوقِ شہادت کا کہوں کیا عالم
تیغِ قاتل پڑے سر پہ مرے احساں ہوکر

ابر چھاتا ہے تو دھیان آتا ہے گیسو کا مجھے
کوندتی برق ہے یادِ رخِ تاباں ہوکر

اب تو وہ خبط مرے عشق کو کہہ کر دیکھیں
خود ہی آئینے کو تکنے لگے حیراں ہوکر

ہم نے باندھے ہیں مضامینِ کہن بھی نیرنگ
رنگ پر اپنا چمکتا ہے نئی شاں ہوکر

نیرنگ

فہرست مضامینِ رسالہ مخزن جلد گیارہ

اپریل ۱۹۰۶ء لغایت ستمبر ۱۹۰۶ء

تصاویر { شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی ایم اے - آنریبل مسٹر گوپال کرشن گوکھلے
میر انیس مرحوم - خان بہادر سید اکبر حسین جج -

نثر

تصنیفاتِ سرسیّد مرحوم

احکام طعام اہل کتاب۔ مسلمانوں کو یہود اور نصاریٰ کے ساتھ کھانا کھانے کیواسطے
بہامی مکلکہ اس کتاب میں سرسید مرحوم نے نہایت معتبر احادیث اور قرآن پاک کی آیات جمع کرکے
بحث کی ہے اور نہایت خوبی سے اس بات کو ثابت کیا ہے۔ کہ قرآن پاک رسول اللہؐ نے یہود اور
نصاریٰ کے ساتھ کھانا کھانے کی اجازت دی ہے **قیمت ۶ر**

اسباب بغاوت ہند (مصنفہ سرسید) **قیمت ۶ر**

الخطبات الاحمدیۃ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ۔ یعنی وہ دلچسپ کتاب جس میں
مرحوم سرسید احمد خان صاحب علیہ الرحمۃ نے تاریخ عرب اور پاک اسلام کی مذہبی تاریخ کو نہایت وضاحت
سے بیان کیا ہے اور عیسائی مورخوں کے بیجا اعتراضات کے جواب جو پاک اسلام اور بانی اسلام
علیہ الصلوٰۃ والسلام اور قرآن کریم پر کیے تھے۔ ایسے تسلی بخش اور دندان شکن دیے ہیں۔ کہ دیکھنے
کے قابل ہیں۔ درحقیقت اس مرحوم نے اس کتاب کی تصنیف سے مذہب پاک اسلام کی وہ خدمت
کی ہے جو ہر طرح قابلِ تعریف و تحسین ہے۔ اس کتاب کے شروع میں سرسید کی رنگین تصویر
بھی ہے۔ یہ کتاب نہایت خوشخط اور اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر طبع کی گئی ہے۔ **قیمت مجلد ۸ ؏**

سرسید مرحوم کے آخری مضامین۔ یہ وہ عالیقدر اور مقدس مضامین ہیں۔ جو مرحوم
سرسید نے از ابتدائے یکم شوال ۱۳۱۴ھ لغایت ماہ ذیقعدہ ۱۳۱۵ھ ہجری تک نہایت دلسوزی
کے ساتھ لکھے اور آخر کار مضمون لکھتے لکھتے ہی مالکِ حقیقی کے پاس پہنچے۔ **قیمت فی جلد ۱۲ ؏**

تہذیب الاخلاق جلد اول۔ نواب محسن الدولہ محسن الملک جناب مہدی علی صاحب کے کل مضامین ؏

تہذیب الاخلاق جلد دوم۔ جناب آنریبل ڈاکٹر سرسید احمد خان صاحب بہادر بالقابہ کے مضامین ؏

تہذیب الاخلاق جلد سوم۔ جناب نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی صاحب بہادر کے مضامین ۸ ؏

مخزن ایجنسی۔ لاہور سے طلب کرو

کلامِ نیرنگ

میر نیرنگ بی۔ اے کے کلام کے شائقین یہ سنکر خوش ہونگے کہ ہم نے میر صاحب کا تمام کلام جو آج تک مخزن میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا ہے۔ یکجا جمع کر کے ایک نہائت خوشنما کتاب کی صورت میں چھاپ دیا ہے۔ جس اہتمام سے یہ کلامِ نیرنگ چھپا ہے۔ اس کی خوبی کتاب کے دیکھنے سے ہی معلوم ہوگی۔ لکھائی چھپائی بہت دلکش تقطیع موزون۔ کاغذ چکنا (آیوری فنش) غرض ہر طرح سے کتاب قابلِ دید ہے۔ اور قیمت دانستہ کم رکھی ہے یعنی صرف ۶؍ علاوہ محصولڈاک ۱۰۔ مینیجر

نظم

ترکی ٹوپی اگر آپ اوڑھتے ہیں تو کیوں ایکدفعہ ہماری دکان سے حسب منشا ٹوپی
نہیں منگواتے ملنے کو تو ترکی ٹوپیاں قریباً ہر شہر میں ملجاتی ہیں لیکن جو ٹوپی آپکو
ہم بھیجینگے ۔ ویسی آپکو شاید کہیں بھی نہ ملسکے ہم آسٹریا اور استنبول کے بڑے بڑے
کارخانوں سے ٹوپیاں خاص اہتمام سے براہ راست منگواتے ہیں اور ہر مہینے میں
پارسل برابر آتے رہتے ہیں ۔
اگر آپ کو ترکی ٹوپی اوڑھنے کا واقعی شوق ہے تو آپسے ہم
یہ ضرور کہینگے کہ ہمیں ایک موقع دیجیے کہ ہم آپ کا شوق پورا کریں اور پھر
اطمینان نہ ہو تو بیشک دوبارہ آپ ہمارے کہنے کی پرواہ نہ کریں ۔
ہماری ٹوپیوں کی دو خصوصیتیں ہیں
(۱) ایک تو قیمت میں نسبتاً ارزاں ہیں (۲) دوسرے ہم مال کی روانگی میں کسی قسم کا دھوکہ
نہیں کرتے ۔ اگر مال آرڈر کے مطابق نہ پہنچے تو بیشک واپس کر دیجیے تو ظاہر ہے کہ
جتنا گڑ ڈالو اتنا ہی میٹھا ہوگا ۔ تاہم ہمارے پاس ٹوپیاں ہر قسم کی ہر قیمت کی اور ہر نمبر
رنگ کی موجود ہیں ۔ خواہ آپکو ایک ہی ٹوپی کی ضرورت ہے ۔
تو بھی بلا تامل آرڈر بھیجدیجیے ۔ صرف سر کا ناپ اور ٹوپی کی قسم لکھدیجیے ہم فوراً
ویسی ہی ٹوپی آپ کی خدمت میں بھیجدینگے ۔ محصولڈاک البتہ آپ کے ذمہ ہوگا ۔ مگر ویسی
ہی ہم نے ٹوپیوں کی قیمت میں بھی رعایت کر دی ہے ۔
آپکا آرڈر سپلائر عبدالرشید زبردست جنرل مرچنٹ انار کلی لاہور